انبیائے کرام (علیہم السلام)

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے
مقالات کا مجموعہ

مرتبہ
مولانا غلام رسول مہر

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
لاہور ـــ پشاور ـــ حیدر آباد ـــ کراچی

نام کتاب ـــــــ انبیاے کرام (علیہم السلام)
مرتبہ ـــــــ غلام رسول مہر
طابع ـــــــ شیخ نیاز احمد
مطبع ـــــــ علمی پرنٹنگ پریس لاہور
بار اول ـــــــ ۱۹۷۲ء
قیمت ـــــــ ۱۵ روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز ادبی مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور

فہرست

پیرایہ آغاز

از ہرچہ می رود سخن دوست خوشتر است
پیغام آشنا نفس روح پرور است

پیش نظر کتاب مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم و مغفور کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں " الہلال " و البلاغ " کے صفحات پر جلوہ افروز ہوئے یا ترجمان القرآن کے تشریحی حواشی میں کسی داعی حق علیہ السلام کی سیرت کے متعلق ل یا مفصل بحث کی گئی۔ میں نے وُہ سب کچھ نقل کرالیا تھا جو میرے علم میں آیا، لیکن آرزو یہ تھی کہ پہلے سیرۃ طیبہ بہ اضافہ طالب شائع ہو پھر یہ مجموعہ مرتب کر کے حوالہ طباعت کیا جائے، کیونکہ یہ سیرۃ طیبہ ہی کا ضمیمہ تھا۔

ان مقالات کا سب سے بڑا حصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے کتاب کا قریباً نصف حصہ یر لیا ہے، اس میں بعض اہم تفسیری نکات بھی آ گئے ہیں۔ دوسرا درجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے جنھیں بنی اسرائیل کو عون جیسے جابر فرمانروا کی محکومی سے نجات دلانے کی خدمت بارگاہ باری تعالیٰ سے سونپی گئی اور وُہ قوموں کی آزادی کے لیے ک زندۂ جاوید اسوہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان کے مختلف کرداروں کی سیرتوں پر تفصیل سے بصرہ کیا گیا ہے جس سے " احسن القصص " کے حقایق نہایت دل پذیر انداز میں سامنے آتے ہیں اور اندازہ ہی نہیں یقین ہوجاتا ہے کہ بے داغ سیرتیں کس طرح مصیبتوں اور آفتوں کے ہر طوفان میں سے اپنے لیے کامیابی کا راستہ نکال لیتی ہیں۔ ملوں اور سلطنتوں کو فتح کرنے کے لیے مادی سامانوں کی فراوانی سے کہیں بڑھ کر پاک و بے داغ سیرتیں درکار ہیں۔ حضرت یسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و دعوت کے مقام میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے وہ تصور بالکل زائل ہوجاتا ہے جو انجیل کے بیانات سے تلف دماغوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ باقی انبیاءؑ کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کیے گئے لیکن جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے ان پیغمبروں کے جلیل الشان کارناموں کا اندازہ کر لینے میں خاصی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

مولاناؒ نے بعض پیغمبروں کی " دعوت حق " کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وُہ مسلمانوں کو کس کس بارے میں جہاد آزادی کے لیے تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر جہاں ہر گروہ، ہر جماعت اور ہر قوم کو دا کے فرمانبردار بندے بن جانے کی دعوت دیتے تھے، وہاں وہ انسانوں کو ہم جنسوں کی محکومی سے نجات دلانے کے بھی

داعی تھے جس کے بغیر کوئی انسان خدا کا سچا فرمانبردار بندہ بن ہی نہیں سکتا۔

میری آرزو تھی کہ ان حالات میں مستند تاریخی حقایق کا اضافہ کر دوں اور جن انبیائے کرام کا ذکر اس مجموعے میں نہیں آیا ان کے حالات بڑھا دوں لیکن یہ کام بڑا محنت طلب تھا اور اس کی تکمیل خاصے وقت کی محتاج تھی۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ بالفعل اس مجموعے کی اشاعت نہ روکی جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی طبع ثانی کا موقع مہیا کرے تو اس میں ضروری اضافوں کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ حالت میں بھی یہ کتاب خاصی بصیرت افروز ہے اور اس سے پڑھنے والوں کو کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انبیائے کرام کی سیرتوں پر ہمیں کس انداز میں نظر ڈالنی چاہیے۔

سیرۂ طیبہ کی طرح اس کتاب کا مقدمہ بھی مولاناؒ ہی کے دو مقالوں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک میں سیر انبیائے کرام کی غرض و غایت واضح کی گئی ہے، دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخصوص دعوتوں کے ذکر پر کیوں اکتفا کیا گیا؟ یہ مقالے "الہلال" و "البلاغ" یا مولانا کے ترجمان القرآن میں بکھرے ہوئے تھے اور عام اصحاب کو ان کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ پھر "الہلال" و "البلاغ" عام خواندوں کی دسترس سے بھی باہر ہیں۔ یہ سب ایک کتاب کی شکل میں مرتب ہو کر زیادہ محفوظ ہو گئے ہیں اور ان کی افادی حیثیت بھی خاصی مستقل صورت اختیار کر گئی ہے۔ مرتب کتاب کی نیت اور آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے استفادے کے دائرے کو اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ وسعت دے۔ آمین

مہر

مسلم ٹاؤن لاہور

۲۱۔ مارچ ۱۹۷۱ء

مقدمہ

باب ۱

قصصِ قرآن اور استقراءِ تاریخی

گزشتہ قوموں کے وقائع و نتائج | ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ہدایت و تذکیرِ امم کے لیے جن جن اصلوں پر زور دیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل قوموں کے ایام و وقائع اور ان کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہے، کائنات ہستی کے ہر گوشے کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی خدا کا قانون سعادت و شقاوت ایک ہی ہے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں۔ جس طرح سنکھیا کی تاثیر اس لیے نہیں بدل سکتی کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لیے متغیر نہیں ہو جا سکتے کہ کس ملک میں اور کس وقت پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے تو مستقبل میں بھی ہمیشہ شہد، شہد ہی رہے گا اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہو گی۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے، ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے:

۱۔ سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلًا۔ (احزاب: ۶۲)

جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے لیے اللہ کی سنت یہی رہی ہے (یعنی اللہ کے قوانین و احکام کا دستور یہی رہا ہے) اور اللہ کی سنت میں تم کبھی رد و بدل نہیں پاؤ گے۔

۲۔ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِيْلًا ۝ (فاطر: ۴۳)

پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس سنت کی جو اگلے لوگوں کے لیے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی سنت کے احکام پھیر دیے جائیں۔

۳۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

اے پیغمبر! تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے ان کے لیے ہماری سنت یہی رہی ہے اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں۔

کامرانیاں اور محرومیاں | چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔

دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگزشتیں بار بار سناتا ہے۔ پھر جا بجا ان سے عبرت و بصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے، جن پر اقوام و جماعات کا عروج و زوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی ان ان اعمال کا انعام تھی اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی ان ان بدعملیوں کی پاداش تھی) اچھے نتائج کو " انعام" کہتا ہے کیونکہ یہ فطرت الٰہی کی قبولیت ہے۔ بُرے نتائج کو "غضب" کہتا ہے کیونکہ یہ قانون الٰہی کی پاداش ہے۔ وہ کہتا ہے جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص معلول پیدا ہو چکا ہے۔ تم کیونکر کہہ سکتے ہو کہ گیارھویں مرتبہ ایسا معلول پیدا نہ ہوگا؟

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔ (آل عمران : ۱۳۶)

تم سے پہلے بھی دنیا میں خدا کے احکام و قوانین کے نتائج گزر چکے ہیں۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و قوانین کو) جھٹلایا تھا۔

وحدت دعوت و وحدت نتائج

تمام پیغمبروں کے حالات پر غور کرو:

۱۔ سب اسی قوم میں پیدا ہوئے جس کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا کہ باہر سے کوئی اجنبی آگیا ہو جس کی زندگی سے لوگ بے خبر ہوں۔

۲۔ کوئی بھی بادشاہ یا امیر نہ تھا۔ نہ کسی طرح کا دنیوی سروسامان رکھتا تھا۔ سب کا ظہور اسی طرح ہوا کہ تن تنہا اعلان حق کے لیے کھڑے ہو گئے اور صرف خدا کی معیت و نصرت پر اعتماد کیا۔

۳۔ سب کا پیام ایک ہی تھا، خدا کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۴۔ سب نے نیک عملی کی تلقین کی۔ انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کیا۔

۵۔ سب کے ساتھ یہی ہوا کہ رئیسوں نے سرکشی کی، بے نواؤں نے ساتھ دیا۔

۶۔ مخالفت بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کی ہوئی یعنی اعلان رسالت کی ہنسی اڑائی گئی۔ ان کی باتوں کو حماقت سے تعبیر کیا گیا۔ انھیں اور ان کے ساتھیوں کو اذیت پہنچانے کے تمام وسائل کام میں لائے گئے۔ ان کی دعوت کی اشاعت کو روکنے کے لیے اپنی ساری قوتیں خرچ کر ڈالی گئیں۔

۷۔ ہر پیغمبر نے کہا: اگر میری دعوت قبول نہیں کرتے تو کم از کم میری موجودگی برداشت کرلو اور فیصلہ نتائج پر چھوڑ دو لیکن منکر اس کے لیے بھی طیار نہیں ہوئے۔

۸۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ داعی حق اور ان کے ساتھی وعظ و پند کے ذریعے سے تبلیغ کرتے یعنی دل و دماغ کو اپیل کرتے لیکن منکر جبر و تشدد سے ان کی راہ روکنی چاہتے۔ پیغمبروں کی پکار یہی ہوتی تھی کہ روشن دلیلوں پر

غور کرو۔ منکروں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ انھیں بستی سے نکال باہر کرو یا سنگسار کردو۔

۹۔ پھر دیکھو نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا پیش آیا۔ وہ تمام جماعتیں جنھوں نے دعوت حق کا مقابلہ کیا تھا، ہلاک و نابود ہوگئیں اور دنیا کی کوئی بھی طاقت انھیں قانون الٰہی کی پکڑ سے بچا نہ سکی۔ یہی نتیجہ ہے جس پر خصوصیت سے توجہ دلائی۔ قرآن دعوتِ حق کے ظہور و احوال کی یکسانی سے بے شمار مقاصد و نتائج پر استدلال کرتا ہے۔ چنانچہ الاعراف کی آیت ۹۴ میں فرمایا کہ ہمیشہ سنت الٰہی ایسی ہی رہی ہے۔ پھر آیت ۱۰۱ اور اس کے بعد کی آیات میں واضح کر دیا کہ گزشتہ دعوتوں کے ذکر سے مقصود اسی حقیقت کی تلقین ہے۔

گزشتہ دعوتوں سے استشہاد

سورۂ ھود بھی من جملہ ان سورتوں کے ہے جن میں گزشتہ دعوتوں کے وقائع سے استشہاد کیا گیا ہے اور سورہ اعراف کے ایک نوٹ میں اس طرف اشارے کیے جا چکے ہیں[1] لیکن ضروری ہے کہ یہاں مزید وضاحت کر دی جائے تاکہ آیندہ جہاں کہیں یہ بات آئے، ذہن فہم و تدبیر کے لیے مستعد رہے۔

قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل کے اختیار کی ہیں اور جنھیں وہ جابجا "حجج"، "براہین"، "بینات" اور "بصائر" سے تعبیر کرتا ہے، ان میں ایک نمایاں استدلال ایام و وقائع کا استدلال ہے۔ اس نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے ہیں، وہاں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے جیساکہ سورۂ ھود کی آیت ۱۲۰[2] میں گزر چکا ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے مقصود یہ نہیں، تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ سرگزشتیں اس کے لیے دلیلیں ہیں، حجتیں ہیں، براہین ہیں۔ پس سمجھ لینا چاہیے کہ کیونکر یہ سرگزشتیں دلیلیں ہوئیں؟ بات بالکل صاف تھی کیونکہ خود قرآن نے کھول کھول کر ہر جگہ بتلا دی ہے لیکن منطقی استدلال کے انہماک نے مفسروں کو سمجھنے کی مہلت نہ دی۔

وحدت قانون

اس سلسلے میں سب سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

قرآن کہتا ہے کہ کائنات ہستی کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالو گے ان میں ایک حقیقت ابھری ہوئی دکھائی دے گی، بشرطیکہ دیکھنے سے انکار نہ کرو۔ وہ کیا ہے؟ قوانین فطرت کی وحدت، یعنی یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح کا کام کر رہا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اپنے قانون خلق و فعل میں دوسروں سے

---

[1] یہ حصہ نقل ہو چکا ہے۔

[2] جاءك فی هذه الحق و موعظة و ذكرىٰ للمومنين۔ (پھر ان کے اندر تمھیں امر حق مل گیا اور موعظت اور یاددہانی مومنوں کے لیے)

ذرا بھی الگ ہو۔ بلا شبہ بھیس بہت سے ہو گئے ہیں اور نام بھی یکساں نہیں، مگر حقیقت ایک ہی ہے اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہو، اصلیت کی بے لاگ وحدت آکھڑی ہوتی ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو حیوان کے لیے موت و حیات ہے۔ پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے۔ پتھروں کے لیے بننا اور پامال ہونا ہے۔ اجزا کے لیے ملنا اور بکھر جانا ہے۔ بھیس بہت سے ہو گئے مگر کیا صورتیں بھی بہت سی ہو گئیں؟ نام بہت سے ہو گئے مگر کیا حقیقتیں بھی متعدد ہو گئیں؟ وہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات تھا، نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہوا، جمادات میں بننا اور پامال ہونا، اجزا میں ملنا اور بکھرنا ہوا۔ الفاظ بدلتے جاؤ، معنی نہیں بدل سکتے۔

عباراتنا شتیٰ وحسنك واحد

وکل الیٰ ذاك الجمال یشیر

اعمال انسانی کا گوشہ

۱۔ وہ کہتا ہے جب کائنات ہستی کے ہر گوشے میں وحدت قانون کی بنیادی اصل کام کر رہی ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا کوئی گوشہ اس سے باہر ہو؟ اور وہاں بھی کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو؟ اور وہ ویسا ہی نہ ہو جیسا تمام گوشوں میں ہے؟ وہ کہتا ہے یہ گوشہ بھی دوسرے گوشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح یہاں کا ہر گوشہ دوسرے گوشے سے مربوط ہے۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے، جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آ رہے ہیں مثلاً اگر عالم مادی میں تم دیکھتے ہو، آگ کا خاصہ جلانا ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے تو تمہیں اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہو سکتی ہے اور جب وہ ظہور میں آجائے تو اس سے گرمی ہی نکلے گی۔ ٹھنڈک نہیں نکل سکتی، یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے (مزید تشریح کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ اور مقدمہ دیکھنا چاہیے)

۲۔ وہ کہتا ہے جس طرح یہاں ہر بات کے لیے فطرت کے مقررہ قوانین ہوئے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہوا اور جس طرح فطرت کے تمام قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر متبدل ہیں، اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں، زبانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے، خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے، اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے، خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار برس پہلے سنکھیا کا خاصہ ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے۔ ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔

اس میں ایک بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی کیونکہ فطرت کے قوانین میں تبدیلی نہیں۔ اس نے جابجا اس قانون کو "سنة اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔

وجدانی اذعان

قرآن کا یہ استدلال فی الحقیقت طبیعت انسانی کا وجدانی اذعان ہے۔ انسان کی ذہنی فطرت کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ حوادث سے بالطبع متاثر ہوتی ہے اور اس کے اندر کوئی چیز ہے، جو اسے بتلا دیتی ہے کہ یہاں کا ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں۔ خواص و نتائج دائمی ہیں۔ یعنی جو بات یہاں ایک بار ظہور میں آتی ہے وہ ہمیشہ ظہور میں آئے گی یا ہمیشہ ظہور میں آسکتی ہے اور جس چیز کا جو خاصہ ایک مرتبہ ظاہر ہُوا وہی خاصہ ہمیشہ ظہور میں آئے گا چنانچہ بچوں کو دیکھو کس طرح وجدانی علم ان کے اندر بول رہا ہے؛ ایک بچّہ پہلی مرتبہ آگ میں انگلی ڈالتا ہے اور انگلی جلنے لگتی ہے۔ پھر جب کبھی آگ اس کے سامنے آتی ہے، وُہ کھینچ لیتا ہے۔ کیوں؛ اس لیے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہے، جو اسے بتلا دیتی ہے کہ جس چیز نے ایک مرتبہ جلایا وہ ہمیشہ جلائے گی۔ یہ اعتقاد کہ "آگ ہمیشہ جلاتی ہے" اسے صرف اتنی بات سے حاصل ہوگیا کہ "آگ نے ایک مرتبہ جلایا تھا"۔

طبیعت انسانی کا یہی وجدانی تاثر ہے جس نے ہمارے ذہن میں استقراء کا اعتقاد پیدا کیا یعنی جزئیات کا تجربہ کرنا اور اس کے ذریعے سے کلیات تک پہنچنا۔ اب ہمارے تمام علوم و معارف کا سنگ بنیاد یہی ہے۔

تبدیلی ممکن نہیں

بہر حال قرآن کہتا ہے، اگر تم وجدانی طور پر یہ بات محسوس کرتے ہو کہ خواص و نتائج کا تسلسل واجرا ایک حقیقت ہے، یعنی اگر ایک چیز سے بار بار ایک ہی طرح کا نتیجہ نکلا تو یہ اس کا خاصہ ہے اور اس میں تبدیلی ممکن نہیں، تو پھر تم کیسے انکار کر دیتے ہو کہ اعمال انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل ہو گئی اور یہاں ایسا ہونا ضروری نہیں؛ اگر تم کہتے ہو کہ فلاں بات سے ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا، کیونکہ بار بار ایسا ہو چکا ہے تو اس بات سے کیوں انکار کر دیتے ہو کہ فلاں قسم کے اعمال کا نتیجہ ہلاکت ہے، کیونکہ بار بار ایسا ہو چکا ہے؛ چنانچہ یہی بات ہے کہ قرآن جابجا کہتا ہے، تم ہی دنیا میں پہلی قوم نہیں ہو۔ تم سے پہلے بھی اسی زمین میں بے شمار قومیں گزر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں، قوتیں اور شوکتیں تھیں، سر بفلک عمارتیں تھیں، فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں، پس دنیا کی سیر کرو، گزری ہوئی سرگزشتیں سنو، مٹی ہُوئی نشانیوں کا کھوج لگاؤ، پھر دیکھو، سعادت و شقاوت کے قانون کا کیسا عمل در آمد رہ چکا ہے؛ اور اگر ایسا ہی ہو چکا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو، خدا تمھارے لیے اپنا قانون بستی معطل کر دے گا؛ یا اس طرح بدل دے گا کہ جو چیز کل تک سنکھیا رہ چکی ہے، وہ تمھارے لیے شہد ہو جائے۔

تاریخ کا صحیح استعمال

قرآن کی موعظت کا ایک خاص دائرہ ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے اندر کہتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس استدلال کو بھی اسی کے اندر رہ کر دیکھیں۔

جس کی کڑیاں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئی ہیں اور اس کی کوئی کڑی دوسری کڑی سے الگ نہیں۔ پھر کیا یہ بات کہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی طرح کی بات پیش آئی اور ایک ہی طرح کا نتیجہ نکلا، اس یقین کے لیے کافی نہیں کہ یہ ملکوں اور قوموں کی سعادت و شقاوت کا ایک الٰہی قانون ہے اور چونکہ ہمیشہ کام کرتا رہا ہے اس لیے اب بھی کام کرے گا؛

اب ان تمام سرگزشتوں پر نظر ڈالو، جو اس سورت (ھود) میں بیان کی گئی ہیں اور اعراف میں گزر چکی ہیں اور آیندہ سورتوں میں بھی آئیں گی۔ یہ حضرت نوحؑ کی دعوت سے شروع ہوتی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر ختم کردی جاتی ہیں۔ غور کرو، کس طرح ان تمام دعوتوں کے ظہور میں، اعلانات میں، تذکیر و موعظت میں، احوال و ظروف میں، رد و قبول میں، نوعیت و حیثیت میں پھر آخری نتیجہ میں کامل یکسانیت پائی جاتی ہے؛ اور کس طرح ان کی ہم آہنگی کے تمام نقطے صاف صاف اُبھرے ہوئے ہیں؛ ساتھ ہی کس طرح قدم قدم پر بتلایا جا رہا ہے کہ ہدایت وحی کے ظہور کے عام قوانین کیا کیا ہیں؛ اور کس طرح دعوتِ وحی کا ہر چہرہ اپنے خال و خط میں قطعی اور آشکارا نظر آ رہا ہے کہ شک و اشتباہ کی پرچھائیں بھی اُسے چھُونے کی جرأت نہیں کر سکتی؛

غور طلب امور

سورۂ اعراف کے ایک نوٹ میں اشارات گزر چکے ہیں اور اس سورت (سورۂ ھود) میں ہر دعوت کے وقائع کا خلاصہ بالمقابل نوٹوں میں پڑھ چکے ہو۔ ان سب پر مکرر نظر ڈالو اور غور کرو جتنے رسول پیدا ہوئے، وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے؛ اور کن کن لوگوں میں پیدا ہوئے؛ ان کی پکار کیا تھی؛ اور پکار کی نوعیت کیا تھی؛ ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انھوں نے زور دیا؛ ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے؛ انھوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کون سی تھی؛ اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، وہ کون تھا؟ پھر ان میں ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے، وہ کس قسم کے تھے؛ اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا، وہ کس قسم کا تھا؟ تم دیکھو گے کہ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی تم ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں ہُوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انھی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں کو انھوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی پکار نکلی۔ سب نے ایک ہی طرح پر لوگوں کو بلایا۔ سب نے کہا، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب نے کہا، ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ، اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ سب نے کہا: ہماری جد و جہد ادائے فرض ہے، مزدوری کی طلب نہیں۔ سب نے کہا: ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و نیک عملی کے نتائج کی بشارت دینے والے اور انکار و بدعملی کے نتائج سے متنبہ کر دینے والے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔ سب نے کہا، تمھارا بھروسا اپنی طاقتوں پر ہے، ہمارا پروردگار عالم پر۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو،

کر دیکھو، ہم اپنے کام سے باز آنے والے نہیں۔ سب نے کہا، اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلے میں سرکشی کرنا چھوڑ دو کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے پھر سب نے کہا کہ تمھاری راہ تمھارے لیے ہے ہماری راہ ہمارے لیے۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں، تم بھی انتظار کرو۔

قوموں کی حالت

پھر ان قوموں کی طرف نظر اٹھاؤ جن میں ان تمام دعوتوں کا ظہور ہوا تھا۔ کس طرح یہاں بھی ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے؛ اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا، جس طرح ہدایت کا چہرہ ایک ہی طرح کا رہا ہے؛ غور کرو۔ کوئی بات بھی ایسی دکھائی دیتی ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ نہ رہی ہو؛ سب نے اپنی اپنی باری وہی سب کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے دعوت کی ہنسی اڑائی۔ سب نے دلیلوں سے منہ موڑا۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے۔ سب نے جبر و تشدد سے راہ روکنی چاہی۔ سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک ہی طرح کا مزاج رہا اور پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے۔

پھر اگر انھیں مانا تو کن لوگوں نے مانا اور کتنوں نے مانا؟ تو یہاں بھی ہر دعوت کا معاملہ دوسری دعوت کے معاملے سے بالکل ہم آہنگ رہا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ بے نواؤں اور درماندوں نے قبول کیا اور سرداروں اور رئیسوں نے مقاومت کی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جنھوں نے مانا، وہ تھوڑے تھے، جنھوں نے انکار کیا، وہ بہت تھے۔

نتائج کی یکسانی

پھر دیکھو، نتیجہ بھی کس طرح ہمیشہ ایک ہی رہا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے خلاف ہوا ہو۔ ہمیشہ خدا کے فیصلے کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں نے نجات پائی، سرکشوں کے لیے ہلاکت ہوئی۔ یہ گویا اس معاملے کا ایک قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ آگ کے لیے گرمی تھی، برف کے لیے ٹھنڈک تھی۔ سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی اور آگ جب کبھی سلگے گی، گرمی ہی نکلے گی۔ برف جب کبھی جمے گی، ٹھنڈک ہی ہو گی۔ سنکھیا جب کبھی کھائی جائے گی، ہلاکت ہی لائے گی؛ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل و لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

قرآن کے اس استدلال کی ہم نے جو کچھ تشریح کی ہے، یہ کوئی دور کا مفسرانہ استنباط نہیں ہے بلکہ خود قرآن نے صاف صاف لفظوں میں یہ ساری باتیں واضح کر دی ہیں۔ ضرورت صرف تدبر و بصیرت کی ہے۔ قرآن کے ان بے شمار مقامات کا مطالعہ کرو، جہاں گزشتہ رسولوں یا گزشتہ قوموں کی الگ الگ سرگزشتیں نہیں بیان کیں

بلکہ محض اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے ان عبرتوں پر توجہ دلائی ہے جو ان سب کی سرگزشتوں سے مجموعی طور پر نکلتی ہیں۔ مثلاً سورۂ ابراہیم کی آیت ۹ میں فرمایا: کیا ان قوموں کی خبریں تم تک نہیں پہنچیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ پھر ان قوموں کی طرف اشارہ کیا ہے" قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد ظہور میں آئیں اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے" پھر اس کے بعد ان سب کے ایام و وقائع کی متفقہ اور مشترکہ عبرتیں بیان کی ہیں اور صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ تمام رسولوں کی صدائیں ایک ہی طرح کی رہیں اور تمام قوموں کے انکار و سرکشی کا عنوان بھی ایک ہی رہا پھر جو نتیجہ پیش آیا وہ بھی سب کے لیے یکساں تھا اور ایک ہی تھا:

فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَۙ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ۝ (ابراہیم: ۱۴)	ہم نے اپنے رسولوں پر وحی بھیجی۔ اب ایسا ضرور ہوگا کہ ہم انھیں ہلاک کر ڈالیں اور ان کے بعد تمھیں اس سر زمین میں جگہ دیں۔ یہ ہے نتیجہ اس کے لیے جو ہماری حکومت و عدالت کی جگہ سے ڈرا نیز پاداش عمل کی تنبیہ سے۔

قصص قرآن و مبادی سبعہ

سورۂ ہود میں بیان قصص کے بعد فرمایا: وجاءك فی هذه الحق وموعظة وذکری للمومنین (ھود: ۱۲۰) ان سرگزشتوں نے تم پر حقیقت کھول دی اور وہ سرتاپا موعظت و تذکیر ہیں۔ نیز بے شمار مقامات میں تصریح کی کہ ان سرگزشتوں میں حقیقت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ بڑی بڑی دلیلیں ہیں۔ تو اب غور کرو "ایام اللہ" کے اس استدلال سے کس طرح حقائق وحی کی تمام جہات واضح ہو جاتی ہیں اور کس طرح ہر حقیقت کے لیے موعظت و تذکیر مل جاتی ہے؛ تشریح کا یہ محل نہیں ۔ مقصود اشارات ہیں تاکہ تمھارے سامنے تدبر کی راہیں خود بخود کھل جائیں مثلاً بناء استدلال معاملات کی وحدت اور ان کا عالمگیر تسلسل ہے، تو اب غور کرو، یہ وحدت کس طرح ہر گوشے میں علم و یقین کا اجالا پیدا کر رہی ہے،

اوّلاً۔ وحدت انبعاث یعنی معلوم ہوگیا، ایک خاص معاملے کے لحاظ سے تمام ملکوں اور قوموں کی حالت یکساں رہی ہے۔ کوئی ملک و قوم ہو، لیکن سراغ ملتا ہے کہ وہاں کچھ لوگ ایسے ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے ابنائے جنس کو ایک خاص طرح کی تعلیم دی۔

ثانیاً۔ وحدت دعوت یعنی یہ تعلیم اگرچہ مختلف وقتوں، مختلف ملکوں، مختلف پیرایوں، مختلف زبانوں میں دی گئی لیکن ان اختلافات سے تعلیم مختلف نہیں ہوگئی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی رہی۔ گویا ایک ہی پیغام تھا جو کسی نے بہت سے پیامبروں کو دے کر بھیج دیا ہو اور زبانیں بہت سی ہوگئی ہوں مگر بات ایک ہی رہی ہو۔

ثالثاً۔ وحدت تذکیر و موعظت یعنی تمام دعوتوں کی صرف تعلیم ہی یکساں نہ رہی بلکہ تذکیر و موعظت کے اصول بھی ہمیشہ ایک ہی رہے۔

رابعاً۔ وحدت شئون و وقائع یعنی اگرچہ زمانے مختلف ہوئے، ملک مختلف ہوئے، قومیں مختلف ہوئیں، احوال و ظروف مختلف ہوئے، مگر جو معاملات پیش آئے، وہ اپنی نوعیت میں ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے۔

خامساً۔ وحدت تصدیق و انکار یعنی دعوت کے ماننے یا نہ ماننے کے لحاظ سے بھی حالت ہمیشہ یکساں رہی۔

سادساً۔ وحدت ہدایت و ضلالت فکر یعنی ہمیشہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی اور نہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی۔ جنھوں نے مانا، ہمیشہ ایک ہی طرح پر مانا، جنھوں نے نہ مانا ہمیشہ ایک ہی طرح پر نہ مانا، حتیٰ کہ تصدیق و یقین کی جتنی صدائیں اٹھیں، ہمیشہ ایک ہی طرح کی اٹھیں اور انکار و شک کی جتنی باتیں کہی گئیں ہمیشہ ایک ہی طرح کی کہی گئیں۔

سابعاً۔ وحدت ظہور نتائج یعنی پھر نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی نکلا۔ ایک سے دو نہ ہوا۔

ہدایت وحی کی حقیقت

قرآن کہتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے، تو کیا ایسی باتیں اصلیت سے خالی ہوسکتی ہیں؟ کیا ان کی قدامت، ان کی عالمگیری، ان کا دائمی تسلسل، ان کا غیر منقطع اعادہ، ان کی بے داغ وحدت، ان کی فطری صداقت کا اعلان نہیں کر رہی؟ مالکم کیف تحکمون؟

پس معلوم ہوا، یہاں کی تمام فطری اور عالمگیر حقیقتوں کی طرح ہدایت وحی کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئی۔ ایمان و عمل صالح کے قانون کی بھی ایک حقیقت ہے جس کی ہمیشہ تعلیم دی گئی۔ ہدایت و ضلالت کی کش مکش کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ نمودار ہوئی۔ تصدیق رسل کے نتائج کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئی اور انکار و سرکشی کے نتائج بھی دنیا کی ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں کیونکہ ان میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔[1]

---

[1] مطالب قرآنی کا یہ مقام نہایت وسیع ہے اور اس قدر تفصیل کے بعد بھی بے شمار اطراف بحث تشنہ رہ گئے ہیں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں کہ تکمیل بحث کے لیے مقدمہ کا اختصار کیا جائے۔

باب ۲

مخصوص دعوتوں کا ذکر کیوں؟

اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ اگرچہ قرآن نے یہاں اور دیگر مقامات میں چند خاص خاص دعوتوں اور قوموں کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کا دعویٰ عام ہے اور اسی پر یہ استدلال مبنی ہے۔ اُس نے جا بجا یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہدایت وحی کا ظہور جمعیت بشری کا عالمگیر واقعہ ہے اور کوئی قوم نہیں جس میں اللہ کے کسی رسول کا ظہور نہ ہوا ہو۔ نیز یہ کہ بے شمار قومیں دنیا میں گزر چکی ہیں جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے چنانچہ سورۂ یونس کی آیت (۴۷) میں گزر چکا ہے:

۱۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝

ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت میں اس کا رسول ظاہر ہو گیا تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ بے انصافی ہو۔

۲۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۝ (الرعد: ۷)

تو انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دینے والا ایک رہنما ہے ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہوا ہے۔

۳۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل: ۳۶)

ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔

۴۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۝ (فاطر: ۲۴)

ہم نے تجھے نیک عمل والوں کو خوشخبری دینے والا اور بدعمل والوں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

۵۔ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (ابراہیم: ۹)

کیا تم تک ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ مثلاً قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

لیکن ساتھ ہی اس نے تصریح کر دی ہے کہ قرآن کریم میں تمام رسولوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۝ (مومن: ۷۸)

اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول مبعوث کیے، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے۔

بے شمار قومیں

یہ ظاہر ہے کہ قومیں بے شمار گزر چکی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسب تصریح قرآن، ہر قوم میں دعوتِ حق کا ظہور ہُوا ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ بے شمار قومیں اور بے شمار دعوتیں ہُوئیں جن میں سے قرآن نے صرف چند ہی کا ذکر کیا، باقی کا نہیں کیا۔ قرآن نے ایسا کیوں کیا؟

اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن کا مقصود ان سرگزشتوں کے بیان سے یہ نہیں تھا کہ تاریخ کی طرح تمام واقعات کا استقصار کیا جائے، بلکہ تذکیر و موعظت تھا اور تذکیر و موعظت کے لیے اس قدر کافی تھا کہ چند دعوتوں اور قوموں کی سرگزشتیں بیان کر دی جائیں اور باقی کے لیے کہہ دیا جاتا کہ ان کا حال بھی اُنھی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں ان کا اسلوب بیان ہر جگہ عام ہے۔ جا بجا اس قسم کی تعبیرات پائی جاتی ہیں کہ پچھلی قوموں میں ایسا ہُوا۔ پچھلی آبادیوں میں ایسا ہُوا۔ پچھلے رسولوں کے ساتھ اس طرح کے معاملات پیش آئے۔ البتہ جہاں کہیں تخصیص کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہاں صرف چند ہی قوموں کی سرگزشتیں بیان کی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ یہ چند سرگزشتیں پچھلی قوموں کے ایام و وقائع کا نمونہ سمجھی جائیں اور ان سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس بارے میں تمام اقوام عالم کی روئیدادیں کیسی رہ چکی ہیں؟

البتہ کہا جا سکتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان چند قوموں ہی کا ذکر کیوں کیا گیا، جو ایک خاص خطۂ ارضی میں گزر چکی تھیں؟ دُوسرے خطوں کی اقوام میں سے کسی کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

واضح وجوہ

تو اس کے وجوہ بھی بالکل واضح ہیں، اگر تھوڑی سی دقت نظر کام میں لائی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایام و وقائع کے ذکر سے مقصود بعض مقاصد کے لیے استشہاد تھا اور یہ استشہاد جب ہی موثر ہو سکتا تھا کہ جن ایام و وقائع کا ذکر کیا جائے، ان کے وقوع سے مخاطب بے خبر نہ ہوں۔ کم از کم ان کی بھنک کانوں میں پڑ چکی ہو یا نہ پڑی ہو تو اپنے پاس کے آدمیوں سے حال پُوچھ سکتے ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ لوگ کہہ دیتے، پہلے ان وقائع کا وقوع ثابت کر دو، پھر ان سے ہمیں عبرت دلانا اور اس طرح عبرت و تذکیر کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

اب دیکھو، قرآن نے جن ایام و وقائع کا ذکر کیا ہے وہ تمام تر کن خطوں میں واقع ہُوئے تھے؟ یعنی ان کی جغرافیائی حدود کیا ہیں؟ یہ تمام وقائع یا تو عرب میں ہُوئے ہیں یا سرزمین دجلہ و فرات میں یا پھر فلسطین و مصر میں اور یہ تمام خطے ایک دوسرے سے متصل تھے۔ تجارتی قافلوں کی شاہراہوں سے باہدگر پیوستہ تھے۔ آمد و رفت کے علایق کا قدیمی سلسلہ رکھتے تھے اور نسلی و لسانی تعلقات کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہُوئے تھے جیسا کہ آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگا۔ پس قرآن نے انھی خطوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت تاریخ اقوام کا ایک ہی وسیع خطہ رہ چکا ہے۔ دوسرے خطوں سے تعرض نہیں کیا کیونکہ مخاطبین کے لیے ان خطوں کا ذکر ان کی شب و روز کی باتوں کا ذکر تھا اور وُہ جھٹلانے کی جُرأت نہیں کر سکتے تھے۔ عرب خود ان کا ملک تھا۔ عراق سے ان کے تعلقات تھے۔ فلسطین کے کھنڈروں پر

ہر سال گزرتے تھے۔ مصران کے تجارتی قافلوں کی منڈی تھا۔ ان ملکوں کا نام سُننا گویا اپنے چاروں طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لینا تھا۔

پھر جن قوموں کا ذکر کیا گیا اُن کے ناموں سے بھی وُہ ناآشنا نہ تھے۔ قوم تبع اور اصحاب اخدود یمن سے تعلق رکھتے تھے اور یمن عرب میں ہے۔ عاد اور ثمود کی بستیاں بھی عرب ہی کی حدود میں تھیں۔ قبیلہ مدین بالکل عرب کے پڑوس میں تھا۔ قوم لُوط کے کھنڈر ان میں سے سیکڑوں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ سرزمین دجلہ و فرات کی قوموں اور ان کی روایتوں سے بھی ناآشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ مصریں گو مصر کے فرعون اب نہیں رہے تھے لیکن مصر میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ فراعنہ کے نام ان کے لیے اجنبی نہیں ہو سکتے تھے۔

علاوہ بریں یہودی اور عیسائی خود ان کے اندر بسے ہُوئے تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کے نام ان لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ تفصیلات ربیوں اور راہبوں کو معلوم تھیں۔ یہ ان سے پُوچھ سکتے تھے اور پُوچھا کرتے تھے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایام و وقائع کے بیان استدلال میں جابجا اس طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے جیسے ایک جانی بُوجھی ہُوئی بات کی طرف اشارہ کیا جائے مثلاً جابجا فرمایا: الم یاتکم نبؤا الذین من قبلکم؟ (ابراہیم: ۹) جو قومیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں کیا تم تک ان کی خبریں نہیں پہنچ چکیں؟ یا مثلاً جابجا اس طرح کی تعبیرات پاؤ گے، اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم؟ (فاطر: ۴۴) کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پچھلی قوموں کا کیسا انجام ہو چکا ہے؟ کیونکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ برابر چلتے پھرتے رہتے تھے یعنی ہر موسم میں تجارت کے لیے نکلتے تھے اور اثنائے سفر میں کتنی ہی اُجڑی ہُوئی بستیاں، مٹتے ہُوئے نشان اور سنسان کھنڈر ان کی نظروں سے گزرتے تھے بلکہ بسااوقات انھی میں منزل کرتے تھے اور انھی کے سایوں میں دوپہر کاٹتے تھے، پھر جابجا اس طرح کی بھی تصریحات ہیں کہ یہ مقامات تم سے کچھ دُور نہیں کہ بُعد کی وجہ سے بالکل بے خبر رہے ہو اور یہ بھی کہا ہے کہ کیا علماء بنی اسرائیل سے یہ سرگزشتیں تم نے نہیں سُنیں؟ اور اگر بے خبر ہو تو علم والوں سے یعنی علماء اہل کتاب سے دریافت کر لو جو تم ہی میں بسے ہُوئے ہیں۔

پھر بعض مقامات میں عرب کے حوالی و اطراف کی تصریح بھی کر دی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان وقائع میں قصداً یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سرزمین عرب اور اس کے اطراف و جوانب ہی کے وقائع ہوں مثلاً سورۃ احقاف کی آیت (۲۷) میں قوم عاد کے ذکر کے بعد فرمایا: ولقد اھلکنا ما حولکم من القریٰ و صرفنا الآیات لعلھم یرجعون (اور ہم نے انھیں ہلاک کر دیا جو اردگرد بستیوں میں سے ہیں اور ہم نشانیاں بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وُہ رجوع کریں)

البتہ یہ ظاہر و معلوم ہے کہ ان واقعات کی تفصیلات سے لوگ ناآشنا تھے اور بعض وقائع ایسے تھے جن کی

صرف کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کس طرح پیش آیا اور صحیح سرگزشت کیا ہے؛ نہ صرف عرب میں بلکہ ان خطوں میں بھی جہاں وہ پیش آئے تھے۔ جن وقائع کا ذکر تورات میں موجود تھا ان کی بھی بعض حقیقتیں محرف ہوگئی تھیں یا بھلا دی گئی تھیں اور خود اہل کتاب کو بھی خبر نہ تھی کہ اصلیت کیا رہ چکی ہے۔ پس قرآن نے ان کی حقیقت ٹھیک ٹھیک واضح کر دی۔ ہر معاملہ اپنی اصل صورت میں نمایاں ہوگیا۔ بعض وقائع کی نسبت تصریح کر دی کہ اس سے باشندگان عرب بالکل ناآشنا تھے، یعنی نام تو سن لیا تھا لیکن اس کی یہ تفصیلات اور جزئیات کسی کو معلوم تھیں مثلاً اسی سورت (سورۃ ہود) میں حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرکے آیت (۴۹) میں تصریح کر دی کہ یہ باتیں نہ تو تجھے معلوم تھیں نہ تیری قوم کو۔ (آیت ۴۹: تلك من انباء الغيب نوحيه اليك ما كنت تعلمها انت ولا قومك من قبل: یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جسے وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا نہ تیری قوم) پھر فہم و تدبر کا ایک اور نکتہ بھی ہے اور اس طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ قرآن نے جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے دنیا کو ان کی تاریخ بہت کم معلوم تھی اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردہ خفا میں مستور تھیں لیکن اٹھارھویں صدی سے آثار قدیمہ کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اٹھے اور اب بیسویں صدی کے اثری انکشافات روز بروز ایک خاص رُخ پر جا رہے ہیں۔ ان سب سے عرب، عراق، فلسطین، شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشف ہوئے، انھوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل ایک نئی شکل دے دی ہے اور روز بروز نئی نئی حقیقتیں ابھرتی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کے صرف اتنے ہی معنی نہیں، جتنے آج تک سمجھے گئے ہیں بلکہ یہ قوموں اور نسلوں کی ایک نہایت قدیم اور وسیع داستان ہے اور وہ دنیا کے ابتدائی تمدنوں میں عظیم الشان حصہ لے چکی ہیں۔

ان تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عربی زبان اور اس کی ابتدائی شکلوں کے بولنے والوں کو ایک خاص نسل تسلیم کرلیا جائے، تو یہ دراصل بہت سے گروہوں اور قبیلوں کا ایک مجموعہ تھا جو عرب، فلسطین، شام، مصر اور عراق کے خطوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دنیا کے ابتدائی تمدنوں کی تعمیر میں بڑے بڑے حصے لیے۔ ان ملکوں کی وہ تمام قدیم قومیں جو آج تک ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ سمجھی جاتی تھیں مثلاً اسوان، سریانی فینیقی، مصری آرامی وغیرہم، فی الحقیقت الگ نہ تھیں اور عربی زبان کا ابتدائی مواد اور عربی رسم الخط کے ابتدائی نقوش ان سب میں مشترک تھے۔ حتیٰ کہ ان گروہوں نے مصر کے تخت عظمت و جبروت پر عرصے تک شہنشاہی کی اور اپنی زبان وقت کی تمام متمدن قوموں کو مستعار دے دی۔ چنانچہ دارا کے کتبوں اور مصر کے ہیروغلیفی نقوش میں عربی الفاظ آج تک پڑھے جا سکتے ہیں اور یہ بات تو ایک تاریخی حقیقت کی طرح مان لی گئی ہے کہ یونانیوں نے فن کتابت کا پہلا

سبق انہی اقوام سے حاصل کیا تھا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ اس سلسلے میں کیا کیا انکشافات ہونے والے ہیں؛ تاہم جس قدر انکشافات ہو چکے ان سے ایک بات واضح ہو گئی ہے، یعنی ایک زمانے میں یہ تمام خطے ایک خاص نسل کے عروج و انشعاب کے مختلف میدان تھے اور یہی نسل عربی قبائل کی ابتدائی نسل تھی۔

پس اگر قرآن نے صرف انہی خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے، کوئی دوسری قوم اس دائرے میں داخل نہیں ہو سکی، تو بہت ممکن ہے، اس کی علت اس سے کہیں زیادہ گہری ہو، جس قدر اس وقت تک ہم سمجھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں:

۱۔ جن اقوام کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی خصوصیت صرف اتنی نہیں کہ بعض سرزمین حجاز کے قرب وجوار میں گزری تھیں اور بعض سے اہل کتاب واقف تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ گہری کوئی بات ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے، یہ تمام قومیں اصلاً ایک ہی نسلی حلقے کی ہیں، حتیٰ کہ اگر مصریوں کا ذکر کیا گیا ہے تو مصری بھی اسی میں داخل ہیں۔

۲۔ ان انکشافات کی روشنی میں ایک اور مسئلہ بھی بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہیں ترتیب ظہور کے ساتھ دعوتوں کا ذکر کیا ہے وہاں قوم نوحؑ کے ساتھ قوم عاد اور قوم عاد کے بعد قوم ثمود نمایاں ہوئی ہے اور تینوں قوموں کو ایک دوسری کا جانشین کہا ہے، چنانچہ سورۂ اعراف کی آیت (۶۹) میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا، خدا کی یہ نعمت یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد اس کا جانشین بنایا اور آیت ۷۴ میں ہے کہ اسی طرح حضرت صالحؑ نے فرمایا۔ تم قوم عاد کے بعد اس کے جانشین بنائے گئے، چونکہ ان تینوں قوموں کا جغرافیائی محل ایک دوسرے سے الگ تھا اس لیے یہ بات واضح نہیں ہوتی تھی کہ اس خطاب کا صحیح مطلب کیا ہے؛ لیکن اب بالکل واضح ہو گئی اور توجیہوں کی ضرورت نہ رہی جو مفسرین نے اختیار کی ہیں۔

۳۔ اس سوال پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے ہر جگہ یہ تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام ہی سے کیوں شروع کیا ہے؟ اس کے متعدد وجوہ سامنے آتے تھے، لیکن ان انکشافات کی روشنی نے ایک نیا پہلو واضح کر دیا ہے یعنی حضرت نوحؑ کی دعوت اس قدیم نسل میں غالباً پہلی دعوت تھی اور چونکہ پہلی دعوت تھی اس لیے ناگزیر تھا کہ اس کی دعوتوں کا تذکرہ اسی سے شروع ہو۔

۴۔ تورات کی بنا پر سامی نسلوں اور زبانوں کی جو تقسیم کی گئی تھی اور جو اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے علماء انساب والسنہ کے نزدیک بنیادی تقسیم رہی، اب متزلزل ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے از سرِنو نئی تقسیم کرنی پڑے گی۔

ولتعلمن نباہٗ بعد حین

اس سورت کی تصریحات میں ایک معاملہ اور تشریح طلب رہ گیا ہے اور ضروری ہے کہ اس طرف بھی اشارہ کر دیا جائے

قرآن نے جس طرح دوسری قوموں کے عذاب کا ذکر کیا ہے اسی طرح قوم نوحؑ کا بھی کیا ہے اور اگر دوسری قوموں کا عذاب صرف انہی قوموں کے لیے تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم نوح کا عذاب یعنی طوفان عالمگیر نہ تصور کیا جائے لیکن چونکہ تورات کی کتاب پیدایش میں اس طرح کی تصریحات موجود ہیں کہ طوفان عام تھا اور یہودیوں اور عیسائیوں کا ایسا ہی اعتقاد رہا اس لیے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا اور اسی طرح کی تفسیر کی جانے لگی جو طوفان کے عموم پر مبنی تھی ۔ بہرحال دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں : ایک یہ کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں، جس سے طوفان نوحؑ عام ثابت ہوتا ہو، دوسری یہ کہ تورات کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ ہی کہا جائے، لیکن موجودہ زمانے میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتاب پیدایش لائق اعتماد نہیں، خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ۔ اس کی تفصیل "مقدمہ" میں ملے گی [1]

---

[1] مقدمہ سے مراد قرآن مجید کا وہ مقدمہ ہے جو مولانا نے مرتب کیا تھا لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حضرت نوحؑ

باب ۳

اُسوۂ نوحیؑ

ہُشدار کہ سیلاب فنا در پیش است

خدا کی پکڑ "ہاں مشو مغرور بر حلم خدا" قدرت کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں، جور و ستم، تشدد و تباہ کاریاں، استبداد و مردم آزاری، ان سب پر خدا کی نظر ہے۔ جس طرح مسجدیں گرائی جاتی ہیں، خانقاہیں بند کرائی جاتی ہیں، کمزور جماعتیں ستائی جاتی ہیں۔ خدا ان تمام باتوں کو دیکھتا ہے، سنتا ہے اور خاموش رہتا ہے کہ لعلھم یرشدون (شاید یہ خود ہی راہِ راست پر آجائیں) زبردست ہستیوں کو جب اس پر بھی تنبہ نہیں ہوتا، زبردست آزادی میں مطلق کمی نہیں آتی۔ طغیان و سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو ان بطش ربک لشدید (پروردگارِ عالم کی گرفت بہت سخت ہے) کی وعید ہیجان میں آتی ہے۔ "دیر گیرد سخت گیرد مر ترا" کا طوفان جوش کھاتا ہے اور تر و خشک سب کو بہالے جاتا ہے۔

عمومی طوفان اس ذیل میں سب سے پہلا طوفان وہ تھا جس نے عصرِ حجری و عصرِ نباتی کے بعد عصرِ حیوانی کے آغاز عہد میں تقریباً تمام دنیا کی حالت بدل دی تھی۔ علمی زبان میں اس طوفان کو "طوفان عام جیولوجی" (ارضیات) کہتے ہیں۔ سطح زمین کی غفلت نے اندر کی مشتعل حرارت کے تمام منافذ و مخارج بند کر رکھے تھے، بخارات کا التہاب بڑھتا رہا اور زمین کی ابتدائی حالت آتش افشانی کی گنجائش بھی نکال نہ سکی۔ استبداد کی تنگ گیریاں بہت دیر تک قایم نہیں رہ سکتیں۔ سمندر کے وسط میں دفعتہً پہاڑیوں کا سلسلہ کھل گیا۔ ملتہب مادے جوش و خروش کے ساتھ پھوٹ بہے، ہولناک طوفان نے تمام کرۂ ارض کو چھا لیا اور تقریباً جتنی جاندار ہستیاں تھیں، سب کو بہالے گیا۔ یہ طوفان جس کی عمومیت ناقابلِ انکار ہے، موجودہ نسل انسانی سے قبل کا ہے، اس کے بعد جتنے طوفان آئے، وہ خاص خاص ممالک و مقامات تک محدود تھے۔

ہندوستان کا طوفان نوعِ انسانی کی تکوین کے بعد جو طوفان آئے ہیں، ان میں سب سے بڑا اور سب سے پہلا طوفان غالباً ہندوستان کا تھا، جس کی نسبت "وشنو" نے اپنے ایک معتقد پجاری کو اطلاع دی تھی کہ "سات دن میں ایک طوفان آئے گا جو ان تمام مخلوقات کو کہ میری توہین کرتے ہیں، ہلاک کر ڈالے گا۔ تم ایک کشتی میں سات رشیوں اور اپنی عورت کے ساتھ بیٹھ جانا اور ہر طرح کے

حیوانات کو بھی بٹھا لینا" اساطیر ہند (آرین میتھالوجی) کے مطابق یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ ویشنو نے خاتمۂ طوفان کے بعد شیطان کو قتل کر ڈالا۔ وید مقدس کے جتنے نسخے تھے، سب چھپا ڈالے اور اپنے مخلص پجاری کو الٰہیات کی تعلیم دے کر ساتویں "منو" کا خطاب عنایت کیا۔

بابل کا طوفان

دوسرا ہولناک طوفان جس کے واقعات قدیم کلدانی روایتوں میں ملتے ہیں، بابل میں آیا تھا۔ یہ واقعہ پادشاہ "ذی زوتروس" کے عہد کا ہے جس کو "خرونس" دیوتا (زحل) نے اس کی اطلاع دی تھی اور خواب میں کہہ دیا تھا کہ انسان کے فتنہ و فساد نے مجھے غضب ناک کر رکھا ہے۔ میں ان کو تعزیر دوں گا اور سب کو طوفان سے ہلاک کر ڈالوں گا تم اور تمھارے خاندان والے البتہ بچ کر رہیں گے۔ مبدٔ و منتہا و اوساطِ اشیا کے متعلق جو تحریریں ہیں، ان سب کو لے کر "سیپارس" (مدینۃ الشمس) میں دفن کر دو اور ایک کشتی بناؤ جو طول میں پانچ "اسناد" اور عرض میں دو "اسناد" کی ہو (ایک اسناد ایک سو پچیس فیٹ کے برابر تھا[1])۔ اہل و عیال کو لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو پانی کے سپرد کر دو۔ ذی زوتروس نے امتثال امر میں بڑی سرگرمی دکھائی، طوفان کم ہوا تو کشتی سے ایک دو چڑے (کنجشک) اڑا دیے، خشکی کا نام و نشان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ چڑا واپس آیا۔ دوسری مرتبہ کی آمد میں پنجوں میں کیچڑ بھری تھی اور چونچ میں کوئی سبز گھاس تھی۔ معلوم ہوا کہ خشکی نمودار ہو چلی ہے۔ تیسری مرتبہ گیا تو واپس نہ آیا۔ خشکی کا اب ٹھیک اندازہ ہو گیا تھا۔ کشتی آگے بڑھائی گئی۔ سامنے ایک پہاڑ نظر آیا۔ وہیں ٹھہر گئی۔ اہل کشتی اتر پڑے۔ دیوتاؤں کے آگے سر کے بل گر پڑے، قربان گاہ بنائی، بھینٹ چڑھائی۔ مدینۃ الشمس سے دفینہ نکالا، بابل کو پھر آباد کیا اور بستیاں بسائیں۔

علمائے طبیعت و آثار کی رائے میں تورات کے واقعۂ طوفان نوح کی تفصیل اسی روایت سے ماخوذ ہے۔

تیسرا اور چوتھا طوفان

تیسرا واقعہ طوفان "ہیرا پولیس" کا ہے جس کی تشریح "لوسیانوس" نے کی ہے، واقعات سب ملتے جلتے ہیں۔ حسب معمول اس طوفان کی نسبت بھی یہی ادعا ہے کہ صرف "دیکالیون" اور اس کے گھرانے والے بچ رہے تھے اور ساری آبادی غرق ہو گئی تھی۔ دیکالیون کی کشتی "ہیرا پولیس" پہنچ کر ٹھہری تھی۔ وہیں اس نے ایک ہیکل بنایا جس کو پسینہ آتا تھا، اس پر وحی اترتی تھی اور وہ آدمیوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔

چوتھا طوفان جزیرۂ ساموتراس کا تھا جس سے مورخ ڈیوڈورس کی رائے میں بحیرہ مرمر (مارمورا) نکلا۔

پانچواں اور چھٹا طوفان

پانچویں غرقابی قدیم یونان کے علاقہ "بولیس" کے طوفان سے ہوئی جو بادشاہ "اوجیج" کے عہد میں حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار نو سو برس پیشتر بحیرہ "کوبالیس"

---

[1] گویا طول میں سوا چھ سو فٹ اور عرض میں اڑھائی سو فٹ۔

سیلاب آنے سے آیا تھا" آگسٹینس" نے جو مندر" ہیلیون" کا بڑا پجاری تھا، اس کے جزئیات پر نہایت شرح وبسط سے گفتگو کی ہے اور" وینس" (زہرہ) دیوتا کے دفعتہً رنگ وصورت وجم ورفتار بدل جانے کا اسے سبب ٹھہرایا ہے، ادبیات مشرق میں یونان کی غرقابی یہیں سے نکلی ہے۔

چھٹا طوفان پادشاہ" دیکالیون" فرمانروائے تھسلی کے عہد میں میلاد مسیح سے ایک ہزار چھ سو برس قبل آیا تھا اور تھسلی[1] کو بہالے گیا تھا۔ ہیروڈوٹس کی روایت ہے کہ تھسلی ایک بڑا دریا تھا، سمندر کے دیوتا" نیپچون" نے اس کا پانی بہادیا اور ملک میں طوفان آگیا۔

ان واقعات پر خرافات کا اثر تو ضرور غالب ہے مگر اصلیت سے خالی نہیں۔ علم الطبیعہ کے مشہور ترین فرانسیسی مؤلف (موسیو ڈوبیے) نے تاریخ الانسان الطبیعی (ص ۲۴-۲۸، ۳۵-۴۲) میں ان پر نہایت حکیمانہ نظر سے ریویو کیا ہے۔

ساتواں طوفان ساتواں طوفان حضرت نوحؑ کے عہد میں آیا تھا، یہ حادثہ میلاد مسیح سے تین ہزار تین سو اڑتیس برس قبل کا ہے اور اس وقت پانچ ہزار دو سو اکاون برس اس کو ہو چکے ہیں[2]۔ قرآن کریم نے اس کی پوری تشریح کی، سورۂ ہود میں ہے،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْــَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ

ہم نے نوح کو ان کی قوم کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ" لوگو، میں تم کو صاف صاف خطرے سے آگاہ کیے دیتا ہوں کہ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کیا کرو۔ مجھے تمھاری نسبت ایک روز دردناک عذاب کا خوف ہے۔" سرداران قوم کفار نے اس پیغام کو سن کر کہا کہ" ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے جیسے بشر تم بھی ہو۔ بظاہر ہم میں جو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں، انھیں نے تمھاری پیروی بھی کی ہے۔ اپنی نسبت تم لوگوں میں ہم کو تو کوئی برتری بھی نظر نہیں آتی بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔" نوحؑ نے جواب دیا" تم لوگوں کی کیا رائے ہے، میں اگر اپنے پروردگار کے کھلے رستوں پر ہوں؟ اس نے

---

[1] تھسلی مشرقی یونان میں ہے۔ یہ وہی مقام ہے جسے بعد کے زمانے میں سالونیکا کہنے لگے۔

[2] یہ حساب اس وقت کا ہے جب یہ تحریر شائع ہوئی تھی یعنی ۱۹۱۳ء میں اور آج سے اٹھاون برس پیشتر۔

مالاً ط اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ط اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ط اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ط اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○

(سورہ ہود: ۲۸-۳۱)

اپنے جناب سے نعمت و رحمت بھی عطا کی ہے۔ تم کو وہ راستہ دکھائی بھی نہیں دیتا تو اس حالت میں کہ تم اسے مکروہ جانتے ہو۔ کیا ہم اس پر تمھیں مجبور کر رہے ہیں؟ لوگو میں اگر ان کو نکال بھی دوں تو خدا کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں نہ میں غیب جانتا ہوں نہ اپنے آپ کو فرشتہ کہتا ہوں اور جو لوگ تمھاری نظروں میں حقیر ہیں، میں ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہتا کہ خدا ان پر فضل نہ کرے گا، ان کے دل کی بات تو خدا ہی جانتا ہے۔ میں ایسا کہوں گا تو ایک ظالم میں بھی ہوں گا۔

عذاب کا مطالبہ

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ○ وَلَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ط هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (ہود: ۳۲-۳۴)

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ط قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ○

(ہود: ۳۵)

کفار نے کہا: "نوح! تم ہم سے بہت جھگڑ چکے، سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو، اسے لاؤ۔" نوح نے جواب دیا کہ "خدا کو منظور ہوگا تو وہی عذاب تم پر بھی نازل کرے گا، تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے، خدا ہی کو اگر تمھیں گمراہ کرنا منظور ہے تو میں کتنی ہی نصیحت کرنی چاہوں میری نصیحت تمھارے کام نہ آئے گی، وہی تمھارا پروردگار ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ جانا ہے۔

کیا وہ کہتے ہیں کہ "یہ باتیں بنا رکھی ہیں؟" تم کہہ دو کہ "میں نے اگر یہ باتیں بنائی ہیں تو اس کا گناہ مجھ پر ہے اور تم جو گناہ کرتے ہو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔"

کشتی بنانے کا حکم

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ

نوح کو وحی ہوئی کہ "تمھاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں

إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ۝

(ھود: ۳۶-۳۷)

ان کے سوا اب ہرگز کوئی ایمان نہ لائے گا۔ یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے ہیں تم اس کا کچھ غم نہ کرو، تم ایک کشتی ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق بناؤ اور ان ظالموں کے متعلق مجھے مخاطب نہ کرو۔ یہ ضرور غرق ہوں گے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۔ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝

(ھود: ۳۸-۳۹)

نوح کشتی بنانے لگے۔ قوم کے وجیہ اور رودار لوگوں کا جب ان پر گزر ہوتا تو وہ ان سے تمسخر کرتے۔ نوح جواب دیتے کہ "تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو جیسے آج تم ہم پر ہنس رہے ہو، اسی طرح کل کو ہم بھی تم پر ہنسیں گے۔ عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ رسوائی بخش عذاب کس پر آتا ہے اور دوامی تکلیف کس کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

فان اور کشتی

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝

(ھود: ۴۰)

یہ کیفیت اسی طرح رہی، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تنور نے جوش کھایا تو ہم نے نوح کو کہا کہ "ان سب کو کشتی میں بٹھا لو۔ ہر جوڑے کے دو دو جفت کو۔ اپنے گھر والوں کو۔ ان کے علاوہ جن کی نسبت پہلے قول ہو چکا ہے اور ان کو جو ایمان لا چکے ہیں" اور ان کے ساتھ تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ ۝ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا

نوح نے ان سب سے کہا "آؤ کشتی میں بیٹھ جاؤ، بسم اللہ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا، حقیقت میں میرا پروردگار غفور رحیم ہے"، کشتی ان سب کو پہاڑ جیسی موجوں میں لیے چلی جا رہی تھی۔ اس حالت میں نوحؑ نے اپنے بیٹے کو جو الگ تھا پکارا کہ: بیٹا آؤ، ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، کافروں کے ساتھ نہ رہو" اس نے کہا "میں ابھی کسی پہاڑ کے سہارے جا لگتا ہوں، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا" نوحؑ نے کہا:

مِنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ○

(هود: ۴۱-۴۳)

"آج کے دن خدا کے غضب سے کوئی بچانے والا نہیں، نہ بچے تو وہی بچے جس پر خدا رحم کرے"۔ اسی حالت میں باپ بیٹے کے مابین ایک موج حائل ہوگئی۔ ڈوبنے والوں کے ساتھ نوحؑ کا بیٹا بھی ڈبو دیا گیا۔

طوفان کا خاتمہ

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ○ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○ قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

(هود: ۴۴-۴۸)

کام تمام ہو چکا تو حکم دیا گیا کہ " اسے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے آسمان تھم جا۔ پانی اتر گیا، حکم کی تعمیل ہوئی، کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں کی جماعت دُور ہو"۔ نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا "اے میرے پروردگار، میرا بیٹا بھی میرے ہی گھر والوں میں ہے تیرا وعدہ سچا ہے اور تُو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ جواب ملا کہ" اے نوحؑ! وہ تمہارے گھر والوں میں شامل نہیں، وہ بدکار ہے، جو بات نہ جانتے ہو، ہم سے اس کی درخواست نہ کرو، ہم تمہیں سمجھائے دیتے ہیں کہ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو"۔ نوحؑ نے عرض کیا کہ "اے میرے پروردگار میں ایسی جرأت سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو، تجھ سے اس کی درخواست کروں۔ میری گستاخی تُو اگر نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم نہ کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ سب کچھ ہو چکا تو حکم دیا گیا کہ" اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ کشتی پر سے نیچے اترو۔ یہ برکتیں تمہارے اور ان اقوام کے شامل حال رہیں گی، جو تمہارے ساتھ ہیں۔ بعد کی قومیں بھی ہم سے نفع اٹھائیں گی، لیکن آخر کار ہماری جانب سے ان کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

تورات کا بیان | یہ واقعات کسی قدر اضافہ و اختصار کے ساتھ تورات میں بھی مذکور ہیں۔ تورات نے ان میں

کچھ باتیں بڑھادیں، کچھ حذف کردیں، کچھ ضبط کرڈالیں۔ مثلاً:

تورات کا بیان ہے کہ طوفان عام تھا۔ روے زمین کے جتنے براعظم اور جزیرے تھے، سب غرق ہوگئے تھے۔ "پانی زمین پر بے انتہا چڑھ گیا۔ تمام اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے ہیں، سب چھپ گئے۔ سارے جاندار جو زمین پر چلتے تھے، پرند، چرند، جنگلی جانور اور کیڑے کوڑے جو زمین پر رینگتے تھے اور جتنے انسان تھے، سب مرگئے۔ ہر ایک متنفس مخلوق جو خشکی پر تھی، مرگئی۔ روے زمین کے تمام موجودات جن میں جان تھی، سب کے سب مٹ گئے۔ انسان سے لے کر حیوان تک، کیڑے کوڑوں اور آسمانی پرندوں تک سب مٹ گئے۔ فقط نوحؑ اور جو اس کے ساتھ کشتی کے اندر تھے، بچ رہے۔ (پیدایش ۷: ۱۹-۲۳)

یہ عمومیت عقل کے بھی خلاف تھی۔ تاریخ بھی خاص اس واقعے کی تعمیم میں اس امر کی موید نہ تھی۔ علم الآثار بھی تکذیب کررہا تھا۔ طبقات الارض کی شہادت بھی اس کے حق میں نہ تھی اور یہ بات تو کسی طرح قیاس میں آسکتی ہی نہ تھی کہ صرف ایک گناہگار قوم کو سزا دینے کے لیے خدا نے سارے جہان کو جس میں بہت سی بے گناہ جماعتیں بھی رہی ہوں گی، بہت سے بے قصور اشخاص بھی ہوں گے، بہت سی ناکردہ گناہ آبادیاں بھی ہوں گی، غرق کرڈالے اور روے زمین پر کسی متنفس کو زندہ ہی نہ چھوڑے۔

قرآن مجید کا موقف یہ ایرادیں آج اس زمانے میں وارد کی جارہی ہیں لیکن قرآن کریم نے اس عہد میں جب کہ طوفان نوح کی عمومیت سے کسی کو انکار نہ تھا، صاف لفظوں میں اعلان کردیا۔

الذین ظلموا انهم مغرقون (جن لوگوں نے ظلم کیا ہے وہی غرق کیے جائیں گے) قوم نوحؑ اس ظلم و ستم کی مرتکب تھی، وہی غرق ہوئی۔ انھی بستیوں میں طوفان آیا اور سیلاب فنا انھی ظالموں کو بہالے گیا۔

فرزند نوحؑ کے تذکرے سے جو کافروں کا شریک حال تھا اور طوفان میں ڈوب کر مرگیا، تورات خاموش تھی۔ قرآن نے یہ فروگزاشت ظاہر کردی اور دکھادیا کہ مولفین تورات کی جمع و تالیف کس پایے کی ہیں۔

غلط باتیں واقعۂ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی توجہ کاروبار زراعت کی جانب مصروف ہوئی۔ انگور کا ایک باغ لگایا، شراب نکالی اور پی کر مست ہوگئے۔ گھر میں پہنچے تو نشے کا عالم تھا، کپڑے اتار دیے اور سو رہے۔ حام نے ان کو برہنہ دیکھ کر اپنے بھائیوں کو خبر دی۔ سام و یافث گئے اور برہنگی چھپادی۔ بیدار ہونے پر جب حضرت نوحؑ کو واقعہ معلوم ہوا تو کنعان کو بددعا دی۔ تورات نے اس بددعا کے الفاظ بھی نقل کردیے ہیں کہ "کنعان ملعون ہو، وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا، خداوند سام کا خدا مبارک، کنعان اس کا غلام ہوگا۔ خدا یافث کو پھیلائے۔ وہ سام کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔" (پیدایش ۹: ۲۰-۲۷)۔ حام حضرت نوحؑ کا بیٹا تھا (پیدایش ۶: ۱۰، ۱۸، ۱۰: ۱) اور کنعان حام کا

بیٹا تھا (پیدائش ۱۰: ۶، ۹: ۲۲) گستاخی کنعان سے نہیں بلکہ اس کے باپ حام سے سرزد ہوئی تھی (پیدائش ۹: ۲۳، ۲۵) لیکن تورات صاف کہہ رہی ہے کہ حضرت نوحؑ اس سے ذرا بھی نہ بولے، نہ ناراض ہوئے، اظہار جلال ہوا بھی تو کنعان پر جو بالکل بے قصور تھا اور جسے اس واقعے سے براہ راست کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ قرآن نے اس کہانی کا تذکرہ تک نہ کیا اور خاموشی کی زبان میں بتا دیا کہ سرے سے یہ مذکور رہی غلط ہے بل کذبوا بما لم یحیطوا بہ علما۔

غیب کی خبریں قرآن موعظت و عبرت ہے، اخلاق و آداب ہے، بشیر ترقی، نذیر تنزل ہے لیکن تاریخ و تمثیل نہیں۔ با ایں ہمہ جو غلط واقعے مشہور ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی ان کی تصحیح کر دیا کرتا ہے۔ حضرت نوحؑ کا واقعہ بیان کر کے وہ بڑے دعوے سے اعلان کر رہا ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۚ فَاصْبِرْ ۚ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (ھود: ۴۹)

یہ غیب کی چند خبریں ہیں، جنھیں بطریق وحی تمھیں سناتے ہیں۔ اس سے پیشتر تم اور تمھاری قوم کسی کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ اب صبر و ثبات کو شیوہ بناؤ۔ جو لوگ متقی ہیں، انھی کا انجام بخیر ہے۔

معنی تنور طوفان کیونکر آیا؟ مفسرین کی غالب اور عام رائے یہ ہے کہ کھانا پکانے کا ایک تنور تھا، اسی سے طوفان کا چشمہ پھوٹا، لیکن اس خیال میں کوئی انداز مجاز یا تمثیل مضمر تھی جو نہیں سمجھی گئی۔

تورات کا بیان ہے کہ "جب نوحؑ کی عمر چھ سو برس کی ہوئی، دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ کو اسی روز بحر محیط کے تمام سوتے پھوٹ نکلے، آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس شبانہ روز تک زمین پر مینہ کی جھڑی لگی رہی۔" (پیدائش ۷: ۱۱) قرآن کریم نے بھی اسی حقیقت کی تائید کی ہے۔ سورۂ قمر میں ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (القمر: ۱۱-۱۲)

ہم نے موسلا دھار مینہ سے آسمان کے دروازے کھول دیے، زمین کے سوتے جاری کر دیے۔ آخر جو اندازہ مقرر ہوا تھا، اسی کے مطابق آسمان کے پانی سے مل گئے۔

بے شبہ فار التنور (تنور جوش میں آیا) کے الفاظ بھی قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم محاورۂ عرب میں "تنور" "روے زمین" کو کہتے تھے، حدیث میں ہے:

عن ابن عباس انہ قال فی قولہ "وفار التنور" قال التنور وجہ الارض قال قیل لہ

"تنور نے جوش کھایا" کی تفسیر میں عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ "تنور کے معنی روے زمین کے ہیں یعنی

اذا رأيت الماء على وجه الارض فاركب انت و من معك ، قال : والعرب تسمى وجه الارض تنور الارض [1]

حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ جب دیکھو کہ روئے زمین پر پانی چڑھ گیا تو اپنے ساتھیوں کو لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اہل عرب نے "روئے زمین" کا نام "تنور زمین" و زمین رکھ چھوڑا ہے۔

کشتی کہاں ٹھہری

تورات کے موجودہ تراجم میں کشتی نوحؑ کا مستقر کوہ ارارا ط کو قرار دیا ہے (پیدائش ۸: ۴) لیکن علامہ یاقوت حموی نے اصل زبان سے تورات کا جو لفظی ترجمہ پیش کیا ہے اس میں ...اے ارارا ط "جودی" مذکور ہے[2] (معجم البلدان طبع مصر ج ۳ ص ۱۶۴) - یہ پہاڑی (جودی) موصل کے ...قریب دریائے دجلہ کے مشرقی جانب واقع ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جس کے مضافات میں قوم نوحؑ آباد تھی، ...ل میں "جودی" ایک گاؤں کا نام تھا (معجم البلدان ج ۷ ص ۱۵) اور پہاڑی کا وہ سلسلہ جو اس گاؤں سے متصل تھا، ...ہ جودی کے نام سے مشہور تھا - اسی نواح میں "قردا" و "بازبدا" کی مشہور آبادیاں بھی تھیں - وہاں یہ پہاڑی ...ی بستیوں کے نام سے موسوم تھی - اخبار الطوال کے مصنف نے اسی مناسبت سے کشتی نوحؑ کا مستقر جبل ...ا و بازبدا کو ٹھہرایا ہے (اخبار الطوال ص ۳) اور ابن قتیبہ نے بھی یہی روایت نقل کی ہے (معارف ص ۸) ...مور مسیحی مورخ گریگوری ابو الفرج ملطی نے ان سب کی تطبیق کر دی ہے کہ جبل قردا اور کوہ جودی دونوں ...ک ہی ہیں (مختصر الدول ص ۱۲۱) - کوہ ارارا ط کا وسیع سلسلہ جابجا مختلف ناموں سے مشہور تھا، تورات کے ...موجودہ ترجمے میں صرف پہاڑ کا اصلی نام بتا دینا کافی سمجھا گیا لیکن قرآن نے اس پہاڑی چوٹی کی جگہ بھی بتا دی جہاں ...تی ٹھہری تھی۔

---

[1] رواہ ابو جعفر قال حدثنی یعقوب بن ابراھیم قال حدثنا ھیشم قال اخبرنا العوام بن جوشب عن ...ضحاک عن ابن عباس انہ قال الخ و بطریق اخر عن المسثنی قال ثنا عمرو بن عون قال اخبرنا ھیشم عن ...عوام عن الضحاک بنحوہ - و بروایۃ اخری عن ابی کریب و ابی السائب قالا ثنا ابن ادریس قال اخبرنا ...شیبانی عن عکرمۃ فی قولہ و فار التنور قال وجہ الارض ، و بروایۃ اخری قال حدثنا زکریا بن یحیی بن ابی زائدۃ ...سفیان بن وکیع قالا ثنا ابن ادریس عن الشیبانی عن عکرمۃ و فار التنور قال وجہ الارض۔ [2] سریانی و کلدانی زبان میں ...ات کے جو نسخے ہیں ان میں بھی سفینہ نوحؑ کا مستقر کوہ جودی مذکور ہے - دائرۃ المعارف العربیہ کے مسیحی مولفین لکھتے ہیں کہ روایات ...ہم اس قول کی تائید میں ہیں کہ اس حادثہ کا مرکز یہی پہاڑی (جودی) تھی - بروسس جو اسکندر اعظم کا معاصر تھا، اس کی بھی یہی رائے ہے - ...ہ جودی کی چوٹی پر کشتی کے آثار بھی اسے ملے تھے (دائرۃ المعارف حرف جیم)۔

تعلیم ربانی کے خاص پہلو

واقعہ نوحؑ کی ذیل میں تعلیم الٰہی کے خاص پہلو یہ ہیں:

۱۔ مادہ کی گوناگوں صورت گری جب کسی قوم کو خدا سے بالکل ہی غافل بنادے قانون الٰہی کے حدود ٹوٹنے لگیں، طغیان و سرکشی عام ہوجائے، علم کی فراوانی حجاب اکبر کا کام دینے لگے، تمدن ضلالت کی جانب راہ نمائی کرتا ہو، خدائے واحد کی پرستش سے اتنا بھی سروکار نہ ہو کہ اس کی پرستش گاہوں کا ادب کیا جائے تو ان حالتوں میں دعوت الی الحق فرض ہے۔ اس فرض کے ادا کرنے میں خواہ کیسی ہی بندشیں عاید ہوں، زبانی تقریر کو روکنے کے لیے مجرمانہ سازشوں کے نام سے قانون بنائے جائیں، لسانی تحریر کو بند رکھنے کی غرض سے تعزیری ایکٹ پاس ہو۔ بااین ہمہ ان بندشوں سے جو نتائج پیش آنے والے ہوں، ان کے اظہار سے خاموش نہ رہنا چاہیے اور علانیہ کہہ دینا چاہیے کہ اس گمراہی کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

ادائے فرض کا وجوب

۲۔ دعوت الی الحق کے لیے جو لوگ کمربستہ ہوں گے انھیں یہ فرض ادا کرنے میں اپنی شاندار امتیازی حیثیت قایم کرنے کی فکر نہ ہونی چاہیے کہ ارباب اقتدار کی نظروں میں درخور حاصل کرکے پہلے اپنی ممتاز پوزیشن قایم کرلیں، پھر کام شروع کردیں۔ یہ بے راہ روی کا طریقہ اور ایسی خصوصیت کی تمنا خام خیالی ہے۔ داعی الی الحق کو بظاہر اس کمزور پوزیشن پر طعنے دیے جائیں گے، تحقیر ہوگی، بے وقعتی کی جائے گی، جھوٹا کہا جائے گا، ہنسی اڑائی جائے گی، وہ ان سب کو انگیز کرلے گا اور اپنا فرض پورا کرکے رہے گا۔

دعوت حق کا ابتدائی دور

۳۔ داعی الی الحق کی جماعت کچھ ایسی وسیع نہ ہوگی، معمولی افراد اس کے شریک عمل ہوں گے، جو عام نظروں میں ذلیل و رذیل دکھائی دیں گے۔ ان میں یہ بھی خصوصیت نہ ہوگی کہ جن مقتدر جباروں کی دعوت کرنی ہو ان پر کچھ احسان کیے ہوں یا انھیں منت پذیر بنانے کے لیے چندے دیے ہوں، رزولیشن پاس کرائے ہوں، وہ اس طلسم فریب سے اپنے کام کو تقویت نہ دیں گے بلکہ نہایت صفائی اور سادگی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو کرنا ہوگا کر گزریں گے۔

۴۔ دعوت الی الحق کے لیے صاف بیانی، تلخ گوئی اور درشت گفتاری ناگزیر ہے، البتہ صداقت کو تسلیم کرانے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ دعوت الی الحق حصول جاہ و کسب مناصب کا ذریعہ نہیں کہ اس کے نام سے اچھے اچھے عہدے حاصل کیے جائیں۔ پبلک سروس میں نمایاں جگہ ملے، مال و دولت بڑھے۔ اس مقدس فرض کا معاوضہ دینے والا صرف خدا ہے، اجر یا اجرت جو پیش نظر ہو، اسی سے طلب کرنی چاہیے۔

داعی حق اور اس کے رفیق

۶۔ جو لوگ داعی الی الحق کے شریک عمل ہوں، ان سے بے تعلقی و علیحدگی کے لیے

...راہ کیسا ہی دباؤ ڈالا جائے مگر سختی سے انکار کر دینا چاہیے۔

۷۔ داعی الی الحق کے پاس نہ خدائی کے خزانے ہوں گے، نہ اس میں فرشتوں کی صفت ہو گی، نہ ...ب دان ہوگا، انسان کی معمولی حیثیت رکھتا ہوگا اور اسی حالت میں بڑے بڑے جباروں کی حیثیت بگاڑ دینے کا ...ی میٹم دے گا۔

۸۔ دعوت الی الحق کے لیے موقع و محل کی تلاش بے سود ہے کہ مستبدین کی طبیعت جب حاضر دیکھ لیں، ...وقت تبلیغ کا کام شروع کریں۔ یہ موقع شناسی ضروری نہیں۔ ہر حالت میں کام کرتے رہنا چاہیے اور اس ...ت سے کرنا چاہیے کہ دیکھنے والے گھبرا اٹھیں۔ سننے والے تنگ آجائیں اور بر ملا کہنے لگیں کہ مقابلے کے لیے ...تیار ہیں، جو کچھ کرنا ہو، تم بھی کر دیکھو۔

۹۔ نتیجہ ناکامیاب ہی کیوں نہ رہے، استبداد میں خواہ کچھ بھی فرق نہ آئے، مگر دعوت الی الحق کی سرگرمی میں فرق آنا چاہیے، جو لوگ دھمکی دے رہے ہوں کہ ہم نے تلوار سے فتوحات حاصل کیے ہیں، تلوار ہی کے زور سے ...س کو قایم بھی رکھیں گے۔ ان کو جواب دے دینا چاہیے کہ خدا کو اختیار ہے، چاہے تم کو تباہ کر ڈالے یا زندہ ...نے دے۔ دعوۃ الی الحق کو ان امور سے تعلق نہیں۔

۱۰۔ دعوت الی الحق مشکوک و مشتبہ نظروں سے دیکھی جائے گی، اس کے داعیوں کو سخن ساز و مفتری کہا جائے گا ...سلسلۂ سعی و تدبیر میں ان باتوں سے سستی نہ آنی چاہیے، البتہ اپنی پوزیشن کو واضح کر دینا چاہیے۔

...اروں سے بے تعلقی

۱۱۔ طغیان و جبروت کا انہماک دلوں اور دماغوں میں قبول حق کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہنے دیتا۔ ایسی طبیعتیں کبھی راہ راست پر نہیں آسکتیں۔ ان سے کنارہ کش ...انا چاہیے، قطع نظر کر لینی چاہیے اور انھیں بالکل ہی بائیکاٹ کر دینا چاہیے۔ وہ ظالم ہیں، ستم پیشہ ہیں۔ ...ب فنا میں غرق ہو جائیں گے۔ ان کے متعلق کسی قسم کی گفتگو نہ کرو، اپنے بچاؤ کی آپ تدبیر نکالو، طوفان حوادث سے ...ظ رہنے کے لیے سفینۂ نجات بناؤ، اس کے بنانے میں سرگرمی کے ساتھ لگے رہو اور خدا نے جو تعلیم ...ی ہے، اسی کے مطابق کام کرو۔

۱۲۔ اس کام میں انہماک و سرگرمی کو دیکھ کر لوگ ہنسیں گے، ہنسنے دو، تمھیں اپنے کام سے کام ہے۔

۱۳۔ حفاظت کا جو ذریعہ اختیار کیا جائے وہ صرف اپنے لیے مخصوص نہ ہونا چاہیے، بقدر گنجایش ارباب ...تبداد کے سوا جو عذاب الٰہی کے مستحق ہیں، ایک حد تک دوسرے بندگان خدا کے لیے بھی سامان حفاظت بہم ...انا چاہیے، مگر اس کی نوعیتیں مختلف نہ ہوں اور جامعہ وحدت میں خلل نہ پڑے۔

...بت کا پاس ممنوع ہے

۱۴۔ جباروں سے بے تعلقی اور بائیکاٹ میں قرابت و رشتہ داری کا پاس و

لحاظ ممنوع ہے۔ کوئی خاص عزیز ہی کیوں نہ ہو، نہایت اہم خصوصیت کیوں نہ رکھتا ہو، مگر دائرہ حق وصدق سے جہاں باہر قدم نکالے کہ تباہی آئی۔ ایسے لوگ وہی ہیں جو عمل صالح اور حقیقی کیریکٹر سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ کفار کی طرح ان کو بھی بائیکاٹ کر دینا چاہیے۔ ان پر رحم کرنا یا ان کے حق میں سفارش جرم ہے اور سخت جرم ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہیے۔

۱۵۔ ظالموں اور جباروں کو ہدایت نہیں ہوا کرتی۔ فذرھم فی طغیانھم یعمھون (چھوڑ دو کہ اپنی سرکشیوں میں بھٹکتے رہیں)۔ ان کی سرکشانہ ضلالت کچھ زمانے تک قایم رہے گی۔ کچھ مدت تک بندوں پر خدائی کرتے رہیں گے۔ آخر خدا کی حجت پوری ہوگی، اپنی روش تبدیل کرنے کے لیے انھیں متعدد موقعے دیے جائیں گے مگر ان کے استبداد میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ انجام کار سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ دنیا میں خدا کی بادشاہی قایم ہوگی، پھر انھی مظلوموں کو برکات الٰہی نصیب ہوں گے جن کی آزار رسانی میں ایک دنیا کو مزہ آ رہا ہے۔

امتحان ثبات

۱۶۔ فنائے استبداد کے بعد مسلمان کامیاب ہوں گے، ان پر خدا کی رحمت نازل ہوگی، زمانے بھر کی نعمتوں سے مستفید ہوں گے، لیکن بعد کی نسلیں جب خدا کو بھول جائیں گی، جب اضطہاد و استعباد رنگ لائے گا، جب پھر عزم و ثبات و استقلال میں ضعف آنے لگے گا تو ان پر بھی تباہی آئے گی۔ کامیابی کے لیے صبر و ثبات و تقویٰ ایک لازمی چیز ہے۔ جو قوم اس کی خوگر نہ ہوگی، جس نے قدرت کو استقلال و اتقا (اعلیٰ کیریکٹر) کا ثبوت نہ دیا ہوگا۔ اسے کامیابی کی توقع ہی نہ رکھنی چاہیے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ؟ (آل عمران: ۱۴۲)	کیا تم اس خیال میں ہو کہ بہشت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے نہ تو ان لوگوں کو جانچا جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں اور نہ ان کا امتحان کیا جو ثابت قدم رہتے ہیں۔

بشارت امن و استخلاف

یہ واقعات پیش آنے والے ہیں اور ضرور پیش آنے والے ہیں۔ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ (انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کا حکم آ جائے)۔ اس میں کامیابی مطلوب ہو تو سلسلۂ عمل کی توسیع، صبر و ثبات کا اعتصام اور تقویٰ و طہارت نفس کا تعود پیدا کرو؛ لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔ (سورۂ نور: ۵۵) (انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جس طرح انھیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے دین کو جسے ان کے لیے پسند کیا مضبوطی سے قایم کر دے گا اور خوف کی حالت کو بدل کر ان کے لیے امن کی حالت پیدا کر دے گا۔[1]

[1] مولانا نے دعوت و وحی سے تعلیم حق کے جو نکات پیش کیے۔ ان کے متعلق بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ (باقی اگلے صفحے پر)

باب ۴

نہیں اور یہ کہ

سرگزشتِ نوحؑ

نوحؑ کا مقام "الاعراف" (آیت ۵۹ؔ) سے پچھلی دعوتوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اس انقلاب حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہمیشہ سے سنت الٰہی ایسی ہی چلی آئی ہے اور ہمیشہ دعوتِ حق کی بے سروسامانیوں نے وقت کے تمام سامانوں پر فتح پائی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی دعوت نمایاں ہوتی ہے، جن کا ظہور دریائے دجلہ و فرات کے دوآبہ

(بقیہ حاشیہ ص۳۸)
قرآن مجید کی آیات میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے۔ اس سے یہ نکتے کسی خاص تاویل کے بغیر بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس انداز تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ "الہلال" و "البلاغ" کے دور میں مولاناؒ کی حیثیت ایک صحافی کی نہیں بلکہ ایک داعی کی تھی۔ وہ مختلف دعوتوں کو عالم کی حیثیت میں نہیں بلکہ داعی کی حیثیت میں پیش کرتے تھے اور ان سے اپنے عہد کے لیے دعوت کا مرقع تیار کرتے تھے اس لیے "الہلال" و "البلاغ" کے اسلوب تحریر پر بحث کرتے وقت مولاناؒ کے اصل موقف کو نظرانداز کر کے بحث کرنا بالکل غیر مناسب ہے۔ افسوس کہ اکثر اصحاب اس بنیادی غلطی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جو اصحاب، صاحب تحریر و نگارش کے مقام و موقف ہی سے آگاہ نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان کی کوئی تحریر کسی بھی نقطۂ نگاہ سے قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے "ضرب کلیم" کے آغاز میں اسی نکتے پر زور دیتے ہوئے کہا تھا:

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

لہ الاعراف کی آیت ۵۹ یہ ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا: اے میری قوم۔ اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایک ہی ہولناک عذاب کا دن تمھیں پیش نہ آجائے۔

میں ہوا تھا، جو انسانی تمدن کا سب سے قدیم گہوارہ ہے اور جہاں غالباً سب سے پہلے بت پرستی کا ظہور ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جمعیت نے اپنی ابتدائی اور فطری ہدایت کی راہ سب سے پہلے وہیں گم کی۔

دعوت نوحی

اس سلسلے کی پہلی کڑی حضرت نوحؑ کی دعوت ہے۔ حضرت نوحؑ نے کہا[1]
۱۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

۲۔ اگر تم سرکشی سے باز نہ آئے تو عذاب کا ایک بڑا ہی دردناک دن آنے والا ہے۔

۳۔ قوم کے سرداروں اور اونچے درجے کی جماعتوں نے انکار و سرکشی کی۔ صرف وہ لوگ ایمان لائے جو قوم میں ذلیل سمجھے جاتے تھے۔

۴۔ منکروں نے کہا، تم بھی ہماری ہی طرح ایک آدمی ہو پھر تمھاری بات کیوں مانیں؟ یعنی اگر تم میں کوئی اچنبھا پایا جاتا جو اور آدمیوں میں نہیں پایا جاتا یا دیوتاؤں کی طرح اُتر آئے ہوتے تو تمھاری تصدیق کرتے۔

۵۔ پھر کہا، جو ہم میں کمینے ہیں، وہی بے سمجھے بوجھے تمھیں مان رہے ہیں۔ پھر کیا ان بے وقوفوں کی طرح ہم بھی مان لیں؟ علاوہ بریں ہم ایسی جماعت میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں، جہاں رذیل و شریف میں کوئی امتیاز نہیں؟

ہدایت کا ذریعہ اور طریقہ

۶۔ حضرت نوحؑ نے کہا: انسان کی ہدایت تو انسان ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے اور وہ اتنا ہی کر سکتا ہے جو اس کے اختیار میں ہے۔ تم کہتے ہو، میں جھوٹا ہوں لیکن بتلاؤ اگر تم مجھے سچا سمجھتے تو کیا اس بات کی توقع کرتے کہ جبراً تمھیں سچائی کی راہ دکھا دوں؟ خدا کی طرف سے کتنی ہی واضح دلیل حق مجھے مل گئی ہو، لیکن تم سمجھنے سے انکار کر دو، تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

۷۔ تم جن لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہو، میں کبھی نہیں کہوں گا، وہ ذلیل ہیں اور انھیں خوبی و سعادت نہیں مل سکتی۔ اگر میں ایسا کروں تو خدا کے مواخذہ میں گرفتار ہو جاؤں۔

۸۔ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ سچائی کا پیغامبر ہوں۔ مجھے طاقت و تصرف کا دعویٰ نہیں۔ نہ میں انسانیت سے کوئی بالاتر ہستی ہوں۔

۹۔ منکروں نے ان دلائل و مواعظ پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ان باتوں کو "جدال" سے تعبیر کرنے لگے اور یہاں تک سرکشی کی کہ خود عذاب کے ظہور کا مطالبہ پیش کر دیا۔

آخری فیصلہ

۱۰۔ اس پر ارشاد الٰہی ہوا کہ کہہ دے: تم کہتے ہو کہ میں مفتری ہوں۔ اچھا اگر میں مفتری ہوں تو میرا گناہ مجھ پر اور اگر تم سچائی کو جھٹلا رہے ہو تو اس کی پاداش تمھیں جھیلنی ہے۔ میں اس سے

---

[1] دیکھیے سورہ ھود (۲۴-۴۸)

بری ہوں ۔ اب فیصلے کا انتظار کرو۔

۱۱۔ وحی الٰہی سے حضرت نوحؑ کا مطلع ہونا کہ جو ایمان لا چکے ہیں، ان کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں اور یہ کہ ملک غرق ہونے والا ہے۔ پس ایک کشتی بنا لو۔

۱۲۔ منکروں کا اس پر تمسخر کرنا۔

۱۳۔ طوفان کا ظہور اور حضرت نوحؑ کا کشتی میں سوار ہونا اور ان سب کو ساتھ لے لینا جن کے ساتھ لینے کا حکم ہوا۔

۱۴۔ سیلاب نے اتنا گہرا پانی جمع کر دیا تھا اور طوفانی ہواؤں کا یہ عالم تھا کہ اونچی اونچی موجیں اٹھنے لگی تھیں۔

نبی اور "آل" کا معاملہ

حضرت نوحؑ کے بیٹے نے ان کا ساتھ نہ دیا اور غرق ہو گیا۔ حضرت نوحؑ نے کہا: خدایا وہ میرے اہل وعیال میں سے ہے۔ فرمایا: نہیں، وہ بدعمل ہے اور بدعمل تیرے اہل میں داخل نہیں۔

یہ آیت اس باب میں قطعی ہے کہ جسمانی رشتہ، نجات کے لیے کچھ سُود مند نہیں۔ جو کچھ ہے، ایمان و عمل ہے۔

حضرت نوحؑ کو اپنے بیٹے کے کفر کی خبر تھی، اس لیے عرض کیا کہ وہ میرے اہل میں ہے اور میرے اہل وعیال کی حفاظت کا تُو نے وعدہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ حقیقت حال دوسری ہے اور تمھیں اس کی خبر نہیں۔ وہ تو ان میں سے ہے جن کے لیے کہا جا چکا ہے کہ "لا تخاطبنی فی الذین ظلموا" (ظالموں کے بارے میں ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر) اور "الا من سبق علیہ القول" (جن کے لیے پہلے بات کہی جا چکی ہے) جیسا کہ آیت ۳۷ اور ۴۰ (ھود) میں گزر چکا ہے۔

طوفان اور سیلاب کا تھمنا، حادثہ کا ختم ہونا اور کشتی کا جودی پہاڑ پر قرار پانا۔

سورۂ قمر کی آیت (۱۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے لگاتار بارش ہوئی تھی اور زمین کی تمام نہروں میں سیلاب آ گیا تھا۔ تورات میں بھی ایسا ہی ہے لیکن اس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ بڑے سمندر کی تمام سوتیں پھوٹ نکلی تھیں (پیدائش ۷: ۱۲) [1]

---

[1] اصل عبارت یہ ہے: نوح کی عمر کا چھ سواں سال تھا کہ اس کے دوسرے مہینے کی ٹھیک سترھویں تاریخ کو بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر بارش ہوتی رہی۔ آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ پانی زمین پر ایک سو پچاس دن (تقریباً پانچ مہینے) بڑھتا رہا۔ ساتویں مہینے کی سترھویں تاریخ کو کشتی اراراط کے پہاڑ پر ٹک گئی۔ پانی دسویں مہینے تک برابر گھٹتا رہا اور پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں۔

اراراط اور جودی

حضرت نوحؑ کا ظہور اس سرزمین میں ہُوا تھا جو دجلہ اور فرات کی وادیوں میں واقع ہے دجلہ اور فرات آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں اور بہت دُور الگ الگ بہ کر عراق زیریں میں باہم مل گئے ہیں اور پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ آرمینیا کے پہاڑ "اراراط" کے علاقہ میں واقع ہیں۔ اسی لیے تورات میں "اراراط" کا پہاڑ کہا ہے لیکن قرآن نے خاص اس پہاڑ کا ذکر کیا جس پر کشتی ٹھہری تھی - وہ "جودی" تھا۔

زمانۂ حال کے بعض شارحین تورات کے خیال میں "جودی" اس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جس نے "اراراط" اور جارجیا کے سلسلۂ کوہ کو ملا دیا ہے۔ وُہ کہتے ہیں "سکندر کے زمانے کی یونانی تحریرات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے - کم از کم یہ واقعہ تاریخی ہے کہ آٹھویں صدی مسیحی تک وہاں معبد موجود تھا اور لوگوں نے اس کا نام "کشتی کا معبد" رکھ دیا تھا۔

کامرانیاں اور پاداشِ عمل

ایک ایسے طوفان وسیلاب کے بعد ملک کی جو حالت ہو گئی ہوگی، اس کی بولنا کی محتاج بیان نہیں۔ قدرتی طور پر حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو خیال گزرا ہوگا کہ یہ سرزمین زندگی اور زندگی کے تمام سامانوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اب اس وحشت کدے میں ہم کیونکر زندگی بسر کریں گے؟ پس اللہ نے وحی کی کہ سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر قدم رکھو یعنی تمہارے لیے اب خوف کی کوئی بات نہ ہوگی اور سامان زندگی کی تمام برکتیں پھر ظہور میں آجائیں گی چنانچہ آیت ۴۸ (ھود) میں کہ خاتمۂ سرگزشت ہے، اسی طرف اشارہ کیا ہے "وامم سنمتعھم" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بعد جو امتیں آئیں گی انھیں اگرچہ زندگی کی ساری کامرانیاں ملیں گی لیکن پھر پاداشِ عمل سے تباہی میں پڑیں گی[1]

---

[1] سورۂ ھود کی آیت ۴۸ یہ ہے:

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

حکم ہوا، اے نوحؑ اب کشتی سے اتر۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتیں اور برکتیں ہوں نیز ان جماعتوں میں جو تیرے ساتھ ہیں اور دوسری کتنی ہی جماعتیں ہیں (بعد کو آنے والی) جنھیں ہم (زندگی کے فائدوں سے) بہرہ مند کریں گے لیکن پھر انھیں (پاداشِ عمل میں) ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔

ہودؑ اور صالحؑ

باب ۵

اُمم سامیہ اور عاد

سام کی اولاد

حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند سام کے پانچ بیٹے تھے: عیلام، اشور، ارفکسد (ارفخشد) لود اور ارام۔ ارفکسد کے بیٹے کا نام سلح تھا۔ اس سے عبر پیدا ہوا۔ عبر کے دو بیٹے تھے: قحطان اور فلج۔ قحطان کی نسل جنوبی عرب میں یمن سے ظفار تک آباد ہوئی جو حضر موت کے مشرق میں ہے۔ فلج حضرت ابراھیم علیہ السلام کے جدِ امجد تھے۔ نسب یوں ہے: تارح (آزر) بن نحور بن سروج بن رعو بن فلج۔

ارم کے بیٹے عوص سے عاد پیدا ہوئے۔ اسی کو قوم عاد کے مورث اعلیٰ سمجھنا چاہیے۔

قبائل کی تقسیم

مورخین عرب نے اپنے قبیلوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: عرب بائدہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ۔

عرب بائدہ وہ ہیں جو عرب سے باہر نکلے اور انھوں نے مختلف حصوں میں عظیم الشان سلطنتیں قایم کرلیں مثلاً ایک گروہ کی سلطنت کا مرکز بابل تھا۔ اس کا مشہور ترین بادشاہ حمورابی ہے۔ ایک گروہ نے اشوریہ کو مرکز بنایا۔ ایک گروہ شمالی مصر پر قابض ہوگیا جس کے حکمران ہیکسوس (چرواہے بادشاہ) کہلائے۔ انھی میں سے ایک بادشاہ کے زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر پہنچ کر مختار سلطنت کا درجہ حاصل کرلیا۔ نیز اپنے خاندان کو مصر کے نہایت زرخیز حصے میں آباد کیا۔ یہ لوگ حضرت یعقوبؑ (جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا) کی اولاد ہونے کے باعث بنی اسرائیل کے لقب سے مشہور ہوئے۔ جب مصریوں نے ہیکسوس کو شکست دے کر باہر نکال دیا اور شمالی مصر پر از سرِ نو قبضہ کرلیا تو بنی اسرائیل کے لیے انتہائی مصائب کا دور شروع ہوگیا۔ انھیں غلامی سے نجات دلانے کے لیے حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ یہی گروہ ہے جسے بعض مورخ یہودیوں کی پیروی میں "عمالقہ" کہتے ہیں۔ یہی عمالقہ مصر سے نکل کر شمالی عرب اور مدینہ منورہ میں آباد ہوئے۔ جو یہودی مدینہ منورہ یا خیبر اور اطراف کی دوسری بستیوں میں آباد تھے وہ انھی عمالقہ کی اولاد تھے۔ ان کا سلسلہ مدینہ اور شمالی عرب میں رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک تک بھی قایم رہا تھا اور یہ سب حضرت عمرؓ کے عہد میں عرب سے جلاوطن ہوئے۔ ان قبائل کو عرب بائدہ اس لیے کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ وطن عزیز سے نکل کر باہر عظیم الشان سلطنتوں کے بانی ہوئے، مگر دوبارہ اپنی اصلی حیثیت میں واپس نہ آسکے۔ باہر ہی برباد ہوگئے یا دوسری قوموں کے جزو بن گئے یا لوٹے تو اس حالت میں کہ بالکل اجنبی اور بے حیثیت تھے۔

عرب عاربہ قحطانی عرب تھے اور عرب مستعربہ اسماعیلی عربوں کو کہا گیا۔ ظہور اسلام کے وقت عرب میں

یہی دو گروہ موجود تھے یعنی عرب عاربہ یا قحطانی عرب اور عرب مستعربہ یا اسماعیلی عرب۔

عاد اور قرآن عاد کا ذکر قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں آیا ہے۔ بعض سورتوں میں حضرت ہودؑ کی بعثت اور دعوت کا تفصیلی ذکر ہے۔ بعض سورتوں میں محض اشارے اور اجمال پر اکتفا کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے:

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تباہ ہو چکی۔ اس کے بعد جس قوم نے عروج و اقتدار حاصل کیا وہ یہی قوم عاد تھی جیساکہ سورۂ اعراف میں بتایا گیا ہے:

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح۔ — اے عاد، خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کی تباہی کے بعد تمہیں خلافت دی یعنی حکومت عطا کی۔

۲۔ خدا نے عاد کو دنیوی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ مثلاً چارپائے، اولاد، باغ اور چشمے عطا کیے تھے۔ (سورہ شعرا: ۱۳۳ - ۱۳۴)

۳۔ حضرت نوحؑ توحید کی دعوت دیتے تھے تو سرکشان قوم کی طرف سے جواب ملتا تھا کہ تم احمق ہو اور ہم تجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ (اعراف: ۶۶)

۴۔ حضرت ہودؑ فرماتے کہ میں خدا کا پیامبر ہوں اور امانت دار ہوں یعنی جو حکم خدا کی طرف سے مجھے ملا، اسے پوری دیانت سے پہنچایا اور اس کے لیے کوئی صلہ تم سے نہیں مانگتا میرا صلہ تو اللہ کے پاس ہے۔
(شعراء: ۱۰۷؛ ہود: ۵۱)

معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ہودؑ سے بھی پیشتر عاد کے لیے ہادیانِ برحق بھیجے جاتے رہے۔ ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

کذبت عاد ن المرسلین۔ — یعنی عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ کی تکذیب اصولاً تمام پیغمبروں کی تکذیب تھی۔

عذاب کی کیفیت جب حضرت ہودؑ کی دعوت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور عاد سرکشی پر آمادہ رہے تو ان کے لیے خدا کی طرف سے عذاب آیا جس کی حیثیت بادِ صرصر کی تھی (حٰم السجدہ) یہ بادِ صرصر ایک بادل کی صورت میں آئی جس کا رُخ ناگاہ عاد کی وادیوں کی طرف تھا۔ وہ لوگ سمجھے کہ یہ ابر ہے جو برسے گا تو ان کی وادیاں سیراب ہو جائیں گی لیکن یہ دردناک عذاب تھا۔ جس جس جگہ سے گزرا اسے نیست و نابود کر گیا (احقاف) اس کا سلسلہ سات رات اور آٹھ دن برابر جاری رہا (سورہ الحاقہ) یہ ایسی ہوا تھی کہ جس شے پر اس کا گزر ہو جاتا اور اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر چھوڑتی (الذّٰریٰت) جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عذاب نازل ہونے سے

تر حضرت ہودؑ عاد کی آبادیوں سے نکل گئے تھے۔ سیّد سلیمان مرحوم کا بیان ہے کہ روایات عرب کے مطابق وہ حجاز
ی گئے تھے دوسرا زیادہ قرین قیاس بیان یہ ہے کہ وہ اس پہاڑی علاقے میں آ گئے تھے جو عاد کی مرکزی آبادیوں کے
ئرے سے باہر تھا اور حضرموت کی سطح مرتفع کے شمالی حصے میں تھا۔ وہیں ایمان لانے والے لوگوں کے ساتھ
رگی گزار کر عالم بقا میں پہنچ گئے۔ بشرطیکہ ہم سمجھ لیں "نبی ہود" وہی مقام ہے جہاں حضرت ہودؑ نے بعد کی زندگی گزاری۔

اد اولیٰ اور عاد ثانیہ سورۂ نجم میں ہے:

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَ نِ الْاُوْلٰىۙ (النجم: ۵۰) خدا وہی ہے جس نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا۔

عاد اولیٰ یہی لوگ تھے جنھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت حق قبول نہ کی اور عذاب سے ہلاک ہوئے۔
ثانیہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت قبول کی اور عذاب سے پیشتر احقاف کو چھوڑ کر محفوظ
م پر چلے گئے۔

ایک مقام تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی "نبی ہودؑ" جو حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ سید سلیمان
م نے روایات عرب کی بنا پر ایک مقام ہجرت حجاز بھی بتایا ہے جہاں ان کی ایک حکومت قایم ہو گئی اس میں ایک
ور بادشاہ لقمان نام بھی گزرا ہے۔

حیفۂ لقمان سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۸۳۴ء میں عاد کا ایک کتبہ ملا تھا جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ہم پر وہ
بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کینہ خیالات سے بہت دور تھے اور شریروں کو سزائیں دیتے تھے
ہودؑ کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ کیا کتاب میں لکھے ہوئے اچھے فیصلوں کو ہم "صحیفۂ لقمان" یعنی انھیں اچھے فیصلوں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے
د علیہ السلام کی شریعت کے ایک متبع بادشاہ لقمان نے لکھوا دیے تھے؟

غرض عاد ثانیہ پر مفصل بحث دیکھنی منظور ہو تو "ارض القرآن" جلد اول ملاحظہ فرمائیے۔ (ص ۱۸۳-۱۸۷)

باب ۶

حضرت ہودؑ علیہ السلام

قوم ہودؑ کا مقام قوم نوحؑ کے بعد عرب میں قوم عاد کو عروج ہوا۔ اِن کی آبادیاں عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک پھیل گئی تھیں۔ حضرت ہودؑ کا ظہور انھی میں ہوا تھا۔

اندھی تقلید آبا قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آبا و اجداد کی اندھی تقلید اور گڑھی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گڑھ لیا جاتا ہے۔ پھر ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ پھر جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی دلیل بھی اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اسماءٌ سمیتموھا انتم و اٰباؤکم" سے جابجا تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں اور لفظوں کے سوا وُہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔ افسوس، مسلمانوں میں بھی بہت سے ایسے "اسماء" پیدا ہو گئے ہیں جنھیں وُہ حجت و دلیل سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ خدا نے ان کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری۔

حضرت ہودؑ کی تعلیم (ا) حضرت ہودؑ نے کہا اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمھارے عقائد و اعمال حقیقت کے خلاف محض افترا ہیں۔

میں کسی معاوضہ کا طالب نہیں۔ یہ محض ادائے فرض کا تقاضا ہے جو مجھے دعوت الی الحق پر مجبور کر رہا ہے۔

قوم کی بدبختی (ب) لیکن ان کی قوم نے ان مواعظ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: تمھارے پاس کوئی ایسی بات نہیں جو ہمارے نزدیک دلیل ہو۔ ہم تو اپنے معبودوں کی پرستش چھوڑنے والے نہیں۔ ہمارے خیال میں جو بات آتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار تمھیں لگ گئی ہے۔ اسی لیے ایسے خیالات آنے لگے ہیں۔

فرض تبلیغ ادا کر دیا (ج) حضرت ہودؑ نے کہا: تم کہتے ہو، تمھارے معبودوں کی مجھ پر مار ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تمھارے معبودوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اب تم اور تمھارے معبود جو کچھ میرے خلاف کر سکتے ہیں، کر دیکھیں۔ تمھارا بھروسا ان معبودوں پر ہے۔ میرا اللہ پر ہے جو میرا اور تمھارا سب کا پروردگار ہے! میرا کام تبلیغ حق تھا، میں نے کر دیا۔ اب اگر سچائی کی طرف سے تم نے رُخ پھیر ہی لیا تو جان رکھو کہ قانونِ الٰہی کے مطابق تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو مل جائے گی اور تم ہلاکت سے دوچار ہو گے۔

(د) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مومنوں نے نجات پائی۔ سرکش ہلاک ہوئے۔

گمراہی کی حقیقی حیثیت

آیت ۵۶ (ہود) میں "ربی و ربکم" کا زور جس بات پر ہے اسے سمجھ لینا چاہیے۔ ان تمام مشرک قوموں کو اس بات سے انکار نہ تھا کہ ایک خالق و پروردگار ہستی موجود ہے اور اصلی طاقت اسی کی طاقت ہے یعنی وہ توحید ربوبیت سے بے خبر نہ تھے لیکن ساری گمراہی یہ تھی کہ توحید الوہیت میں کھوئے گئے تھے۔ یعنی سمجھتے تھے، اس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں بھی ہیں جنھیں تصرف کا اختیار مل گیا ہے اور اسی لیے ہمیں ان کی پوجا کرنی چاہیے۔ پس ربی و ربکم کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھروسا تو اسی پر ہے، جسے میں بھی رب یقین کرتا ہوں اور تم بھی رب مانتے ہو۔

قوم عاد کے حکمران

آیت ۵۹ (سورۂ ہود) سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد پر ظالم و سرکش پادشاہ حکمران تھے اور فراعنۂ مصر کی طرح اپنے آپ کو پجواتے تھے۔ فرمایا: انھوں نے خدا کے رسولوں سے نافرمانی کی اور سرکش وظالم حکمرانوں کا کہا مانا۔ یعنی جو حق وعدالت کی طرف بلاتے تھے، ان سے تو منکر ہوئے اور جو ظلم وسرکشی کرتے تھے، ان کے پیچھے چلے! ایسے گروہ کے لیے بجز ہلاکت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

عاد کی برگشتہ بختی

سورۃ احقاف میں بھی عاد کا ذکر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنے ہم قوموں یعنی عاد کو خبردار کیا تھا اور کہا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، تمھارے حق میں ایک بڑے ہی خوفناک عذاب کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہوؔ کیا تو ہمیں اپنے دیوتاؤں سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے؟ جو کچھ لانا چاہتا ہے، لے آ۔ جب انھوں نے عذاب اپنی طرف آتے دیکھا تو بولے یہ بادل ہے جو ہمیں سیراب کر دے گا۔ حقیقت میں یہ ہوا کا ایک طوفان تھا جو دردناک عذاب لا رہا تھا، چنانچہ خدا کے حکم سے سب کچھ برباد ہو گیا۔ البتہ ان کے قیام کی جگہ باقی رہ گئی (سورۂ احقاف: ۲۲-۲۷)

احقاف

احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ ریت کے ٹیلے تو عرب کے بڑے حصے میں ملتے ہیں لیکن احقاف ایک خاص مقام ہے جسے عرب کے ہر نقشے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حضرموت کے شمال میں اور یمن کے مشرق میں ہے، اسے ربع الخالی کا مغربی حصہ سمجھنا چاہیے لیکن عاد کی آبادی وہاں تک محدود نہ تھی۔ حضرموت سے ساحل کے ساتھ ساتھ عراق تک چلی گئی تھی۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب عاد احقاف میں آباد تھے تو زمین کی کیا کیفیت تھی۔ تاہم یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے

---

[1] آیت یہ ہے: انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم۔ [2] "رسلہ" اس لیے کہا کہ گو انھوں نے انکار ایک رسول کا کیا تھا لیکن اس کی تعلیم تمام رسولوں ہی کی تعلیم تھی۔ پس ایک کو جھٹلانا سب کو جھٹلانا ہوا۔

کہ یہ اس طرح بے آب و گیاہ نہ ہوگی جس طرح آج ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ مختلف وادیوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر وادی سرسبز تھی۔

نبی ہودؑ

حضرموت کے شمالی حصے میں پہاڑوں کے درمیان ایک مقام نبی ہودؑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بندرگاہ مکلا سے کوئی سوا سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اس مقام پر حضرت ہودؑ کی قبر بتائی جاتی ہے جہاں ہر سال ۱۵۔ شعبان کو عرس ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان نے بھی ارض القرآن میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ لوگ وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ (ارض القرآن جلد اول ص ۱۱۷)

خود مولانا سید سلیمان ہی نے لکھا ہے کہ روایات عرب کے مطابق حضرت ہودؑ اپنے وطن سے نکل کر حجاز چلے گئے تھے۔ (ارض القرآن ص ۱۷۹) لیکن ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ غالباً وُہ اسی مقام پر رہ گئے تھے۔ ویسے بھی اصل آبادی کو چھوڑ کر کسی قریب تر مقام پر بیٹھ جانا زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ وُہ دُور جا بسے ہوں۔ البتہ یہ دیکھنا ضروری تھا کہ وہ عذاب کے دائرے سے محفوظ ہوتا۔

۱۵۔ شعبان کو وہاں حضرت ہودؑ کا عرس ہوتا ہے۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت ہودؑ کی وفات ۱۵۔ شعبان کو ہوئی ہوگی۔

احقاف کی موجودہ حالت

تفہیم القرآن میں انگرامس کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۴۳ء میں باوریا (جسے ہمارے ہاں بویریا کہتے ہیں) کا ایک فوجی افسر احقاف تک پہنچا تھا۔ اس نے بتایا کہ حضرموت کی سطح مرتفع سے یہ مقام ایک ہزار فٹ نشیب میں واقع ہے اور اس میں جگہ جگہ سفید قطعات ہیں جن کی ریت میں کوئی چیز گر جائے تو اسی طرح غرق ہو جاتی ہے جس طرح آبی دلدلوں میں جاندار یا بے جان غرق ہو جاتے ہیں۔ اس فوجی افسر کے پاس ایک شاقول تھا جو معماروں کا ایک عام آلہ ہے وہ اس سے تعمیر کردہ حصے کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ اس میں کجی تو نہیں رہ گئی۔ افسر نے وہی شاقول ایک رسی میں باندھ کر ریت پر پھینکا۔ وُہ ریت میں غرق ہو گیا اور رسی کا وُہ حصہ گل گیا جو شاقول سے بندھا ہُوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اس ریگزار کی طرف جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بظاہر ریت میں یہ خصوصیت عاد کی ہلاکت کے بعد پیدا ہُوئی۔

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام سام بن نوحؑ کے پانچویں بیٹے ارم کی اولاد میں سے تھے۔ تورات آپ کے ذکر سے [خا]لی ہے۔ غالباً اس لیے کہ تورات میں صرف ان انبیائے کرام کا ذکر آیا ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں فلسطین و [شا]م سے تھا اور ان کا ذکر نہیں آیا جو اس دائرے سے باہر تھے۔

حضرت صالحؑ قوم ثمود کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے جو شمالی و غربی عرب میں اس مقام پر آباد تھی، جسے [بعد] میں "وادی القریٰ" کہنے لگے یا ممکن ہے پہلے ہی سے یہ نام چلا آتا ہو۔ نام کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس [واد]ی میں جابجا چھوٹی چھوٹی بستیاں یا آبادیاں موجود تھیں۔

سورۂ فجر میں ہے:

وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ۔ — اور ثمود جو وادی میں پتھر تراشتے تھے۔

(فجر: ۱۰)

پتھر تراشنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ مکانوں کی تعمیر کے لیے پتھر چٹانوں سے کاٹ کاٹ کر خوب گھڑتے اور صاف [کر]تے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ چٹانوں ہی کو اندر سے تراش تراش کر نہایت عمدہ، خوب صورت اور عالی شان [مکا]ن بنا لیتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔

[ثم]ود کا مرکز | قوم ثمود کا مرکز "حجر" تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ○ (الحجر: ۸۰-۸۳)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔ ہم نے اپنی نشانیاں انہیں دکھائیں مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش کے گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا تھا۔

حجر اس شاہراہ پر واقع تھا، جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے۔ رسول اللہ صلعم سفر تبوک میں اس مقام سے [گ]زرے تھے۔ آجکل یہ مقام "مدائن صالح" کے نام سے معروف ہے اور حجاز ریلوے کا ایک اہم سٹیشن ہے۔

قوم ثمود

قوم ثمود کے متعلق اب تک صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں اس نے درجہ کمال حاصل کر لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یہ لوگ چٹانیں کاٹ کر بھی مکان بناتے، پتھروں سے عالی شان مقبرے اور عمارتیں بھی تیار کرتے تھے۔ قوم عاد کے بعد ثمود نے ممتاز درجہ حاصل کیا اور اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو عموماً ان گروہوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، جنھیں طاقت و قوت، کمال ہنرمندی اور دولت و ثروت پر ناز ہو اور نزدیک و دُور کوئی گروہ مقابلے کی جرأت و ہمت نہ رکھتا ہو۔

قطعاً شبہ نہیں کہ قوم ثمود بت پرست اور مشرک تھی۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ حضرت صالحؑ کی دعوت یہ تھی کہ خدا کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ (اعراف: ۷۳)

۲۔ صالحؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا کہ تمھارے ساتھ تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پوجا سے روکتا ہے جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں۔ (ہود: ۶۲)

۳۔ انھوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ (الذّٰریٰت: ۴۴)

۴۔ انھوں نے ہدایت کی روشنی قبول کرنے پر اندھا رہنے کو پسند کیا۔ (حٰم السجدہ: ۱۸)

اُونٹنی کا معجزہ

ثمود نے کسی معجزے کا مطالبہ کیا۔ اس پر ایک چٹان کے پھٹنے سے ناقہ مع بچہ ظاہر ہوئی۔ پھر حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ ایک دن اس اونٹنی کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک روز تمھاری باری ہو گی۔ اونٹنی کو کوئی تکلیف دی تو سخت عذاب تمھیں آ پکڑے گا۔

باریاں مقرر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں پانی کی قلت تھی اور باریاں مقرر کیے بغیر تمام لوگوں کے لیے پانی سے استفادے کا حق محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

سیّد سلیمان مرحوم فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی آیتوں کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم جانوروں پر ظلم کرتی تھی۔ خدا نے ایک اونٹنی کو نشانی بنایا کہ جس دن تم نے اس کو ستایا، وہی عذاب کا دن ہو گا۔ ثمود کی ایک پہاڑی کا نام عربوں میں "فج الناقہ" مشہور ہے۔ بطلیموس نے اس مقام کا نام یونانی میں بنڈانا ٹا" لکھا ہے۔ اس تسمیہ سے نفس اونٹنی کے واقعہ کا ثبوت قرآن سے چار سو برس پیشتر ملتا ہے۔ (ارض القرآن جلد اول ص ۱۹۷)

تباہی خیز عذاب

قوم ثمود کے سرکش اپنی ہٹ پر قایم رہے۔ ان کے بڑے سردار نو تھے۔ انھوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس پر خدا کی طرف سے وہ خوفناک عذاب آیا، جو تمام سرکشوں کو برباد کر گیا۔ صرف حضرت صالح علیہ السلام کے مومنین محفوظ رہے۔ جنھیں "ثمود ثانیہ" کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

۱۔ ہم نے صالح کو اور جو لوگ ان پر ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ (ہود: ۶۹)

۲- اور ہم نے انھیں نجات دے دی جو ایمان لائے اور تقویٰ پر کاربند تھے۔ (النمل : ۵۳)

(مولف)

[ت]ورات کی خاموشی مولانا سید سلیمان مرحوم نے ثمود کے متعلق تورات کی خاموشی کا سبب یہ بتایا ہے کہ تورات کی تاریخ ابتداے عالم سے حضرت یعقوبؑ تک بنی ابراہیمؑ کی تاریخ ہے۔ اس کے [بعد م]صر سے بنی اسرائیل کی ہجرت تک قریبًا ساڑھے چار سو سال کا زمانہ ہے۔ اس کے متعلق تورات بالکل خاموش ہے [اور] از روے تاریخ ثمود کے عروج و زوال کا یہی زمانہ ہے۔

پھر تورات میں صرف ان غیر اقوام کا ذکر ہے جن سے بنی اسرائیل کو کسی نہ کسی صورت میں سابقہ پڑا یا ان سے سیاسی [تعل]قات تھے:

یہ رتبہ ثمود کی جگہ اب مدین کو حاصل تھا جو ثمود اولیٰ کے جانشین تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰۹ ق م یا ۸۰۰ ق م میں اہل مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیتہً برباد ہو گئے تو ثمود ثانیہ نے پھر سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور نے شمالی عرب پر حملہ کر کے ثمود سے ۷۱۰ ق۔م میں خراج وصول کیا۔ اس کے بعد ظہور مسیحؑ سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہو گئے اور اسی خصوصیت سے تاریخ روم میں ثمود کا ذکر آیا۔ (ارض القرآن جلد اول ص ۱۹۹)

۵

* "ثمود دشمنوں کے ساتھ ہو گئے" کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ انھوں نے رومیوں کا ساتھ دیا، جو عرب پر فوج کشی کا [ارا]دہ کیے بیٹھے تھے یہ انباط یعنی نبطی عرب ہی تھے۔

[ح]ضرت صالحؑ کی تعلیم قوم ثمود میں حضرت صالح علیہ السلام کا ظہور ہوا۔

(ا) انھوں نے کہا: اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو! کون ہے جس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا یعنی ایسی چیز سے پیدا کیا جو زمین کی مٹی کا خمیر تھی (جیسا کہ دوسری [ج]گہ صراحت کی ہے) پھر تم سے اس کی آبادی و رونق کر دی؟ کیا پروردگار عالم کے سوا کوئی ہو سکتا ہے؟ پھر کیا وہی [ا]س کا مستحق نہیں کہ اس کی بندگی کی جائے؟

سرکشی سے باز آجاؤ اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

قوم کا جواب (ب) قوم نے کہا: ہمیں تو تمھاری ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں کہ ہماری سرداری اور پیشوائی کرو گے۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ ہمارے بزرگوں کے طریقے کو بُرا کہتے ہو اور اس سے ہمیں ہٹانا چاہتے ہو؟

ہمیشہ یہ بات دیکھی گئی ہے اور اب بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ جب کبھی ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی قوم میں پیدا ہوتا ہے تو لوگ اُس کی قابلیت سراہتے ہیں اور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرتے ہیں کہ یہ ہمارا پیشوا ہوگا باپ دادے کا نام روشن کرے گا۔ لیکن جب وُہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جو ان کے طور طریقے کے خلاف ہوتی ہے تو گردن موڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو نکما نکلا۔ ہماری ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔ گویا بزرگی و پیشوائی کا طریقہ یہ نہیں کہ جو بات حق معلوم ہو، اُس کی لوگوں کو دعوت دی جائے۔ یہ ہے کہ لوگ جسے حق سمجھتے ہوں، اس کی پیروی کی جائے اور اسی کی طرف لوگوں کو بھی دعوت دی جائے!

علم و بصیرت کی راہ

قرآن نے یہاں قوم ثمود کا جو جواب نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے۔

حضرت صالحؑ نے کہا: تم غور نہیں کرتے کہ اگر ایک شخص پر اللہ نے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہو اور وُہ دیکھ رہا ہو کہ سچائی وُہ نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہے تو پھر کیا محض لوگوں کے پاس خاطر سے اس کا اظہار نہ کرے؛ اچھا، بتلاؤ، اگر وہ حکم حق سے سرتابی کرے، تو کوئی ہے جو خدا کے مواخذہ سے اُسے بچا لے گا؛ اگر میں محض اس خیال سے کہ تمھاری امیدوں کو ٹھیس نہ لگے، سچائی کا اعلان نہ کروں، تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دوں۔

سرکش ہلاک ہوگئے

(د) بہرحال انھوں نے سرکشی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مومنوں نے نجات پائی۔ سرکش ہلاک ہُوئے۔

حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی سرگزشتوں میں اختصار ملحوظ رہا کیونکہ ان دونوں کا ظہور عرب ہی میں ہوا تھا اور مخاطبین ان سے ناآشنا نہ تھے۔

اونٹنی کا معاملہ

پالتو جانوروں کو خدا کے نام پر چھوڑ دینے کا طریقہ بہت قدیمی ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے خدا کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباع حق کی آزمایش ہوگئی۔ اگر وُہ اونٹنی کو ضرر نہ پہنچاتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ اُن کے دل ہدایت کے آگے جھک گئے ہیں مگر اُن کے اندر خدا پرستی کے خلاف ایسی ضد اور شرارت پیدا ہوگئی تھی کہ اتنی سی بات بھی نہ مان سکے اور اونٹنی کو زخمی کر کے ہلاک کر ڈالا۔

حضرت ابراہیمؑ

۸ ب

اسوۂ ابراہیمؑ اور حقیقت اسلامی

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔ (والصّٰفّٰت ۱۰۳-۱۰۸)[۱]

—(۱)—

ٹھیک اب سے پانچ ہزار دو سو تینتالیس برس پیشتر[۲] دنیا کے ایک گوشے میں کیسا عجیب و غریب انقلاب ہو رہا تھا!
...ہولناک اور وحشت انگیز بیابان ریگ زار تھا، جس کی مہلک ریگ اور خشک سرزمین میں ہر طرف موت و ہلاکت پھیلی
...ئی تھی۔ ایک یکسر "وادی غیر ذی زرع"[۳] تھی، جس کی سطح بے نمو پر زندگی کی سبزی و شگفتگی کا نام و نشان یک نہ تھا،
...ن رب السموات والارض کے دو مختلف بندے تھے، جنھوں نے انسانی زندگی کے لیے اسی صحرائے ہلاکت کو آبادی
...کے لیے اسی بیابانِ وحشت کو، فلاحت و زراعت کے لیے اسی سرزمین خشک سالی کو اور خدائے واحد کی پرستش و
...دت کے لیے اسی صحرائی قربان گاہ کو منتخب کیا تھا۔ ان کے چاروں طرف صحرائے وحشت تھا، مگر ان کے اوپر
...خدائے حکیم و قدیر تھا، جو آبادیوں کا بخشنے والا اور زمینوں کی وراثت تقسیم کرنے والا ہے۔

...تعمیر حرم اور دعا ان کے ہاتھ میں پتھروں کے ٹکڑے تھے، جن کو ایک دیوار کی صورت میں جمع کرتے جاتے تھے

---

[۱] پھر جب ابراہیم اور اسماعیل، دونوں اللہ کے آگے جھک گئے اور ابراہیم نے اسماعیل کو ذبح کرنے کے لیے ماتھے کے بل ...ا دیا، تو ہم نے پکارا کہ اے ابراہیم! بس کرو تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیک بندوں کو ان کے ایثار نفس اور ...یت نفس و جان کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ ایک نہایت کھلی ہوئی یعنی ظاہری آزمایش تھی اور ذبح اسماعیل کے فدیے ...ں ہم نے ایک بھت بڑی قربانی (یعنی سنت ابراہیمی کی یادگار میں تاقیامت جاری رہنے والی قربانی) دے دی اور تمام آنے والی ...قوتوں میں اس واقعہ عظیمہ کے ذکر کو قائم کر دیا۔ پس سلام ہو راہ الٰہی میں اپنی قربانی کرنے والے ابراہیم خلیل پر!!

[۲] یہ مقالہ ۳۰۔ نومبر ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں شائع ہوا تھا اور مدت کا حساب اسی وقت سے کیا گیا ہے۔

[۳] یعنی ایسی سرزمین جہاں زراعت و فلاحت کا نام و نشان نہیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا کہ "ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم" یعنی الٰہی! میں نے اس بیابان کہ میں اپنی اولاد لاکر بسائی ہے جہاں زراعت کا نام و نشان نہیں، پس "وادی غیر ذی زرع" اسی آیت سے ماخوذ اور اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اور زبان پر یہ دُعائیں تھیں، جو ادھر زبان سے نکل رہی تھیں اور ادھر قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا تھا:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(سورۂ بقرہ، ۱۲۷ - ۱۲۹)

الٰہی! یہ ہمارے ہاتھ تیری پرستش اور تیرے جلال و قدوسیت کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں اسے قبول کر لے۔ بے شک تو ہی دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا دیکھنے والا ہے! الٰہی ہم کو اپنا مسلم اور اطاعت شعار بنا، اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی ہی امت پیدا کر، جو ہماری طرح مسلم و مومن ہو۔ الٰہی! ہم کو اپنی عبادت و بندگی کے مقبول طریقے سمجھا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کرنے والا اور تو ہی اپنے عاجز بندوں پر مہربان ہے! الٰہی! ہماری اس دعا کو بھی ان گھڑیوں میں قبول کر لے کہ جو قوم ہماری نسل سے پیدا ہو، ان میں اپنا ایک ایسا برگزیدہ رسول بھیجیو جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، علم و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس و قلوب کی اصلاح کرے، الٰہی! ان تمام باتوں کا تجھی کو اختیار ہے اور تیری ہی تدبیر اصل تدبیر اور تیری ہی حکمت اصلی حکمت ہے!

اللہ اکبر! وہ کیسا وقت تھا، جب کہ صدیوں اور ہزاروں برسوں کا فیصلہ چند لمحوں اور منٹوں کے اندر ہو گیا!! اللہ اکبر! اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر! اللہ اکبر و للہ الحمد!!

ابراہیمؑ و اسماعیلؑ یہ دُعائیں ان کی زبانوں سے نکل رہی تھیں، جن میں سے ایک راہ الٰہی میں اپنے جذبات اور ارادے کی قربانی کر چکا تھا اور دوسرا اپنے جان و نفس کی۔ دونوں نے اپنی محبوب ترین متاعوں کو راہ الٰہی میں لٹا دیا تھا۔ ایک نے اپنے فرزند عزیز کو اور دوسرے نے اپنی جان عزیز کو۔ دونوں مجاہد فی سبیل اللہ تھے اور اس لیے دونوں "مسلم" تھے۔ خدا نے ان دونوں کی دعاؤں کو قبول کر لیا اور اس طرح قبول کیا کہ دنیا کے پانچ ہزار برس کے حوادث و انقلابات بھی ان کی قبولیت کی صداقت کو دھبّا نہ لگا سکے۔ وہ چند پتھروں سے چُنی ہوئی چار دیواری، جس کے چاروں طرف انسانی ہستی کی کوئی علامت نہ تھی، کروڑوں انسانوں کی پرستش گاہ اور قبلۂ وجوہ بنی۔ خدا کے جلال اور قدوسیت نے تمام عالم میں صرف اسی کی چھت کو اپنا نشیمن بنایا۔ داؤد اور سلیمان کا وہ عظیم الشان ہیکل جس کو ہزاروں انسانوں کی سالہا سال کی محنت و مشقت نے لمبے لمبے ستونوں اور گنبدوں کا ایک شہر بنا دیا تھا، چند صدیوں تک بھی زندہ نہ رہ سکا اور وحشی حملہ آوروں نے بارہا اس کی عظیم الہیئۃ دیواروں کو غبار بنا کر اوڑا دیا، لیکن چند پتھروں سے چُنی ہوئی

اس چار دیواری کے گرد، دعاے ابراہیمی نے ایک ایسا آہنی حصار کھینچ دیا تھا کہ پانچ ہزار برس کے اندر انقلابات ارضیہ وسماویہ نے سمندروں کو جنگل اور انسانی آبادیوں کو سمندروں کے طوفانوں کی صورت میں بدل دیا، لیکن آج تک اس کی بنیادوں کو کوئی حادثہ اور کوئی مادی قوت صدمہ پہنچا سکی، یہاں تک کہ تاریخ عالم میں وہی ایک سرزمین ہے، جس کی نسبت تاریخ دعوٰی کر سکتی ہے کہ اس کی مقدس اور محترم خاک آج تک غیر قوتوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے محفوظ و مصون ہے:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ ○

(عنکبوت: ۶۷)

کیا ہماری اس قدرت کی نشانی کو لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم مکہ کو (جو ایک غیر معروف و بے رونق خطہ تھا) امن اور حفاظت کا گھر بنا دیا اور ایک عالم نے اس کے اردگرد ہجوم کیا۔ پھر کیا لوگ باطل پر ایمان لاتے اور اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں؟

مٹانے والے مٹا دیے گئے

اور اگر کسی قوم نے اس کی عزت واحترام کو مٹانا چاہا تو خدائے قدوس کے دست کبریائی نے خود اس قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا:

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ○ اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ○ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ○ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○ (الفیل)

اے پیغمبر کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے اس لشکر کے ساتھ کیا سلوک کیا، جو ہاتھیوں کا ایک غول لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا تھا؟ کیا خدا نے ان کے تمام داؤ غلط نہیں کر دیے؟ اور ان پر عذاب کی نحوستوں کے غول نازل نہیں کیے؟ جنھوں نے ان کو سخت بربادی میں مبتلا کر دیا جو ان کے لیے لکھ دی گئی تھی۔ یہاں تک کہ پامال شدہ کھیت کی طرح تباہ ہو گئے۔

یہ اس دعا کے پہلے ٹکڑے کی قبولیت تھی۔ باقی دو التجاؤں کو جس طرح خدا تعالیٰ نے قبولیت بخشی اس کی صداقت بھی اس بیت خلیل کی صداقت سے کم نہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○

(آل عمران: ۱۶۴)

بیشک اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا کہ (دعاے ابراہیمی کو قبول فرما کر) انھی میں سے ان کی طرف اپنا رسول بھیجا جو ان کو احکام الٰہی پڑھ کر سناتا ہے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو علم و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ سخت جہل و گمراہی میں مبتلا تھے۔

اللہ اکبر! اللہ اکبر! لا الہ الا اللہ واللہ اکبر! اللہ اکبر وللہ الحمد!!

صرف دو نمونے قرآن کریم میں ایک بہت بڑا حصہ انبیاے سابقین کے قصص و اعمال کا ہے۔ اس کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ایک خاص تعلیم پیش کرتا ہے۔ پھر اس تعلیم کی صداقت کے لیے امم گزشتہ اور اعمال انبیاے سابقہ کے حالات و واقعات سے ایک خطابی استدلال کرتا ہے، تاکہ امت مرحومہ کے سامنے تعلیم اور اس کے عملی نمونے اور نتائج، دونوں موجود ہو جائیں۔

لیکن تمام قرآن میں اگر مسلمانوں کے سامنے کوئی کامل زندگی اور کسی زندگی کے از سرتاپا اعمال، بطور نمونے کے پیش کیے گئے ہیں اور ان کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے تو وہ صرف دو نمونے ہیں۔ خود شریعت اسلامیہ کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نسبت (سورۂ احزاب) میں فرمایا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا۔ (احزاب: ۲۱)

بیشک رسول اللہ کی زندگی میں تمھارے لیے (اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتے ہو اور کثرت کے ساتھ اس کا ذکر کرنے والے ہو) پیروی و اتباع کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے۔

پھر سورۂ ممتحنہ میں ملت حنیفی کے داعی اول حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا و علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ۔ (ممتحنہ: ۴)

بیشک تمھارے لیے ایک بہترین نمونۂ عمل حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے اعمال زندگی میں ہے۔

پھر اسی رکوع میں حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی تعلیم کی تشریح کر کے مکرر کہا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ (ممتحنہ: ۶)

بے شک تمھارے لیے کہ اللہ اور یوم آخرت سے ڈرتے ہو، ان لوگوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونۂ عمل ہے اور جو شخص اس کی طرف سے منہ موڑ لے، تو اللہ تو انسانوں کے اعمال کا کچھ محتاج نہیں۔

غور طلب نکتے میں نے ہمیشہ اس امر پر غور کیا ہے کہ:

۱۔ تمام قرآن کریم میں بیسیوں انبیاے سابقین کے حالات و اعمال بیان کیے گئے ہیں، لیکن کسی کی تمام تر زندگی کو بطور ایک نمونے کے مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا، اِلّا حضرت ابراہیم کے۔

۲۔ تمام قرآن میں "اسوۂ حسنہ" کا لفظ صرف تین مقامات پر آیا ہے، اول سورۂ احزاب میں آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی نسبت، پھر سورۂ ممتحنہ میں دو مرتبہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت۔ اس کی علت کیا ہے؟

۳۔ سورۂ احزاب اور سورۂ ممتحنہ، دونوں سورتیں زیادہ تر احکام جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور بعض مقاتلات کے نتائج وورودِ ابتلاء و آزمایش وعجائباتِ نصرتِ الٰہیہ کے بیان سے مملو ہیں۔ پھر یہ دونوں آیتیں جن رکوعوں میں آئی ہیں، وہ بھی تمام تر ذکر جہاد پر مبنی ہیں، ضرور ہے کہ اس میں بھی کوئی علت ہو۔

۴۔ دونوں مقامات میں پوری مماثلت، حتّٰی کہ اشتراک جزئیات بیان بھی موجود ہے، سورۂ احزاب میں اس آیت کا وہ موقع ہے جہاں جنگ احزاب یا جنگ خندق کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور زیادہ تر اُن منافقین اور ضعیف القلب اشخاص کا حال بیان کیا ہے جو اپنی تین ہزار کی جمعیت کے مقابلے میں حملہ آوروں کی بارہ ہزار مسلح اور متحدہ قوت دیکھ کر گھبرا اٹھے تھے۔ پھر اس نصرت الٰہی کا حوالہ دیا ہے، جس نے محصورین کو کامیاب کیا اور تمام حملہ آور ناکام و خاسر واپس گئے: هنالك ابتلي المسلمون و زلزلوا زلزالاً شديداً[۱]

بعینہٖ یہی حال سورۂ ممتحنہ کے پہلے رکوع کا ہے۔ فتح مکہ سے پیشتر جب آنحضرتؐ نے چڑھائی کا ارادہ کیا تو حاطب بن ابی بلتعہ نامی ایک صحابی تھے، جن کے اہل وعیال مکہ میں موجود تھے۔ انھوں نے پوشیدہ طور پر ان کو اطلاع دے دی کہ اپنے تحفظ کا انتظام کر رکھیں۔ وحی الٰہی سے یہ حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف ہو گیا اور آدمی دوڑا کر وہ خط راہ سے واپس منگوا لیا۔ اس پر یہ سورہ نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ۔ (ممتحنہ: ۱)

مسلمانو! اُن کافروں اور دشمنانِ توحید کو اپنا دوست نہ بناؤ جو ہمارے اور تمھارے، دونوں کے دشمن ہیں (یہ کیسی بات ہے کہ) تم ان سے نامہ و پیام جاری رکھتے ہو؟ حالانکہ تمھارے پاس جو حق و صداقت اللہ کی طرف سے آئی، وہ اس سے انکار کر چکے ہیں؛

حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے "اسوۂ حسنہ" پر اسی رکوع میں توجہ دلائی گئی ہے۔ پھر آیات متعلق حرب و قتال و تشویق جہاد فی سبیل اللہ ہی میں اس "اسوۂ حسنہ" پر توجہ دلانے کی کیا ضرورت تھی؟

اسوۂ حسنہ

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم اسلام کی جس حقیقت کو دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا، اس کے لحاظ سے اگر کوئی زندگی "اسوۂ حسنہ" ہو سکتی تھی تو وہ صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کی زندگی تھی۔ اسلام ایک صداقت ہے اور اس لیے دنیا میں اس وقت سے موجود ہے، جس وقت سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صداقت ہے،

---

[۱] یہ سورۂ احزاب کی آیت ۱۱ ہے، ترجمہ یہ ہے: وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت عذاب میں ڈالے گئے۔

لیکن اس صداقت مبین کو ایک شریعت الٰہیہ کی صورت میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم ہی نے پیش کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہرجگہ ان کو ملت حنیفی کے اوّلین واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (بقرہ: ۱۳۱)

جب حضرت ابراہیم سے ان کے پروردگار نے کہا کو مسلم یعنی سچے فرماں بردار بن جاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں اسلام لایا تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے۔

ابراہیمی اعمال کی زندگی

چونکہ حضرت ابراہیمؑ اسلام (یعنی برمحرر شریعت) کے پہلے داعی تھے، اس لیے ان کا وجود یکسر پیکر اسلام تھا اور اپنے ہرعمل حیات کے اندر اسلام کی حقیقت کا ایک عملی نمونہ رکھتا تھا۔ وہ اسلام کے واعظ تھے اور واعظ کے لیے اوّلیں شے تھی کہ تعلیم کے ساتھ خود اپنی زندگی کا عملی نمونہ بھی پیش کر دے اور جن حقیقتوں کی طرف دنیا کو دعوت دیتا ہے، ان کو سب سے پہلے اپنے اُوپر طاری کر دے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان حقائق کو اپنے اوپر طاری کیا، اس لیے ان کا ہرعمل از سرتا پا صدائے اسلام تھا اور وہی پیروانِ اسلام کے لیے عملی نمونہ یا "اسوۂ حسنہ" ہو سکتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیے اور ان کے ذکر کو بقائے دوام عطا فرمایا۔ دنیا کے بڑے بڑے کشورستانوں، عظیم الشان فاتحوں، خشکیوں اور سمندروں پر حکمرانی کرنے والی قوموں کو ہم آثار قدیمہ کے کھنڈروں، بوسیدہ قبروں، قومی روایتوں اور تاریخ کے کہنہ اوراق میں ضرور دیکھ سکتے ہیں، مگر تمام مجمع اوّلین و آخرین میں ایک انسانی ہستی بھی ایسی نہیں مل سکتی، جس کے اعمال حیات صفحوں اور مٹی کے ڈھیروں میں نہیں، بلکہ کروڑوں زندہ انسانوں کے اعمال کے اندر سے اپنی حیات کا ثبوت دے سکتے ہوں۔ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو دنیا کے سامنے "اسوۂ ابراہیمی" کی لازوال زندگی کا کیسا عجیب منظر ہوتا ہے، جب کہ تاریخ کئی ہزار برس آگے بڑھ کر لوٹتی ہے تاکہ اسلام کے واعظ اوّل کی زندگی کو ایک مرتبہ پھر دُہرا دے۔ لاکھوں انسانوں کا مجمع ہوتا ہے، جن میں سے ہر وجود پیکر ابراہیمؑ بن جاتا ہے اور "مقامِ خُلّت" کی سلطنت، تعین اور تشخص کو فنا کر کے اس پُورے مجمعے کو ایک "ابراہیم خلیل" کی صورت میں نمایاں کر دیتی ہے!

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۔ (مریم: ۴۹)

اور ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو اپنی رحمت میں سے بڑا حصہ دیا اور ان کے لیے ایک اعلیٰ و اشرف (طریق) ذکر خیر دنیا میں باقی رکھا۔

ذی حجہ کی نویں تاریخ

آج ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے، جب کہ یہ سطور قلم سے نکل رہے ہیںؑ۔ چشم تصوّر سے دیکھیے تو آپ کے سامنے بندگان مخلصین کا ایک شہر آباد ہے۔ لاکھوں انسان

ؑ یہ ۹- ذی حجہ ۱۳۳۰ھ (۱۹- نومبر ۱۹۱۲ء) کا نقشہ ہے۔

، ہی بیاس اور ایک ہی صدا کے ساتھ ایک ہی کے لیے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں ۔ بے شک " ابراہیم خلیل" کا وجود دنیا میں باقی نہیں رہا، لیکن کیا ان لاکھوں عاشقانِ الٰہی میں سے ہر عاشق، اُسی عاشق اوّل کے فیضانِ عشق سے مستفیض ہے؛ اگر ہے تو یقین کیجیے کہ " خلیل اللہ " آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا جب کہ میدانِ حج میں لاکھوں انسانوں کی زبانوں سے صدائے لبیک ! لبیک ! اللھم لبیک نکلتی ہے، تو اُس ایک ہی ابراہیم خلیل کی صدا ہوتی ہے، جس نے آج سے پانچ ہزار برس پیشتر اپنے دوست کی صدائے " یا عبدی " کے جواب میں عاشقانہ محویت کے ساتھ " لبیک " کا نعرہ لگایا تھا ۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر کب محدود تھا کہ فنا ہو جاتا، وہ تو اپنے اندر ایک پوری اُمت رکھتا تھا، اس لیے وہ آج بھی اپنی اُمت کی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا ۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (النحل : ۱۲۰)

بیشک ابراہیم (گویا) ایک پوری اطاعت شعار امت تھا، اور ایک ہی خدا کا ہو رہا تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ابراہیمؑ اور حقیقت اسلامی

یہی سبب ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ہر بات " اسلام " تھی ۔ حقیقت اسلامی میں ان کا وجود اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ خود اُن کی کوئی ہستی باقی نہیں رہی تھی۔ ستاروں کی عجیب و غریب روشنی ان کے سامنے آئی، چاند کی دلفریبی نے ان کو آزمانا چاہا اور سورج اپنی سطوت و [illegible]ت سے چمکا تا کہ ان کی فطرت کو مرعوب کر سکے تو " اسلام " ہی تھا، جس نے اندر سے صدا دی کہ " انی لا احب الافلین " [illegible] ناپذیر ہستیوں کو دوست نہیں رکھتا ۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ (انعام : ۷۹)

میں ہر طرف سے کٹ کر، صرف اسی ایک ذات کا ہو گیا ہوں، جس نے زمین اور آسمان پیدا کیے ۔ الحمد للہ کہ میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں ۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (انعام : ۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمان و زمین کے مناظر و عجائب دکھلائے، تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے ۔

دل سے بالا

انھوں نے جب آنکھ کھولی تو چاروں طرف بت پرستی کے مناظر تھے، انھوں نے خود اپنے گھر کے اندر جس کسی کو دیکھا، اس کے ہاتھ میں سنگ تراشی کے اوزار اور بتوں کے ڈھانچے تھے، دنیا کے بازاروں میں پھرے، مگر جس طرف دیکھا، بتوں کے آگے جھکے ہوئے سر تھے اور جس طرف کان لگایا، خدا فروشی کی صدائیں آ رہی تھیں ۔ پھر وہ کون سی چیز تھی، جس نے تمام ان چیزوں سے ہٹا کر جو آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی جاتی ہیں، ان کے دل میں ایک ان دیکھے محبوب کے عشق کی لگن لگا دی اور ایک اَن سنے نغمے کی تلاش میں ان کے [illegible] کو آوارہ کر دیا؟ ان کے سامنے تو بتوں کی قطاریں تھیں، جن کو ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں، پھر وہ کون تھا، جو ان کے

اندر بیٹھا ہوا خدائے قدوس کو دیکھ رہا تھا اور اس قدرتی جوش و قوت کے ساتھ جو کسی بلندی سے گرنے والے آبشار کسی زمین سے ابلتے ہوئے چشمے میں ہوتا ہے، ان کی زبان سے فاطر السموات والارض کی یہ شہادت دے رہا تھا:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۙ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۙ وَ الَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۔

(سورۂ الشعراء)

وہ، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور ہدایت کی راہیں کھول دیں، کہ بھوکا ہوتا ہوں تو کھلاتا ہے اور پیاسا ہوتا ہوں تو پلاتا ہے اور وہ کہ جب اپنی بداعمالیوں سے بیمار پڑتا ہوں تو اپنی رحمت سے شفا دے دیتا ہے جو موت کے بعد حیات بخشے گا اور جس کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن خطاؤں سے درگزر کرے گا۔

اور پھر یہ کیا تھا کہ جب ان کا سنگ تراش چچا، پتھروں سے پرستش کی مورتیں بناتا تھا، تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا تھا کہ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ ۔

(الزخرف: ۲۵)

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم جن بت پرستیوں میں مبتلا ہو، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں البتہ مجھ کو اس ان دیکھی ذات سے سروکار ہے جس نے میری خلقت بنائی اور یقین ہے کہ وہی مجھ پر اپنی راہ کھول دے گا۔

روح الٰہی اور روح اعظم

دراصل یہ وہی "حقیقت اسلامیہ" تھی، جس نے ان کے وجود کو آنے والی امتوں کے لیے "اسوۂ حسنہ" بنا دیا تھا، اور جس کی وصیت انھوں نے اسحاق اور اسماعیل (علیہما السلام) کو کی، پھر انھوں نے یعقوب کو، اور اس کے بعد نسلاً بعد نسل سلسلۂ ابراہیمی میں منتقل ہوتی رہی:

وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ

(بقرہ: ۱۳۱)

اور یہی اسلام تھا، جس کی وصیت ابراہیم اپنی اولاد کو کر گئے اور پھر یعقوب بھی، کہ اے فرزند! اللہ نے تم کو اس دین اسلام سے ممتاز فرمایا، پس تم زندگی بھر اسی کی تعلیم دینا اور جب مرنا تو اسی طریقہ پر مرنا۔

یہی حقیقت وہ "روح اعظم" تھی جو آدم کے کالبد میں پھونکی گئی:

وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ۔

اور خدا نے آدم میں اپنی "روح" پھونکی۔

اور یہی وہ "روح الٰہی" ہے، جو شریعت ابراہیمی سے منسوب ہو کر سلسلۂ ابراہیمی کی آخری اُمت، یعنی اُمت مرحومہ میں ظہور کرنے والی تھی اور جس کے یوم ظہور کی ایک رات، ایام الٰہیہ کے گزشتہ ہزار مہینوں پر افضلیت رکھتی تھی:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ؕ لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ؕ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙۛ سَلٰمٌ ۛ۫ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۠ (القدر: ۱-۵)

ہم نے اسلام کو بصورت قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا اور تم جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ وہ ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں پر افضلیت رکھتی ہے۔ اس رات ملائکہ اور "روح" کا نزول ہوتا ہے، جو اپنے پروردگار کے حکم سے (نظم روحانی کے تمام امور کے لیے آتے ہیں۔ وہ رات امن اور سلامتی کی رات ہے، طلوع صبح تک۔

قلب سلیم

اور یہی وہ حقیقت تھی، جو اُن تمام حقیقتوں سے جو یہودیت یا مسیحیت سے تعبیر کی جا سکتی ہے، اعلیٰ و ارفع تھی، کیونکہ وہ تمام شاخیں اسی حقیقت الحقائق کی جڑ سے نکلی تھیں۔ پس "اصل" کی موجودگی میں "فرع" بے اثر ہے اور "کل" کے سامنے "جز" بے حقیقت۔ یہی سبب ہے کہ جب اس "اصل وکل" کی تکمیل کا آخری بروز ہُوا تو کہا گیا کہ:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (بقرہ: ۱۳۵)

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تاکہ ہدایت پاؤ، لیکن ان سے کہہ دو کہ نہیں، بلکہ صرف ملت ابراہیمی ہی میں تمام ہدایتوں کی حقیقت ہے، اور وہ تمہاری طرح مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اور یہی وہ انسان کی "فطرت اصلی" ہے جسے قرآن کریم نے "قلب سلیم" کے لقب سے بھی یاد کیا ہے یعنی قلب انسانی کی وہ بے میل حالت جو خارجی اثرات ضلالت سے بالکل محفوظ ہو یا فطرت اصلی کا وہ ذوق صحیح، جس کا ذائقہ کسی عارضی بیماری کے اثر سے بگڑ نہ گیا ہو، کیونکہ انسان کے اندر جو کچھ ہے وُہ اسلام ہے اور کفر جب آتا ہے تو باہر سے آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ابراہیم کی نسبت تصریح کر دی کہ:

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ (الصّٰفّٰت: ۸۴)

جب حضرت ابراہیم اپنے رب کی طرف "قلب سلیم" کے ساتھ متوجہ ہوئے۔

پھر سورۂ شعرا میں جب حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی ضلالت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے دعا مانگی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ

وہ آخری روز عدالت، جب کہ نہ تو مال و دولت کام دیں گے

اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ؕ	اور نہ اہل و عیال کام آئیں گے (یعنی کوئی مادی شے مفید
(شعرا : ۸۸)	ہوگی) مگر صرف وہ کامیاب ہوگا جس کے پہلو میں "قلب سلیم"

یہی "قلب سلیم" تھا جس پر اجرام سماویہ کے مدہش مناظر فتح نہ پا سکے اور اس نے ابراہیم کے دل کے اندر سے فاطر ملکوت السموٰت و الارض کے وجود پر شہادت دی :

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ؕ (الانبیاء ۔ ۵۶)	ابراہیم نے اپنی قوم کو جواب میں کہا کہ وہ آسمان و زمین کا مالک جس نے ان کو پیدا کیا تمھارا بھی پروردگار ہے اور میں اس کے وجود پر شہادت دیتا ہوں ۔

لہ یہ ایک نہایت ضروری اور مستقل بحث ہے اور فی الحقیقت اسوۂ ابراہیمی میں سے پہلا اسوہ یہی قلبِ سلیم یا ذوقِ فطرت کی صحت ہے مولانا روم کی اس نکتے پر نظر تھی ۔ انھوں نے مثنوی کے کئی موقعوں میں اس پر نہایت لطیف بحث کی ہے ۔ کسی وقت ایک مستقل عنوان سے بالتفصیل لکھوں گا ۔

باب ۹

اُسوۂ ابراہیمی اور حقیقت اسلامی

—(۲)—

حقیقت اسلامی کی اصل آزمایش

اور سب سے آخر یہ کہ جب حقیقت اسلامی کی آخری مگر اصل آزمایش کا وقت آیا تو وہ "اسلام" ہی تھا جس نے ابراہیمؑ کے ہاتھ میں چھُری دی، تاکہ فرزند عزیز کو ذبح کر کے ماسوی اللہ کی قربانی کرے اور "اسلام" ہی تھا جس نے اسماعیلؑ کی گردن جھکا دی تاکہ اپنی جان عزیز کو اسی کی راہ میں قربان کر دے۔ جب کہ اس نے پُوچھا:

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ (۳۷: ۹۹) (الصّٰفّٰت - ۱۰۲)

اے فرزندِ عزیز! میں نے خواب میں دیکھا ہے، اگویا تجھے اللہ کے نام پر ذبح کر رہا ہوں، پھر تیرے خیال میں یہ بات کیسی ہے؟

تو یہ وجود ابراہیمی کی نہیں بلکہ "اسلام" ہی کی صدا تھی۔ پھر جب اس کے جواب میں اسماعیل نے کہا کہ:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت ، ۱۰۲)

اے باپ! یہ تو گویا اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کا اشارہ ہے، پس جو اس کا حکم ہے، اس کو بلا تامل انجام دیجیے۔ اگر اسی خدا کی مرضی ہُوئی تو آپ دیکھ لیں گے کہ میں صبر کرنے والوں میں سے ہوں گا۔

تو یہ بھی اسماعیل کی نہیں، بلکہ اسلام ہی کی صدا تھی۔ پھر جب باپ نے بیٹے کو مینڈھے کی طرح سختی سے پکڑ کے زمین پر گرا دیا تو وہ اسلام ہی تھا، جو ابراہیم کے اندر سے کام کر رہا تھا اور جب بیٹے نے اس شوق و ذوق کے ساتھ، جو مرتوں کے پیاسے کو آبِ شیریں سے ہوتا ہے، اپنی گردن مضطرب ہو ہو کر چھُری سے قریب کر دی تو وہ حقیقت اسلامی ہی کی محویت کا استیلا تھا جس نے نفس اسماعیل کو فنا کر دیا تھا اور اسی فنا سے مقام ایمان کو بقا ہے:

سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت ، ۱۰۹-۱۱۱)

پس سلام حقیقت اسلامی کی قربانی کرنے والے ابراہیم پر! ہم مقام احسان[1] تک پہنچنے والوں کو بقائے دوام کا ایسا ہی بدلہ عطا فرماتے ہیں۔ بیشک وہ ہمارے حقیقی مومن بندوں میں سے تھا۔

اللہ اکبر! اللہ اکبر! لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔

---

[1] ہم نے محسنین کے ترجمہ میں اعمال حسنہ وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا بلکہ "مقام احسان" سے تعبیر کیا ہے۔

غافل مرو کہ تا در بیت الحرام عشق
صد منزل است و منزل اول قیامت است

سلطان محبت کی غیرت

اللہ اللہ ! اس نیرنگ ساز اول کے کاروبار محبت کی بوقلمونی کو کیا کہیے کہ اس کے حریم محبت کی ساری آرائش دوستوں کے خون کے چھینٹوں اور مضطرب لاشوں کی تڑپ ہی سے ہے۔ دوستوں کو کٹواتا ہے مگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ باپ کے ہاتھ میں چھری دیتا ہے کہ بیٹے کو قتل کرے اور بیٹے سے کہتا ہے کہ خوش خوش گردن جھکا دے کہ یہاں جان دینا ہی نہیں، بلکہ جان دینے کو روز عیش و نشاط سمجھنا بھی شرط ہے :

آہ ایں چہ دوستی است کہ سرہا ے یک دگر
خویشان بریدہ بر رہ قاتل نہادہ اند !

ابراہیمؑ کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی اور اسماعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا تو محبت نفس و جان کی پرچھائیاں نظر آئی :

عشق ست و ہزار بد گمانی !

غیرت الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ پہلے کے مکان کو ایک ہی مکین کے لیے خالی کر دو، پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کہ "الغیرۃ من صفات حضرۃ الربوبیۃ" محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنی ہیں اس آیہ کریمہ کے :

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۔ (النساء : ۴۷)

اللہ تعالیٰ تمھارے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ تم اس کی محبت میں کسی دوسرے کو شریک کرو۔

دل تقسیم نہیں ہو سکتا

سلطان محبت تمام گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں۔ آپ کا دوست ہزار کج ادائیاں کرے، آپ کا دل محبت پرست اس کی شفاعت سے باز نہ آئے گا، لیکن آپ اس گوشۂ نظر سے کیونکر درگزر کر سکتے ہیں جو آپ کی طرف نہیں، بلکہ کسی دوسری جانب تھا؟ آپ کسی کی آنکھوں کی بے مہری کو تو گوارا کر لے سکتے ہیں، لیکن اس خمار کو کیونکر دیکھ سکتے ہیں جو صحبت غیر کی شب بیداریوں

---

[1] اس سلسلے میں علامہ اقبال مرحوم کے یہ شعر بھی غور طلب ہیں :

مقام بندگی دیگر ، مقام عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ مے خواہی ، ز خاکی بیش ازاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازیہا
شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی

سے پیدا ہوا ہو؛ اگر کبھی اس کوچے میں گزر ہوا ہے، تو اپنے دل سے پوچھ لیجیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؛ البتہ اس مسئلے کے سمجھنے کے لیے مدرسے سے باہر بھی کچھ سیکھنا ضروری ہے؛

کیں مسئلہ در نسخۂ محمود و ایاز است

جہاد فی سبیل اللہ

اب میں اپنے اصل مقصد سے بہت قریب آ گیا ہوں۔ یہی آخری حالت وہ حقیقت اصلی تھی، جسے میں "حقیقت اسلامی" کے لفظ سے تعبیر کرتا آیا ہوں۔ یہی دعوت اسلام کا وہ عملی نمونہ تھا، جس نے اسوۂ ابراہیمی کی شکل میں ظہور کیا، یہی لفظ "اسلام" کا وہ شاہد معنی تھا، جس کے محمل وصال پر نفس وجان کی قربانیوں کے پردے پڑے ہوئے تھے، لیکن اس نجد خلت کے تاجدار محبت کے لیے مانع نہ ہو سکے اور عشاق حقیقت کے لیے اس کی جلوہ فروشیوں کو عام کر دیا۔ یہی وہ اصل اسلامی ہے جسے قرآن کریم اپنی اصطلاح میں "جہاد فی سبیل اللہ" سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی "اسلام" کی جگہ "جہاد" اور کبھی "مسلم" کی جگہ "مجاہد" بولتا ہے۔ پھر یہی وہ "اسوۂ حسنہ" ہے جس کی طرف وہ تمام پیروان ملت حنیفی کو دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ؛

قد كانت لكم اسوة حسنة فى ابراهيم والذين معهٗ۔ — بیشک حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی و اتباع کے لیے ایک بہترین نصب العین اور نمونۂ زندگی ہے۔

اسلام اور جہاد

پس قسم ہے اس خدائے اسلام کی، جس نے ابراہیم اور اسماعیل کی قربانی کو برکت بخشی اور اس کو ملت حنیفی کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا (وانهٗ لقسم لو تعلمون عظيم) کہ "اسلام" اور "جہاد" ایک ہی حقیقت کے دو نام اور ایک ہی معنی کے لیے دو مرادف الفاظ ہیں۔ اسلام کے معنی "جہاد" ہیں اور جہاد کے معنی اسلام پس کوئی ہستی "مسلم" ہو نہیں سکتی، جب تک وہ "مجاہد" نہ ہو اور کوئی "مجاہد" ہو نہیں سکتا، جب تک وہ "مسلم" نہ ہو "اسلام" کی لذت اُس بدبخت کے لیے حرام ہے، جس کا ذوق ایمانی لذت جہاد سے محروم ہو اور زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا ہو، لیکن اس کو کہہ دو کہ آسمانوں میں اس کا شمار کفر کے زمرے میں ہے۔

فالجهاد! الجهاد! الجهاد! الجهاد فى سبيل الله! ايها المسلمون الغافلون عن حقيقة الاسلام والجهاد! والله اكبر! الله اكبر! لا اله الا الله والله اكبر! الله اكبر ولله الحمد!!

دعوت کا مقصد

جب کہ ایک دنیا "لفظ جہاد" کی دہشت سے کانپ رہی ہے، جب کہ عالم مسیحی کی نظروں میں یہ لفظ ایک عفریت مہیب یا ایک حربۂ بے ایمان ہے، جب کہ اسلام کے مدعیان حمایت نصف صدی سے کوشش کر رہے ہیں کہ کفر کی رضا کے لیے اسلام کو مجبور کریں کہ اس لفظ کو اپنی لغت سے نکال دے، جب کہ بظاہر انھوں نے کفر و اسلام کے درمیان ایک راضی نامہ لکھ دیا ہے کہ اسلام لفظ جہاد کو بھلا دیتا ہے، کفر اپنے توحش کو بھول جائے اور جب کہ آجکل کے محدثین، مسلحین اور متفرنجین مفسدین کا ایک "حزب الشیطان" بے چین ہے کہ بس چلے تو یورپ سے

درجۂ تقرب عبودیت حاصل کرنے کے لیے (تحریف الکلم عن مواضعہ کے بعد) سرے سے اس لفظ ہی کو قرآن سے نکال دے تو پھر یہ کیا ہے کہ میں نہ صرف "جہاد" کو ایک رکن اسلامی، ایک فرض دینی، ایک حکم شریعت بتلاتا ہوں بلکہ صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں، اسلام سے اگر "جہاد" کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک لفظ ہوگا، جس میں معنی نہیں، ایک اسم ہوگا، جس کا مسمّٰی نہیں، ایک قشر محض ہوگا، جس سے مغز نکال لیا گیا ہے۔ پھر کیا میں اُن تمام اعمال مصلحین متفرنجین کو غارت کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے تطبیق بین التوحید والتثلیث یا اسلام اور مسیحیت کے عقد اتحاد کے لیے انجام دی ہیں؟ وہ اصلاح جدید کی شاندار عمارتیں، جو مغربی تہذیب وشائستگی کی ارض مقدس پر کھڑی کی گئی ہیں ؟ کیا دعوت جہاد سے میں جنود مجاہدین کو بلاتا ہوں کہ اپنے گھوڑوں کے سموں سے انھیں پامال کر دیں؟ اور پھر کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کی زندگی کا افق، جو حرارتِ حیاد کی گرد سے پاک کر دیا گیا تھا، مجاہدین کی اڑائی ہوئی خاک سے پھر غبار آلود ہو جائے !!

ہاں! اے نمازگزارِ حقیقت اسلامی! اے دزدانِ متاعِ ایمانی! اور اے مفسدین ملت ومدعیانِ اصلاح! ہاں! میں ایسا ہی چاہتا ہوں، میری آنکھیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہیں، میرا دل ایسے ہی وقت کے لیے بے قرار ہے، خدائے ابراہیم ومحمد (علیہما السلام) کی شریعت ایسا ہی چاہتی ہے، قرآن کریم اسی کو حقیقت اسلامی کہتا ہے، وہ اسی اسوۂ حسنہ کی طرف اپنے پیروؤں کو بلاتا ہے۔ اسلام کا اعتقاد اسی کے لیے ہے۔ اس کی تمام عبادتیں اسی کے لیے ہیں۔ اس کے تمام جسم اعمال کی رُوح یہی شے ہے اور یہی چیز ہے جسے اس نے ہمیشہ زندہ رکھنا چاہا اور "عید اضحیٰ" کو یومِ جشن ومسرت بنایا۔

بس یہ ہے جس کی طرف میں مسلمانوں کو بلاتا ہوں، پھر تمھارے پاس کیا ہے، جس کی طرف تم ہم کو دعوت دیتے ہو؟ هل عندكم من علم فتخرجوه لنا؟ (تجادلونني في اسماءٍ سميتموها انتم وآباؤكم ما انزل الله بها من سلطان، ان انتم الا تخرصون:

أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ۞ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۞ (الطور: ۴۲-۴۳)	یا ان کا ارادہ مکر وفریب پھیلانے کا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یاد رکھیں کہ یہ منکر خود ہی شیطان کے فریب میں پڑے ہیں یا پھر خدا کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے؟ اگر یہی بات ہے تو یقین کر لو کہ اللہ کی ذات ان کے اس شرک سے پاک ہے۔

جہاد ہے کیا؟

لیکن "جہاد" سے مقصود کیا ہے؟ اس کا محل اصلی کیا ہے؟ کیونکر اسلام کی حقیقت اور جہاد ایک ہے؟ آغاز مضمون میں جو سوالات کیے گئے تھے ان کا حل کیوں کر ہے؟ اگرچہ ان میں سے ہر سوال تفصیل طلب ہے، اور یکے بعد دیگرے صدہا مباحث پر مشتمل، تاہم تھوڑا سا انتظار کیجیے کہ چند اشارات

ئش کروں۔

ناالله اکبر! الله اکبر! لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر! اللہ اکبر وللہ الحمد۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام کی وہ کون سی حقیقت تھی، جو حضرت ابراہیمؑ کی زندگی پر طاری ہوئی جسے قرآن کریم نے امت مرحومہ کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہ

اسلام کا مادہ لفظ "سلم" ہے جو باختلاف حرکات مختلف اشکال میں آکر مختلف معانی پیدا کرتا ہے، لیکن لغت ںا ہے کہ "سلم" (بفتحتین) اور "سلام" کے معنی کسی چیز کے سونپ دینے، طاعت و انقیاد اور گردن جھکا دینے کے ہیں۔ اسی سے "تسلیم" بمعنی سونپ دینے کے اور اسلم (ای انقاد و اطاع) آتا ہے اور فی الحقیقت لفظ اسلام" بھی انہی معانی پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں ان معانی کے شواہد اس کثرت سے ہیں کہ ایک مختصر مضمون میں ب کا استقصاء ممکن نہیں تاہم ایک دو آیتوں پر نظر ڈالیے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً احکام طلاق کی ات میں ایک موقع پر فرمایا:

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا "سَلَّمْتُمْ" مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (بقرہ: ۲۳۳)	اگر تم چاہو کہ اپنے بچے کو کسی دایہ سے دودھ پلواؤ تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں، بشرطیکہ دستور کے مطابق ان کی ماؤں کو جو دینا کیا تھا، وہ ان کے حوالے کردو۔

اس آیت میں "سلمتم" حوالہ کر دینے کے معنی میں صاف ہے اسی طرح بمعنی اطاعت و انقیاد گردن نہادن کے بیسوں جگہ فرمایا ہے:

وَلَهٗٓ "اَسْلَمَ" مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (آل عمران، ۸۳)	اس آسمان و زمین میں کوئی نہیں جو چار ناچار دین الٰہی کا حکم بردار اور مطیع و منقاد نہ ہو۔
وَقَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا "اَسْلَمْنَا"۔ (حجرات، ۱۴)	اور یہ جو عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے تو ان سے کہ دو کہ تم ابھی ایمان نہیں لائے (کیونکہ وہ دل کے اعتقاد کامل کا نام ہے جو تمہیں نصیب نہیں) البتہ یوں کہو کہ ہم نے اس دین کو مان لیا۔

جاری و ساری قانون فطری

ہر شے کی اصل حقیقت وہی ہو سکتی ہے، جو اس کے نام کے اندر موجود ہو۔ دین الٰہی کی حقیقت لفظ اسلام کے معنی میں پوشیدہ ہے۔ لفظ اسلام کے معنی اطاعت۔ انقیاد۔ گردن نہادن اور کسی چیز کو حوالہ کر دینے کے ہیں، پس اسلام کی حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان اپنے پاس جو کچھ رکھتا ہے، خدا تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ اس کی تمام قوتیں، اس کی تمام خواہشیں، اس کے تمام

جذبات، اس کی تمام محبوبات، غرضکہ سر کے بالوں کی جڑ سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک، جو کچھ اس کے اندر ہے اور جو کچھ اپنے سے باہر اپنے پاس رکھتا ہے، سب کچھ ایک لینے والے کے سپرد کر دے۔ وہ اپنے تمام قوائے جسمانی و دماغی کے ساتھ خدا کے آگے جھک جائے اور ایک مرتبہ ہر طرف سے منقطع ہو کر اور اپنے تمام رشتوں کو توڑ کر، اس طرح گردن رکھ دے کہ پھر کبھی نہ اٹھے۔ نفس کی حکومت سے باغی ہو جائے اور احکام الٰہیہ کا مطیع و منقاد!

یہی وہ حقیقت اسلامی کا قانون فطری ہے، جو تمام کائنات عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس کی سلطنت سے زمین و آسمان کا ایک ذرہ بھی باہر نہیں۔ ہر شے جو اس حیات کدۂ عالم میں وجود رکھتی ہے، اپنے اعمال طبیعی کے اندر اس حقیقت اسلامی کی ایک مجسم شہادت ہے۔ کون ہے جو اس کی اطاعت و انقیاد سے آزاد اور اس کے سامنے سے اپنے جھکے ہوئے سر کو اٹھا سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں "کبیر المتعال" ہوں، پھر کون سی ہستی ہے جو اس کی کبریائی و جبروت کے آگے اپنے اندر اسلامی انقیاد کی ایک صدائے عجز نہیں رکھتی؟ زمین پر ہم چلتے ہیں اور آسمان کو دیکھتے ہیں، لیکن کیا دونوں اسی حقیقتِ اسلامی کی طرف داعی نہیں؟

زمین کی کیفیت

زمین کو دیکھو جو اپنے گرد و غبار کے اندر ارواح نباتاتی کی ایک بہشت حیات ہے، جس کے ایوانِ جمال سے اس حیات کدۂ ارضی کی ساری دلفریبی اور رونق ہے۔ جس کی غذا بخشی انسانی خون کے لیے سرچشمۂ تولید ہے اور جو اپنے اندر زندگیوں اور ہستیوں کا ایک خزانۂ لازوال رکھتی ہے! کیا اس کی وسیع سطح حیات پر ور پر ایک ذرۂ ہستی بھی ہے، جو اس حقیقتِ اسلامی کے قانونِ عام سے مستثنیٰ ہو؟ کیا اس کی کائنات نباتاتی کا ایک ایک ذرہ خدائے اسلام کے قائم کیے ہوئے حدود و نوامیس کا مسلم یعنی اطاعت شعار نہیں؟

بیج جب کہ زمین کے سپرد کیا جاتا ہے، تو فوراً لے لیتی ہے، کیونکہ اس کے بنانے والے نے اس کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ لیکن پھر اگر تم وقت سے پہلے واپس مانگو، تو نہیں دے سکتی، کیونکہ اس کا سر خدا کے آگے جھکا ہوا ہے، اور خدا نے ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے (ولکل اجل کتاب) پس محال ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرے اور حقیقت اسلام کے قانون عام کی مجرم ہو۔

قانون الٰہی نے زمین کی قوت نامیہ کے ظہور کے لیے مختلف دور مقرر کر دیے ہیں، اور ہر دور کے لیے ایک وقت خاص لکھ دیا ہے۔ زمین کی ورزشگی کے بعد اس میں بیج ڈالا جاتا ہے۔ آفتاب کی تمازت اس کو حرارت پہنچاتی ہے، ابر و ہوا اور موسم موافق کی رطوبت اس کی یبوست میں اعتدال پیدا کرتی ہے، پانی کا بمقدار مناسب حصول اس کے نشو و نما کو زندگی کی تازگی بخشتا ہے، یہ تمام چیزیں ایک خاص تسویہ و تناسب کے ساتھ اسے مطلوب ہیں؛ پھر بیج کے گلنے اور سڑنے، مٹی کے اجزاء سے نباتاتی کی آمیزش، کونپلوں کے پھوٹنے، ان کے بتدریج بلند ہونے اور اس کے بعد شاخوں کے انشعاب اور پتوں اور پھولوں کی تولید، ان تمام مرحلوں سے اس بیج کا درجہ بدرجہ گزرنا ضروری ہے،

اور ہر زمانے کے لیے ایک خاص حالت اور مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ یہی تمام مختلف مراحل و منازل زمین کی پیداوار کیلیے ایک شریعت الٰہیہ ہیں، جس کی اطاعت کائناتِ نباتات کی ہر روح پر فرض کر دی گئی ہے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ زمین ایک لمحہ، ایک منٹ اور ایک مستثنیٰ مثال کے لیے بھی اس شریعت کی مسلم ہونے یعنی اس کی اطاعت سے انکار کر دے؟ پھر اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو کیا ممکن ہے کہ ایک دانہ بھی بار آور اور ایک پھول بھی شگفتہ ہو؟

نباتات کی حالت ایک درخت ہے جو پانچ سال کے اندر پھل لاتا ہے، پھر تم کتنی ہی کوشش کرو، پانچ مہینے کے اندر وہ کبھی پھل نہیں دے گا۔ ایک پھول ہے، جس کے پودے کو زیادہ مقدار میں حرارت مطلوب ہے، پھر یہ محال ہے کہ وہ سایے میں زندہ رہ سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پانچ سال کے اندر اس کا حدِ بلوغ کو پہنچنا اور دھوپ کی تیزی میں اس کا نشوونما پانا، شریعت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے، پس وہ مُسلم ہے اور حقیقت اسلامی کا قانونِ عام اسی کو سرکشی و خلاف ورزی کا سر اٹھانے نہیں دیتا:

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ اور جو کچھ آسمان میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اس کا ہے، اور سب اسی کے حکم کے تابع اور منقاد ہیں۔ (روم: ۲۶)

پس فی الحقیقت زمین کے عالم نظم و تدبیر میں جو کچھ ہے، حقیقت اسلامی ہی کا ظہور ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ۔ اور زمین میں ارباب یقین کے لیے خدا کی ہزاروں نشانیاں بھری پڑی ہیں۔ (الذّٰریٰت: ۲۰)

پہاڑ یہ سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیاں، جو اپنے عظیم الشان دامنوں کے اندر خلقت کائنات کی سب سے بڑی عظمت رکھتی ہیں! یہ شیریں اور حیات بخش دریا، جو کسی مخفی تعلیم کے نقشے کے مطابق زمین کے اندر گاہ مستقیم، اور گاہ پرپیچ و خم راہ پیدا کرتے رہتے ہیں! یہ خوفناک و تہار سمندر، جس کی بے کنار سطح مہیب کے نیچے طرح طرح کے دریائی حیوانات کی بے شمار اقلیمیں آباد ہیں، غور کیجیے کہ کیا سلطان اسلام کی حکومت سے باہر ہیں؟ پہاڑوں کی چوٹیوں کے سر گو بلند ہیں، مگر اطاعت کے اسلام شعارانہ سر جھکے ہوئے ہیں۔ زمین کا جو گوشہ اور سمندر کا جو کنارہ ان کو دے دیا گیا ہے، ممکن نہیں کہ وہ ایک انچ بھی اس سے باہر قدم رکھ سکیں۔ ان کے ارتقائے جسمانی کے لیے جو غیر محسوس رفتارِ نمو شریعت الٰہی نے مقرر کر دی ہے، محال ہے کہ اس سے زیادہ آگے بڑھ سکیں۔ انقلابات طبیعیہ کا حکم الٰہی ان کو ریزہ ریزہ کر دے، پر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ اسی طرح دریاؤں اور سمندروں کی طرف کان لگائیے کہ ان کی زبان حال اس حقیقت اسلامی کی کیسی عجیب شہادت دے رہی ہے؟

سمندر آپ نے سمندروں کے طوفانوں اور موجوں کی صورت میں دیکھا ہے کہ پانی کی سرکشیاں کیسی شدید ہوتی ہیں؟ لیکن اس سرکش اور مغرور دیو پر جب حقیقت اسلامی کی اطاعت و انقیاد کا قانون نافذ ہوا تو

اس عجز و تذلل کے ساتھ اس کا سر جھک گیا کہ ایک طرف میٹھے پانی کا دریا بہہ رہا ہے اور دوسری طرف کھاری پانی کا بحرِ زخّار ہے۔ دونوں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ کوئی شے ان میں حائل نہیں، مگر نہ تو دریا کو یہ مجال ہے کہ سمندر کی سرحد میں قدم رکھے اور نہ سمندر با ایں ہمہ قوت و قہاری اس کی جرأت رکھتا ہے کہ اپنی سرکش موجوں سے اس پر حملہ کرے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ٥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ!

(الرحمٰن: ۱۹ : ۲۱)

اس نے کھارے اور میٹھے پانی کے دو سمندروں کو جاری کیا کہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں، مگر پھر بھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے، کیونکہ دونوں کے درمیان اس نے ایک حدِ فاصل مقرر کر دی ہے۔ پھر تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

دوسری جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔

(فرقان: ۵۳)

اور وہی قادرِ مطلق ہے، جس نے دو دریاؤں کو آپس میں ملایا، ایک کا پانی شیریں و خوش ذائقہ اور ایک کا کھاری کڑوا اور دونوں کے درمیان ایک ایسی حدِ فاصل اور روک رکھ دی کہ دونوں باوجود ملنے کے بالکل الگ رہتے ہیں۔

ملکوت السموٰات

اب نظر ذرا اوپر اٹھاؤ اور ملکوت السموٰات کے اُن اجرامِ عظیمہ کو دیکھو، جن کے مرئیات مدہشہ سے یہ سطحِ نیلگوں، ادراکِ انسانی کا سب سے بڑا منظرِ تحیر ہے۔ یہ عظیم الشان قہرمانِ تجلّی، جو روز ہمارے سروں پر چمکتا ہے، جس کی فیضان بخشی حیات تمیزِ قرب و بُعد سے ماوراء ہے، جس کا جذب و انجذاب کائناتِ عالم کے لیے مرکزِ قیام ہے، جس کا سرچشمۂ ضیاء و نور اجسامِ سماویہ کے لیے تنہا وسیلۂ تنویر ہے اور جس کا قہرِ حرارت کسی تجلّی گاہِ حقیقی کا سب سے بڑا عکس و ظلال ہے، غور کرو تو اپنے اندر حقیقتِ اسلامی کی کیسی موثر شہادتِ مبین رکھتا ہے! وہ، جس کی جبروت و عظمت کے آگے تمام کائناتِ عالم کا سر جھکا ہوا ہے، کیسے مسلم شعارانہ انکسار کے ساتھ فاطر السموٰات کے آگے سر بہ سجود ہے کہ ایک لمحہ اور ایک عشرِ دقیقے کے لیے بھی اپنے اعمال و افعال کے مقرر کردہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا۔

(فرقان: ۶۲)

کیا مبارک ہے ذات قدوس اس کی، جس نے آسمان میں (گردشِ سیارات کے) دائرے بنائے اور اس میں آفتاب کی مشعل روشن کر دی، اور نیز روشن و منور چاند بنایا!!

حدود اللہ پھر اسی طرح اور تمام اجرام سماویہ کو دیکھو اور ان کے افعال و خواص کا مطالعہ کرو! ان کے طلوع و غروب، ایاب و ذہاب، حرکت و رجعت، جذب و انجذاب، اثر و تاثر، اور فعل و انفعال کے لیے جو قوانین رب السمٰوٰت نے مقرر کر دیے ہیں، کس طرح ان کی اطاعت و انقیاد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں؟ یہی قوانین ہیں جن کو قرآن کریم "حدود اللہ" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور یہی "دین قیم" ہے، جو تمام نظام کائنات کے لیے بمنزلۂ مرکز قیام و حیات ہے۔ عالم ارضی و سماوی کا کوئی مخلوق نہیں جو اس دین الٰہی کا پیرو نہ ہو اور آفتاب سے لے کر خاک کے ذرّے تک کوئی نہیں جو اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدَانِ ۝ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝ اِلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝ (الرحمٰن: ۵-۸)

اسی کے حکم سے سورج اور چاند ایک حساب معین پر گردش میں ہیں، اور تمام عالم نباتات کے سر اسی کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اس نے آسمان کو بلندی قرار دیا اور (قانون الٰہی) کا میزان بنایا تاکہ تم لوگ اندازہ کرنے میں حد عدل سے متجاوز نہ ہو۔

نظام شمسی اور نظم و تدبیر پس نظام شمسی میں جس قدر نظم و تدبیر ہے، سب اسی "حقیقت اسلامی" کا ظہور ہے۔ حقیقت اسلامی کی اطاعت و انقیاد نے ہر مخلوق کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں محدود کر دیا ہے اور ہر وجود سر جھکائے ہوئے اپنے اپنے فرض کے انجام دینے میں مشغول ہے۔ اگر آفتاب کی کشش اس کو ایک بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیتی، اگر ہر ستارہ اپنے اپنے دائرہ حرکت کے اندر ہی محدود ہے، اگر تمام ستاروں کا باہمی جذب محیط ہمیشہ اس تسویہ و میزان کے ساتھ قائم رہتا ہے کہ عظیم الشان قوتوں کے یہ پہاڑ آپس میں نہیں ٹکراتے، اگر ان کی حرکت و سیر کی مقدار اور اوقات مقررہ میں طلوع و غروب، ایک ایسا ناممکن التبدیل قانون ہے، جس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی اور اگر:

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ (یٰس: ۴۰)

نہ آفتاب کے اختیار میں ہے کہ چاند کو جا لے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ دن سے پہلے ظاہر ہو جائے اور تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے دائروں کے اندر ہی پیرو رہے ہیں۔

تو پھر اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ اعمال کائنات اس امر کی شہادت نہیں کہ دنیا میں اصلی قوت صرف "اسلام" ہی کی قوت ہے اور اس عالم کا ہر وجود صرف اس لیے زندہ ہے کہ وہ "مسلم" ہے اور حقیقت اسلامی اس پر طاری ہو چکی ہے؟ ورنہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس حقیقت کی حکومت دنیا سے اٹھ جائے تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے:

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ
فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا
وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔ (آل عمران : ۳)

کیا یہ دین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور کے آگے سر جھکانا چاہتے ہیں
حالانکہ آسمان و زمین میں کوئی نہیں، جو اس دین الٰہی کا مسلم
یعنی مطیع و منقاد نہ ہو۔

باب ۱۰

اسوۂ ابراہیمی اور حقیقت اسلامی

(۳)

جسم انسانی اور آسمان وزمین پر کیا موقوف ہے، اگر خود اپنے اندر بھی دیکھئے تو جسم انسانی کا کون سا حصّہ ہے، جس پر حقیقت اسلامی طاری نہیں یا خود آپ کو تو اس کے آگے جھکنے سے انکار ہے، لیکن اس کی نہیں کہ آپ کے اندر جو کچھ ہے، اس کا ایک ایک ذرہ کس کے آگے سربسجود ہے؛ دل کے لیے یہ شریعت مقرر کر دی گئی اپنے قبض وبسط سے جسم کے تمام حصوں میں خون کی گردش جاری رکھے کہ اس کا اضطراب والتہاب ہی روح کے سکون حیات کا ذریعہ ہے۔ نیز حرکت کی ایک مقدار مقرر کر دی اور خون کے دخل وخرج کے لیے ایک پیمانۂ اعتدال دیا۔ پھر ذرا اپنے بائیں پہلو پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے کہ اس عجیب وغریب مضغۂ گوشت نے کس استغراق ومحویت کے ساتھ حقیقت اسلامی کے آگے سر جھکا دیا ہے، کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل نہیں، اور اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی سرکشی کا سر اٹھائے تو نظام حیات بدن کا کیا حال ہو؟ اسی طرح کارخانۂ جسم کے ایک ایک پرزے کے تشریحی فرائض پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آپ کے اندر سر سے لے کر پاؤں تک جس قدر زندگی ہے، اس حقیقت اسلامی ہی کے نظام سے ہے۔ آنکھوں کا ارتسام انعکاس، کانوں کی قوت سامعہ، معدے کا فعل انہضام اور سب سے بڑھ کر طلسم سرائے دماغ کے عجائب وغرائب، سب اسی لیے کام دے رہے ہیں کہ "مسلم" ہیں اور حقیقت اسلامی کے طاعت شعار۔ آپ کے جسم کی رگوں کے اندر جو خون دوڑتا ہے کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ کس کے حکم کی سطوت وجبروت ہے جو اس رہ نورد لیل ونہار کو دوڑا رہی ہے؟

وفی انفسکم افلا تبصرون ۝ (الذّٰریٰت: ۲۱)	اگر باہر کی طرف سے تمہاری آنکھیں بند ہیں تو کیا اپنے نفس کے اندر بھی نہیں دیکھتے؟

اور یہی اشارہ ہے، جو اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے کہ:

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انہ الحق۔ (حٰم سجدہ: ۵۳)	ہم اپنی نشانیاں عالم کائنات کے مختلف اطراف وجوانب میں بھی دکھلائیں گے اور انسانوں کے نفس کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ دین الٰہی برحق ہے۔

تسبیح وتقدیس اور یہی حقیقت اسلامی کی وہ اطاعت شعاری ہے جس کو لسان الٰہی نے عالم کائنات کی تسبیح وتقدیس سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت اس عالم کا ہر ذرہ زبان حال سے

اُس سبوح و قدوس کی عبادت میں مشغول ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ، وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

تمام آسمان اور تمام زمینیں اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کے سب اسی خدا کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں اور کائنات میں کوئی چیز نہیں، جو زبان اطاعت سے اس کی حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس نہ کرتی ہو، مگر تم ان کی اس آواز کو نہیں سمجھتے اور اس پر غور نہیں کرتے۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بُردبار ہے اور بڑا ہی بخشنے والا۔

خلافت انسانی اور حقیقت اسلام

اور یہی وہ عہد و میثاق عبودیت تھا، جس کا اقرار صحبت ازل کے ہر جرعہ نوش جام "بلی" سے لیا گیا اور حقیقت اسلامی کی محویت اولی نے سب کی زبان سے بے اختیارانہ اقرار انقیاد کرا لیا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ (اعراف: ۱۷۱)

اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے اس کی ذریت کو (بصورت تعین اولیٰ) نکالا اور ان کے مقابلے میں خود انہی سے شہادت دلا دی۔ اس طرح کہ ان سے پوچھا: کیا میں تمہارا آمر و حاکم اور رب الارباب نہیں ہوں! سب نے اطاعت کے سر جھکا دیے کہ بیشک تو ہی مستحق اطاعت ہے۔

اور اسی حقیقت اسلامی کے آگے سر جھکانے کا نتیجہ وہ سربلندی ہے، جو انسان کو تمام مخلوقات ارضیہ میں حاصل ہے اور جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے صفات کاملہ کا مظہر، اور زمین پر اس کا خلیفہ قرار پایا۔ اس نے جب اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا تو اللہ نے اُن تمام مخلوقات ارضیہ کو، جن کے سر اس کے آگے جھکے ہوئے تھے، حکم دیا کہ اس جھکنے والے کے آگے بھی جھک جاؤ کہ من تواضع للہ، رفعہ اللہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وحملناهم فی البر والبحر و رزقنٰهم من الطيّبٰت۔ (بنی اسرائیل: ۱۰)

اور ہم نے شرف و کرامت عطا فرمایا نسل انسانی کو اور تمام خشکی اور تری کی چیزوں کو حکم دیا کہ اُس کے مطیع ہو جائیں اور اس کو اٹھا لیں اور اس کے لیے دنیا میں بہترین اشیاء پیدا کریں۔

قوت شیطانی

کائنات کی ہر مخلوق نے اس حکم کی تعمیل کی، کیونکہ ان کے سر تو اس کے آگے جھکے ہوئے تھے، پر ایک شریر ہستی تھی، جس نے غرور و تکبر کے ساتھ کفر کا سر اٹھایا اور انسان کی اطاعت سے

انکار کر دیا:

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (بقرہ: ۳۴)

اور جب تمھارے پروردگار نے ملائکہ کو حکم دیا کہ نوعِ آدم کے آگے اطاعت کے سر جھکا دو تو سب جھک گئے مگر ایک ابلیس تھا، جس نے انکار کیا اور کبر و غرور کا سر اٹھایا اور وہ یقیناً کافروں میں سے تھا۔

"وکان من الکافرین" کیونکہ اسلام کے معنی جھکنے کے ہیں اور کفر نام ہے سرکشی کا۔ "ابلیس" نے جھکنے سے انکار کیا اور سرکشی کا سر اٹھایا، پس "وہ ضرور کافروں میں سے تھا۔"

ہدایت کا قدیمی دشمن

یہی ایک شریر طاقت ہے، جو عالم میں تمام سرکشیوں اور ہر طرح کے ظلم و طغیان کا مبدء ہے یہی وہ تاریکی کا اہرمن ہے جو یزدانی نور و ضیاء کے مقابلے میں اپنے تئیں پیش کرتا ہے۔ یہی وہ قہرمان ضلالت ہے، جو انسان کے پاؤں میں اپنی اطاعت کی زنجیریں ڈال کر اس کو اسلامی اطاعت سے باز رکھتا ہے یہی وہ ابوالکفر ہے، جس کی ذریت انسان کے اندر اور باہر، دونوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جب چاہتا ہے، انسان کے مجرائے دم کے اندر پہنچ کر اپنی ضلالت کے لیے راہ پیدا کر لیتا ہے اور یہی وہ اسلام کی حقیقت کا اصل ضد اور اس کی قوت ہدایت کا قدیمی دشمن ہے، جس نے اپنے کفر کے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؗ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۶۲)

شیطان نے آدم کی طرف حقارت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا کہ یہی ہے جس کو تو نے مجھ پر فوقیت دی ہے؛ لیکن اگر تو مجھ کو روزِ قیامت تک مہلت دے تو میں اپنی قوتِ ضلالت سے اس کی تمام نسل کو تباہ کر دوں، البتہ وہ تھوڑے سے لوگ، جن پر میرا جادو نہ چلے گا، میری حکومت سے باہر رہ جائیں گے۔

لیکن خدا تعالیٰ نے یہ کہہ کر جھڑک دیا:

اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ

جا دور ہو! جو شخص نسلِ آدم میں سے تیری متابعت کرے گا، اس کے لیے اور تم سب کے لیے عذابِ جہنم کی پوری پوری سزا ہوگی۔ ان میں سے جن جن کو تو اپنی پُر فریب صداؤں سے بہکا سکتا ہے، بہکا لے، ان پر اپنی فوج کے سواروں اور پیادوں سے چڑھائی کر دے، ان کی مال و دولت اور اولاد و

إِلَّا غُرُوْرًا۔ (بنی اسرائیل : ۶۴) فرزند میں شریک ہو کر اپنا ایک حصہ لگا لے اور ان سے جتنے جھوٹے وعدے کر سکتا ہے، کر لے۔ شیطان کے وعدے مخفی دھوکے اور فریب سے زیادہ نہیں ہیں۔

قوتِ شیطانی کے مختلف پردے

پھر یہی ہے جس کو خواہ تم اپنے سے خارج دیکھو یا خود اپنے اندر تلاش کرو، اس کے حکم ضلالت کے احکام دونوں جگہ جاری ہیں، وہ کبھی تمھاری رگوں کے اندر کے خون میں اپنی ذریات کو اتار دیتا ہے تاکہ تم پر اندر سے حملہ کرے، کبھی باہر سے آکر تمھارے دماغ دحواس پر قابض ہو جاتا ہے تاکہ تم کو اپنے آگے جھکا کر خدا کے آگے جھکنے سے باز رکھے، وہ کبھی تمھارے مال و متاع میں، کبھی محبت اہل وعیال میں اور کبھی عام محبوبات و مرغوبات دنیویہ میں شریک ہو جاتا ہے اور اسی طرح تمھاری ہر شے خدا کی جگہ اس کے لیے ہو جاتی ہے۔ تم چلتے ہو تو اس کے لیے، کھاتے ہو تو اس کے لیے اور پہنتے ہو تو اس کے لیے، حالانکہ حقیقت اسلامی چاہتی ہے کہ تم جو کچھ کرو خدا کے لیے کرو۔

ہر تاریکی جو روشنی کو چھپانا چاہتی ہے، ہر سیاہی جو سفیدی کے مقابلے میں ہے، ہر تمرد و سرکشی جو اطاعت الٰہی کی ضد ہے اور ہر وہ شے، جو حقیقت اسلامی سے خالی ہے، یقین کرو کہ شیطان ہے اور دنیا کی ہر لذت اور ہر راحت، جس کا انہماک اس درجہ تک پہنچ جائے کہ وہ حقیقت اسلامی کے انقیاد پر غالب آجائے، شیطان کی ذریت میں داخل، پس اس کے وجود کی نسبت کیوں سوچتے ہو کہ وہ کیسا ہے اور کہاں ہے؟ اس کو دیکھو کہ وہ تمھارے ساتھ کر کیا رہا ہے؟

ایک نوکر اور دو آقا

(مسیح) نے کہا کہ ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا، اور قرآن حکیم کہتا ہے کہ:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ (احزاب : ۴) اللہ نے کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے ہیں بلکہ دل ایک ہی ہے۔

پس ایک دل کے سر بھی دو چوکھٹوں پر نہیں جھک سکتے اور دنیا میں دل ہی ایک ایسا جوہر ہے، جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ یا وہ قوت شیطانی کا مطیع و منقاد ہو گا یا قوتِ رحمان کا۔ یا وہ شیطان کا عبادت گزار ہو گا یا خدا سے رحمان کا اور عبادت و پرستش (غیر اللہ) سے مقصود یہی نہیں کہ پتھر کا ایک بت تراش کر اس کے آگے سر بہ سجود ہو۔ یہ تو وہ ادنیٰ شرک ہے، جس سے قریش مکہ کا خیال بھی بلند تھا بلکہ وہ ہر انقیاد، ہر وہ سخت و شدید انہماک اور ہر وہ استغراق و استیلا، جو حقیقت اسلامی کے انقیاد اور محبت الٰہی پر غالب آجائے اور تم کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ جس کی طرف تمھیں کھینچنا تھا، اس کی طرف سے گردن موڑ لو۔ درحقیقت وہی تمھاری پرستش و عبادت کا بت ہے

تم اس کے بُت پرست اور اصلی و حقیقی شرک کے مشرک۔ یہی سبب ہے کہ حقیقت شناسان توحید نے فرمایا: من شغلك عن الله فهو صنمك (جس چیز نے تم کو اللہ سے الگ کر کے اپنی طرف متوجہ کرلیا، وہی تمھارے لیے بت ہے) تم اس کے پُوجنے والے ہو، خواہ وہ جنت کی ہوس اور حور و قصور کا شوق ہی کیوں نہ ہو؟ (رابعہ بصریہ) سے جب پوچھا کہ: ما الشرك؟ شرک کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ طلب الجنة، واعراض عن ربها۔ جنت کی طلب کرنا اور مالک جنت کی طرف سے غافل ہو جانا! یہی سبب ہے کہ قرآن کریم نے ہوائے نفس کو معبود و الٰہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

ارءیت من اتخذ الٰهه هواه

کیا تم اس گمراہ کو نہیں دیکھتے، جس نے ہوائے نفس کو معبود بنا لیا ہے؟

حقیقت اسلامی کا تقاضا

اور کس قدر میرے مطلب کو واضح تر کر دیتی ہے سورۂ یٰسین کی وہ آیت، جس میں فرمایا کہ:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (یٰس: ۶۰-۶۱)

کیا ہم نے تم سے اے اولاد آدم! اس کا عہد نہیں لے لیا تھا کہ شیطان کی پُوجا سے باز رہو، کیونکہ وہ تمھارا ایک کھلا دشمن ہے اور صرف ہماری ہی عبادت کرو کہ یہی ہدایت کی حقیقی راہ ہے؟

یہاں شیطان کی اطاعت کو بندگی اور عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا اور عبادت الٰہی کے اُس عہد و میثاق کو یاد دلایا جو "الست بربکم" کے سوال کے جواب میں تمام بنی آدم سے لیا جا چکا ہے۔ پس حقیقت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ انسان قوت شیطانی سے باغی ہو کر صرف خدا تعالیٰ کا ہو جائے اور اس کے آگے سرِ انقیاد جھکا کر اپنے "میثاق بلی" کی تجدید کرے تاکہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور اللہ کا بندہ وہی ہے جو شیطان کا نہیں ہے:

اِنَّ "عِبَادِيْ" لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۵)

خدا تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ جو "میرے بندے" ہیں ان پر تیری حکومت نہیں چلنے کی اور خدا اپنے بندوں کی کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔

یہاں ان بندگانِ مخلصین کو جو شیطان کے اثر و استیلا سے محفوظ ہوں، خدا نے اپنی طرف نسبت دی کہ "ان عبادی" "جو لوگ میرے بندے ہیں، حالانکہ کون ہے جو اس کا بندہ نہیں؟ مگر مقصود یہ تھا کہ میرے بندے تو وہی ہیں، جو صرف میرے لیے ہیں، لیکن جنھوں نے میرے آگے جُھک کر، پھر اپنے سر کو دوسری چوکھٹوں پر بھی جھکا دیا ہے تو دراصل انھوں نے بندگی کا رشتہ کاٹ دیا۔ گو وہ میرے تھے، لیکن اب میرے باقی نہیں رہے، کیونکہ انھوں نے

توحید محبت کو شرکت غیر سے محفوظ نہیں رکھا (افسوس کہ یہ موقع اس بیان کی تشریح وتفصیل کا مقتضی نہیں اور مطالب اصلی منتظر رجوع)

رجوع الی المقصود

پس لفظ "اسلام" کے معنی ہیں کسی چیز کے حوالہ کر دینے اور گردن رکھ دینے کے اور یہی حقیقت دین اسلام کی ہے کہ انسان اس رب الارباب کے آگے اپنی گردن رکھ دے اور اس انقطاع اور انقیاد حقیقی کے ساتھ، گویا اس نے اپنی گردن اس کے سپرد کر دی اور کوئی حق وملکیت اور مطالبہ اس کا باقی نہیں رہا۔ اب وہ اپنی کسی شے کا، خواہ وہ اس کے اندر ہو یا باہر، مالک نہیں رہا بلکہ ہر شے اسی قوت الٰہیہ کی ہو گئی، جس کا نام "اسلام"

مہالک وخطرات حیات

انسان کے اندر اور انسان کے باہر، سیکڑوں مطالبات ہیں، جو اس کو اپنے طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس کے اندر سب سے بڑے مظہر ابلیس، یعنی نفس کی قوت قاہرہ کا دست طلب بڑھا ہوا ہے اور وہ ہر دم اور ہر لمحے اس کی ہر شے کو اس سے مانگ رہا ہے تاکہ اس کو خدا کی جگہ اپنا بنا لے۔ باہر دیکھتا ہے تو محبوبیت دنیوی اور مہالک حیات کے دام قدم قدم پر بچھے ہوئے ہیں اور جس طرف جاتا ہے، اس سے اس کا قلب ودماغ مانگا جاتا ہے تاکہ اسے خدا سے چھین لیں، جذبات اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ اقدامات کی فوجوں نے اس کے دماغ کا محاصرہ کر لیا ہے، آزمائشوں اور امتحانوں کی کثرت سے اس کا ضمیر اور دل ایک دائمی شکست سے مجبور ہے۔ اہل وعیال، عزت وجاہ، مال ودولت کے "قناطیر مقنطرۃ" اور تمام وہ چیزیں، جن کو قرآن زینت حیات دنیا سے تعبیر کرتا ہے، اس کے کمزور دل کے لیے اپنے اندر ایک ایسی پرکشش سوال رکھتی ہیں، جس کو رد کرنا اس کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہو جاتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ (آل عمران: ۱۴)	انسان کی حالت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے لیے دنیا کی مرغوب چیزوں مثلاً اہل وعیال سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے، مویشی اور کشت کاری میں بڑی دلبستگی ہے۔

رحیم وکریم خدا

پس انقیاد اسلامی کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی جنس دل وجان کے بہت سے خریدار نہ بنائے بلکہ ایک ہی خریدار سے معاملہ کرے، وہ ان تمام مانگنے والوں سے، جن کے ہاتھ اس کی طرف بڑھے ہوئے ہیں، اپنے تئیں بچائے اور اس ایک ہاتھ کو دیکھے، جو باوجود اس کی طرح طرح کی بے وفائیوں کے پھر بھی وفائے محبت کے ساتھ اس کی طرف بڑھا ہوا ہے، اور گو اس نے اپنے متاع دل وجان کو کتنا ہی ناقص اور خراب کر دیا ہو، لیکن پھر بھی بہتر سے بہتر قیمت دے کر خریدنے کے لیے موجود ہے اور صدائے محبت "من تقرب الی شبراً، تقربت الیہ ذراعاً"[1] سے ہر آن وہر لحظہ عشق نواز، ہر قلب مشتاق ہے۔ یہ خواہ کتنی ہی پیمان شکنیاں کرے، لیکن وہ اپنا عہد محبت

[1] یہ صحاح کی مشہور حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے "جو شخص میری طرف بالشت بھر بڑھے گا، میں ایک گز بڑھ کر اس سے ملوں گا

آخر تک نہیں توڑتا کہ : یا ابن آدم ! لو ذنبك عنان السماء ثم استغفرتی، لغفرت لك[1] اور جس کی وفا سے محبت کا یہ حال ہے کہ خواہ تم تمام عمر اُسے اپنے سے کتنا ہی رُوٹھا ہوا رکھو، لیکن اگر انابت و اضطرار کا ایک آنسو بھی سفارش کے لیے ساتھ لے جاؤ تو وہ پھر بھی ملنے کے لیے طیار ہے اور جس کے دروازے سے [illegible] ہ کتنا ہی بھاگو، پھر بھی اگر شوق کا ایک قدم بڑھاؤ تو وہ دو قدم بڑھ کر تمھیں لینے کے لیے منتظر ہے : الا طال شوق الابرار الی لقائی، و انا الیہم لاشد شوقا[2] ولنعم ما قیل :

عاشقاں ہرچند مشتاق جمال دلبر اند
دلبراں بر عاشقاں از عاشقاں عاشق ترند

جس کا دروازۂ قبولیت کبھی بند نہیں اور جس کے یہاں مایوسی سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں :

قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ط ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا ، انہٗ ھو الغفور الرحیم۔

اے وہ میرے بندو ! کہ گناہوں میں ڈوب کر تم نے اپنے نفوس پر سخت زیادتیاں کی ہیں، خواہ تم کیسے ہی غرق معصیت ہو مگر پھر بھی اس محبت فرما کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً وہ تمھارے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔ بیشک وہی درگزر کرنے والا ہے اور اس کی بخشش رحم عام ہے۔

با گنہ گاراں بگویم تا نیند از بید دل
من وفائے دوست را در بے وفائی یافتم

قرآن کریم اور لفظ اسلام | اب اس قدر طولِ طیبہ و تمہید کے بعد قرآن کریم کی طرف رجوع کرو کہ وہ اسی حقیقت اسلامی کو

---

[1] اے ابن آدم ! اگر تیرا گناہ اس قدر بڑھ جائے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اس کا ایک ستون بن جائے ، لیکن پھر بھی تو توبہ و انابت کا سر جھکائے گا، تو مایوس نہ ہو کر میں تجھے بخش دوں گا ۔ [2] یعنی میرے دیدار کے لیے میرے مشتاقوں کا شوق بڑھا ہوا ہے حالانکہ میں ان کے لیے ان سے زیادہ مشتاق ہوں (صاحب فردوس نے ابی درداء کی روایت سے اس حدیث قدسی کو لکھا ہے ، اور پھر امام غزالی احیاء میں لائے ہیں۔ لیکن احادیث کے بارے میں ۔ امام صاحب کی بے احتیاطیاں جس حد تک پہنچی ہوئی ہیں، ارباب نظر سے مخفی نہیں ۔ مجھے یہ حدیث لکھتے وقت یکایک یاد آگئی اور ذوق مطلب سے بے اختیار ہو کر لکھ گیا، لیکن اب کہ پروف دیکھ رہا ہوں، ظاہر کر دیتا ہوں کہ اس حدیث کو بلحاظ معنی کے لکھا ہے نہ بلحاظ الفاظ ۔ چونکہ اس کا مطلب مشہور حدیث صحیح " من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعاً " کے بالکل مطابق ہے ، اس لیے اس کا ذکر احتیاط حدیث کے منافی نہیں ۔

بار بار دُہراتا ہے یا نہیں ؛ اوّل تو خود لفظ " اسلام " ہی اس حقیقت کے وضوح کے لیے کافی ہے ، لیکن اگر کافی نہ ہو تو جس قدر کہہ چکا ہوں ، اس سے زیادہ کہنے کے لیے ابھی باقی ہے ۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کا لفظ آیا ہے ، غور کیجیے تو اس حقیقت کے سوا اور کوئی معنی ثابت نہ ہوں گے ؛

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ (لقمان : ۲۲)

اور جس کسی نے اپنا منہ اللہ کی طرف جھکا دیا (یا اپنی گردن اللہ کے حوالے کر دی) اور اعمال حسنہ انجام دیے تو بس دین الٰہی کی مضبوط رسی اس کے ہاتھ آگئی ۔

دوسری جگہ فرمایا ؛

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ۔ (النساء : ۱۲۴)

اور اس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے لیے اپنا سر جھکا دیا (یا اللہ کے لیے حوالے کر دیا) اور اعمال حسنہ انجام دیے ۔

سورۂ عمران کی ایک آیت میں جو اسلام کی حقیقت کی تفصیل و تشریح کے لیے ایک جامع ترین آیت ہے ، اسلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ؛

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ (آل عمران : ۱۸)

دین اللہ کے یہاں صرف ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے ۔

پھر اس کے بعد فرمایا ؛

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِىَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۔

(آل عمران : ۲۰)

اور اگر منکرین اس بارے میں تم سے بحث کریں تو کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو صرف اللہ ہی کے آگے اپنا سر جھکا دیا ہے اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے پوچھو کہ تم بھی اس کے آگے جھکے یا نہیں ؟ سو اگر وہ جھک گئے (یعنی مسلم ہو گئے) تو بس انھوں نے ہدایت پالی اور اگر انھوں نے گردنیں موڑ لیں تو وہ جانیں اور ان کا کام جانے ، تمہارا فرض تو حکم الٰہی پہنچا دینا تھا اور اللہ اپنے بندوں کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے ۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ تعلیم فرمایا ؛

وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (یونس : ۷۲)

اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرف سے منہ پھیر کر اس کے آگے جھک جاؤں ، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ۔

اعراض و تولّی یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اسلام کے ساتھ منکرین اسلام کے لیے " ولی " اور " اعرض " کا

لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "ولی عن الشی" کے معنی لغت میں "اعرض" کے ہیں اور "تولی عنه" ای "اعرض عنه" ہر جگہ پاؤ گے، یعنی کسی چیز کی طرف سے منہ موڑ لینا اور گردن پھیر لینی؛

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا۔ (لقمٰن : ۷)

اور جب ان میں سے کسی منکر کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو بیجان غرور سے اکڑتا ہوا گردن پھیر کر چل دیتا ہے۔

اسی طرح اور سیکڑوں مقامات میں فرمایا: "فان تولوا، فقل حسبی الله" اگر وہ تیری طرف سے گردن پھیر لیں تو کہہ دے کہ مجھ کو خدا بس کرتا ہے "ولوا علیٰ ادبارهم نفورا" جب کفار کے آگے ذکر الٰہی کرو تو وہ پیچھے کی طرف منہ موڑ کر نفرت کناں چل دیتے ہیں۔

چونکہ اسلام کی حقیقت اللہ کے آگے سر جھکا دینا اور اپنی گردن سپرد کر دینا ہے، اس لیے اس سے انکار کو ہر جگہ "تولی" اور "اعراض" سے تعبیر کیا گیا:

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ (النحل، ۸۱-۸۲)

اور اسی طرح اللہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اس کے آگے جھکو، اور اے پیغمبر! اگر باوجود اس کے بھی لوگ گردن نہ جھکائیں، تو تمہارا فرض تو صرف حکم الٰہی پہنچا دینا ہی ہے۔

باب ۱۱

کائناتِ خُلّت

ما طفل کم سواد و سبق قصّہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

(۱)

قرآن حکیم نے دنیا کے سامنے حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ان مصلحین صالحین کا، جنھیں ان کی تبعیت و معیت حاصل تھی، اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے، یعنی عملی زندگی کا ایک ایسا نمونہ جس کی پیروی کی جائے:

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرَاھِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ۔ (الممتحنہ: ۴)

یقیناً تمھارے لیے حضرت ابراہیم کی زندگی میں اور ان کی زندگی میں جو ان اعلیٰ ترین مدارج ایمان میں ان کے ساتھ نظر آتے ہیں، پیروی و اتباع کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم نے ظہورِ دعوت کے آغاز ہی میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت و حکمت دراصل ملّتِ ابراہیمی ہی کی تکمیل ہے اور اس سلسلے کی پہلی کڑی وجودِ ابراہیمی میں پنہاں تھی:

مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ۔ (الحج: ۷۸)

یہ ملت تمھارے مورثِ اعلیٰ ابراہیم کی ہے!

قَالُوْا کُوْنُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَھْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا۔ (البقرہ: ۱۳۵)

مخالفینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہودیت اور نصرانیت کا طریق اختیار کرو کہ انھی میں ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہہ دو کہ نہ تو بنی اسرائیل کی راہ ہماری راہ ہے اور نہ نصرانی ضلالت کا طریقہ ہمارا طریقہ، ہم تو ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہیں اور یہی حقیقی اور فطری راہِ ہدایت ہے۔

مومن بالقرآن کا پہلا فرض

پس ان دو حقیقتوں کے معلوم ہونے کے بعد ہر مومن بالقرآن کا پہلا فرضِ زندگی یہ ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اُن مقامات و اعمال کی جستجو میں نکلے، جن کو قرآن حکیم نے ہمارے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ملتِ ابراہیمی کے وہ حقائق معلوم کرے جن کے اندر اسلام کی دعوت کا اصلی محور و مرکز پوشیدہ ہے:

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَ ھُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا۔ (النساء: ۱۲۵)

اور اس ضلالت آبادِ عالم میں جہاں انسانی فطرت کی ہدایت طرح طرح کے انسانی طریقوں اور غیر الٰہی راہوں میں گم ہو گئی ہے

اس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جو ہر طرف سے منہ موڑ کر
صرف اللہ ہی کے لیے ہو گیا اور اپنے تمام اعتقادات و
اعمال میں طریق "احسان" اختیار کیا اور اس طرح ملت ابراہیمی
کے حنیفی طریق کی پیروی کی کہ اسلام کی حقیقت یہی ہے۔

حیاتِ ابراہیمیؑ

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے حصۂ قصص میں حضرت ابراہیم کے وقائع زندگی کو ایک مخصوص عظمت و اہمیت حاصل ہے اور قرآن کی تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس زندگی کی ایک ایسی سوانح عمری مرتب نہ کی جائے، جس کے اصولی ابواب صرف قرآن حکیم سے ماخوذ ہوں۔ اگر ایک ایسی سوانح عمری مرتب ہو جائے تو وہ دراصل قرآن حکیم اور دعوت اسلامیہ کے تمام مقامات و مراتب اور حقائق و معارف کے فہم و تدریس کے لیے ایک مرکزی کا چراغ ہو گی، جس سے تمام اطراف روشن ہو جائیں گے۔

یہ سوانح عمری تبلائے گی کہ اسلام کی تمام تعلیمات و احکام کی اصلی حقیقت کیا ہے اور وہ کونسا محور ہے جس کے گرد اس کا دائرۂ شریعت گردش کھا رہا ہے؟ اسی سوانح عمری سے معلوم ہو گا کہ وہ "امۃ مسلمۃ" جو وجود ابراہیمی میں پنہاں تھی (ان ابراھیم کان امۃ قانتا) اور جو ایک انقلاب آور تاریخی دعا کی صداؤں میں نمایاں ہوئی (ربنا واجعلنا مسلمین لك و من ذریتنا امۃ مسلمۃ لك) اور بالآخر جس کی قبولیت کا ظہور اس "خیر الامم" امۃ وسطا" کی تکمیل سے ہوا جو تمام عالم کی اصلاح و سعادت کے لیے دائمی خلافت الٰہی کی مستحق ہے، اس کا مصدر حقیقی کیا تھا؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ: ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانی امۃ قرار دیا تاکہ تم انسانوں پر ان کی ہدایت و سعادت کے لیے شاہد ہو اور تم اپنی شہادت کی روشنی اللہ کے رسول سے حاصل کرو۔

سعادت بشری کی عالمگیر سرگزشت

یہ سوانح عمری اگرچہ صرف ایک ہی انسانی وجود کے اعمال حیات کی سرگزشت ہو گی، لیکن چونکہ اس ایک وجود کے اعمال و ادراکات کے اندر تمام نسل انسانی کی مستقل حیات ملی کا مادہ پوشیدہ تھا، اس لیے دراصل یہ سعادت بشری کی ایک عالمگیر سرگزشت ہو گی اور ان تمام سامی اقوام و ملل کی تاریخ سعادت و شقاوت کو واضح کر دے گی جو عہد ابراہیمی کے بعد سے اب تک گزریں اور جن کی نسلیں اس وقت تک کرۂ ارضی کی سب سے بڑی پیداوار ہیں۔ پس اگرچہ وہ ایک بیج کی سرگزشت ہو گی جو اب سے چار ہزار برس پہلے "وادِ غیر ذی زرع" کی ریتلی زمین میں ڈالا گیا، لیکن چونکہ سعادت بشری اور خلافت ارضی کا سب سے بڑا درخت اسی سے پھوٹا، اس لیے دراصل وہ ہر اس پتے کی سرگزشت ہو گی، جس کا نمو اس کے اندر تھا اور ہر اس شاخ کی تاریخ تبلائے گی، جو اس درخت سے نکلی اور پھیلی۔ ہر پھل جو اس کی ڈالیوں میں لگا دراصل اسی بیج کا پھل تھا اور ہر

پھول جو اس کی پتیوں کے اندر سے نمایاں ہُوا، فی الحقیقت اسی فردِ اوّل کا فرزند تھا۔ قوت نباتی کی نشوونما اگرچہ ہزارہا افراد و اشکال میں سامنے آتی ہے، لیکن جب نظرِ حقیقت شناس اس کی سیکڑوں ڈالیوں، ہزاروں پھولوں اور لاکھوں پتوں پر پڑتی ہیں تو اس تمام کثرت کے اندر صرف اس وحدۃ اوّلیٰ ہی کی ہستی کو دیکھتی ہے جس کے تنہا وجود کے اندر درخت کا ہر پتّا اور پتے کا ایک ایک ریشہ موجود تھا۔ درخت کی شاخیں آسمان تک پہنچ جاتی ہیں، اس کے ایک ایک پھل سے بے شمار بیج پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر بیج ویسا ہی ایک نیا درخت پیدا کر دیتا ہے، لیکن ارواحِ نباتیہ کی یہ پوری کائنات خواہ کتنی ہی زمین کی سطح پر پھیلے اور فضائے آسمانی میں مرتفع ہو، تاہم اس کے سوا کیا ہے جو زمین کے اندر ایک چھوٹے سے دانے میں پوشیدہ تھا؟

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (ابراہیم: ۲۵)

ہدایت الٰہی کے کلمہ طیبہ کی مثال یُوں سمجھو، گویا ایک مبارک اور پاک درخت ہے جس کی جڑ تو زمین کے اندر محکم ہے اور ٹہنیاں فضائے آسمانی میں پھیلی ہُوئی ہیں! اپنے پروردگار کی ربوبیت کے احسان سے اس نے ایسی نشوونما پائی کہ کبھی بے برگ و بار نظر نہیں آتا اور ہر وقت اس کی شاخیں پھلوں سے بامراد ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ مثالیں انسانوں کے فہم و موعظت کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ عقل و بصیرت سے کام لیں اور اللہ کی سچائی کی حقیقت کو سمجھیں!

کائنات خلت

وجودِ ابراہیمی کا مقام "خلت" "کلمہ طیبہ" کا ایک بیج تھا، جس سے "امتِ مسلمہ" کا "شجرہ طیبہ" نکلا اور بلاشبہ اس کی اصل زمین میں ثابت تھی اور ٹہنیاں فضا میں پھیل گئیں۔ ان ٹہنیوں کے پھیلاؤ اور ان کے برگ و بار کی کثرت و وسعت سے دراصل ایک "کائناتِ خلت" یا ایک "عالمِ ابراہیمی" متشکل ہوتا ہے، جس کا جغرافیہ اگرچہ زمین کے تمام گوشوں تک پھیل گیا، لیکن وہ مثل ایک دائرہ سعادت کے ہے اور اس کا مرکزی نقطہ "اسوۂ ابراہیمی" ہی کا پاک بیج ہے۔ پس اس تمام کائنات کی حقیقت اسی وقت واضح ہو سکتی ہے جبکہ اس کی اصل و اساس کی حقیقت واضح ہو جائے اور اس کا واضح ہونا فی الحقیقت سعادت و ہدایت انسانیت کی ایک مکمل روداد اور سرگزشت ہوگی۔

تاریخ اُمت مسلمہ

قرآن حکیم نے بار بار اور صاف صاف اعتراف کیا کہ اسلام ملتِ ابراہیمی ہے۔ اس بنا پر "امتِ مسلمہ" کا بہ حیثیت ایک ممتاز اور دارائے خصائص امت کے ظہور بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ہُوا۔ پس اسلام کی حقیقت اور امۃ اسلامیہ کی پیدائش و نشو کی تاریخ، دونوں اس پر

وف ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ کے سوانح و مقامات ایک صحیح و حقیقی ترتیب و نظم کے ساتھ ہمارے سامنے
جود ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے قصص و وقائع کا سب سے زیادہ اعظم و اہم حصہ حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ ہے اور
آن حکیم کی تفسیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس زندگی کی ایک ایسی سوانح عمری مرتب نہ ہو جائے جس کے تمام اصول
اب صرف قرآن حکیم سے ہی ماخوذ ہوں۔

افسوس کہ فن تفسیر کا جو ذخیرہ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، اس میں اس اہم اور اساسی موضوع کے لیے
ئی منظم سامان نہیں نظر آتا اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس یہ کہ ارباب تفسیر و تاویل میں ایک بڑا گروہ وہ نظر آتا ہے جو
سلام اور ملت ابراہیمی کے تعلق کو سمجھنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ختنہ کیا اور حج کے
ظاہری رسوم کی بنیاد ڈالی۔ یہی رسوم تھیں جن کے لیے خدا نے انھیں آزمایا اور کامیاب پاکر فرزدہ امامت دیا۔ گویا
س گروہ کے نزدیک یہی وہ ابراہیمی ورثہ تھا جو محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آیا اور بس یہی عوائد و رسوم تھے،
ن سے ملت ابراہیمی مرکب تھا! و ذالك مبلغهم من العلم!

اسوۂ ابراہیمی

اسوۂ ابراہیمی کے متعلق چند مبسوط مقالات وقتاً فوقتاً "الہلال" میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں
مختلف حیثیتوں سے اس "کائنات خلت" کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے، لیکن بحث و
نظر کا اصلی حصہ ابھی باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میں ترتیب و تنظیم پیدا کی جائے اور ایک مرتب سوانح زندگی مدون
کیے جائیں جن میں حیات ابراہیمی کے تمام مقامات ذهاب الی الله و وصول حقيقة دین فطری کے وقائع، اپنی اصلی
قرآنی ترتیب کے ساتھ آجائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کے جس قدر وقائع قرآن حکیم نے جابجا بیان کیے ہیں، ان میں سب سے
پہلے وہ مقام سامنے آتا ہے، جہاں پہنچ کر انھوں نے نسل انسانی کی امامت و پیشوائی کو اپنا منتظر پایا اور ان کی گروہ در
گروہ جماعتوں اور قوموں کے اندر ایک مخصوص و ممتاز "امۃ مسلمہ" کی نسل دیکھی جسے خدا نے تلاوت آیات اللہ و تزکیۂ
نفس، و تعلیم کتاب و حکمت کے لیے چن لیا تھا اور اس طرح انھوں نے کسی گری ہوئی عمارت ہی کو درست نہیں کیا
بلکہ خود ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھی اور اسی لیے وہ ہدایت و سعادت امم سے اولین ارضی مرکز کے بانی ٹھہرے؛

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۝ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا! (آل عمران: ۹۶)	بلاشبہ یہ حقیقت ظاہر ہے کہ سب سے پہلا گھر جو کرۂ ارضی پر ہدایت و سعادت انسانی کے لیے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو سرزمین مکہ میں تم دیکھ رہے ہو۔ یہی گھر الٰہی برکتوں کا سرچشمہ اور تمام جہان کے لیے مرکز ہدایت ہے۔ وہ اگرچہ بظاہر

پتھروں کی ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دیتی ہے ، لیکن
دراصل اس کے اندر خدا کی قدرت وحکمت اور دین الٰہی کے
نشوونما کی کھلی کھلی اور ناقابل انکار نشانیاں رکھی گئی ہیں - یہ
نشانیاں مقام ابراہیمی کی اس قدوسیت کو واضح کرتی ہیں جس
نے اسے تمام عالم کے لیے قبلہ ومصلیٰ بنا دیا! (جو کوئی اس
کے حدود میں آگیا وہ امن وحفاظت میں آگیا)

قرآن حکیم کی وہ تمام آیات کریمہ جن میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت للناس ، بناء کعبہ وقبلہ ، مومنین ، تکوین وعمران وادِ غیر ذی ذرع ، اتخاذ مقام ابراھیم مصلی ، دعائے ظہور امۃ مسلمہ اور التجائے بعثت " رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایاتک[1]" کا ذکر ہے ، اسی مقام کو واضح کرتی ہیں اور دراصل یہی وہ بقائے دوام ، رفع ذکر ، علوِ لسان صدق اور کلمۂ باقیہ ہے جس کی طرف جابجا قرآن حکیم نے اشارہ کیا :

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (البقرہ : ۱۲۹)[2]

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۔ (مریم : ۵۱)[3]

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (زخرف : ۲۸)[4]

یعنی انھوں نے ہدایت وسعادت کی ایک ایسی نسل پیدا کی جو کبھی فنا نہ ہوگی اور جس کی دعوت ہمیشہ باقی رہے گی اور فی الحقیقت یہی اعلیٰ ترین مرتبۂ خلقت اور منتہائے کمال انسانیت ہے / کما سیاتی ان شاءَ اللہ تعالیٰ ۔

نیز اس مقام کی تشریح سے یہ امر بھی واضح ہوجائے گا کہ اسلام اور ملت ابراہیمی کا تعلق کس سلسلے پر مبنی ہے؟
چنانچہ سب سے پہلے ہم اسی مبحث پر نظر ڈالتے ہیں :

سلسلۂ نبوت

نبوت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہو کر بخط مستقیم حضرت عیسٰی علیہ السّلام تک پہنچ کر رُک گیا تھا ، اس کی تکمیل میں صرف ایک آخری کڑی کی کسر رہ گئی تھی ۔ اس لیے جب آخری کڑی نے اس رُوحانی سلسلے کو مکمل کرنا چاہا تو تمام دنیا نے اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا ، لیکن اس نے نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے عہد اخوت کی تجدید کی نہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے رشتۂ مودت جوڑا نہ حضرت نوح

---

[1] خداوندا ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو اور وہ تیری آیتیں انھیں پڑھ کر سنائے ۔ [2] واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اسے برگزیدگی کے لیے چن لیا اور آخرت میں بھی اس کی جگہ نیک انسانوں کے زمرے میں ہوگی ۔ [3] ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی اور اپنی رحمت کی بخشش سے سرفراز کیا تھا نیز ان کے لیے سچائی کی صدائیں بلند کردیں [4] اور اس نے اسے اپنی قوم میں باقی رہنے والی بات بنایا تاکہ وہ رجوع کریں ۔

یہ السلام کی حیات دعوت کا نام لیا، بلکہ اپنے آپ کو صرف اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے آغوش غلت میں ڈال دیا اور
ی کو اپنی دعوت کا مورث اُولیٰ قرار دیا:

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (آل عمران: ۶۸)

دراصل ابراہیم کے قریبی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کا اتباع کیا اور یہ پیغمبر اسلام اور مسلمان بھی اسی کے سلسلہ میں داخل ہیں۔

جو لوگ ریگستان عرب کی اس موج ہدایت کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے تھے، ان کی تشنہ لبی نے یہ حال دیکھ کر چاہا
اصل منبع ہی کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیں۔ پس ہر طرف سے صدائیں اُٹھیں کہ ابراہیمؑ تو ہم میں سے تھا:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آل عمران: ۶۴-۶۷)

اے اہل کتاب! ابراہیم کے بارے میں کیوں بحث و مباحثہ کرتے ہو اور کیوں اس کوشش باطل میں پڑ گئے ہو کہ اسے یہودی یا نصرانی ثابت کرو؛ کیا تمھیں اتنی خبر بھی نہیں کہ توراۃ اور انجیل تو اس کے بعد نازل ہوئی ہیں؟ ان سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا وجود ہی کہاں تھا؟ تم ان چیزوں کے متعلق تو لڑ جھگڑ چکے، جن کا تم کو علم تھا، لیکن جن چیزوں کی تم کو خبر نہیں ان کے متعلق کیوں بحث کرتے ہو؟ اللہ کو اس کی حقیقت کا علم ہے اگرچہ تم مبتلائے جہل و بے خبری ہو۔ بلاشبہ ابراہیم نہ تو یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ وہ ایک ہی راہ مستقیم پر چلنے والا مسلم تھا۔ وہ تمھاری طرح مشرکوں میں سے نہ تھا۔

تاریخ اسلام کا عجیب وغریب واقعہ

درحقیقت یہ اسلام کی تاریخ اور اسلام کی نشوونما کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ اس نے نبوت و دعوت
ام کے تمام گزشتہ مراکز و مظاہر کو ترک کر کے صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے دامن میں پناہ لی، جس کا ہر گوشہ
خون کے چھینٹوں اور آگ کے شعلوں سے سُرخ ہو رہا تھا!

پھر کیا وہ صرف تعلقات رحمیہ کی تجدید کرنا چاہتا تھا؟ کیا یہ صرف اس لیے تھا کہ وُہ نسلاً حضرت ابراہیمؑ سے تعلق رکھتا تھا؟

لیکن اس نے تو خود اپنی لاڈلی بیٹی سے پہلے ہی دن کہہ دیا:

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

یا فاطمہ بنت محمد! انقذی — اے محمد کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی

نفسک من النار ، فانی لا املک لک ضرّاً و لا نفعا۔ ان لک رحما وسابلها ببلالها ۔ (ترمذی)

کوشش کر کیونکہ میں تیرے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا البتہ مجھ میں اور تجھ میں رحمی تعلقات ضرور ہیں۔ ان کو دنیا میں سرسبز رکھ سکتا ہوں مگر یہ تو دین کا معاملہ ہے۔

لیکن تمام دنیا اسی رشتۂ ہم نسبی میں اُلجھی ہوئی ہے۔ وُہ بیٹے کو باپ کی گود میں دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی ہے لیکن یہ نہیں سوچتی کہ نبوت کا روحانی خاندان دنیوی سلسلۂ نسب سے بالکل الگ ہے اور دعوتِ الٰہیہ کا رشتہ خون اور جسم سے مرکب نہیں ہوسکتا۔ اس کا گھرانا دوسرا ہے اور ہر پیغمبر صرف روحانی قابلیت ہی سے کسی سلسلے میں داخل ہوسکتا ہے۔

دو قسمیں

قرآن حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراک جنسی کی بنا پر تمام انبیا کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آتا ہے، لیکن بعض خصوصیات نوعی کے لحاظ سے اُس نے انبیاء کے جو مختلف طبقات قائم کر دیے ہیں ان میں دو سلسلے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔

ایک سلسلہ ان انبیاء موسسین کا ہے، جنھوں نے اپنی دعوت کے ذریعے سے نئی قومیتوں کی بنیاد ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لیے نہیں بلکہ از سر نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لیے آئے تھے۔

دوسرا سلسلہ انبیاء مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے جنھوں نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ امت صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی یا امتداد عہد کے نتائج مضلہ و استیلاء بدعات و محدثات سے اُسے نجات دلا کر فرض تجدید و احیاء ادا کیا۔

انبیاء موسسین

پہلے سلسلے کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وُہ تمام قدیم نظام، قدیم عقائد اور قدیم اخلاق و مقومات کو مٹا کر ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود و طبعیہ کے اثر سے الگ کر کے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشو و نما دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اس کی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے،

اَلَمۡ یَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۙ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَ الۡمُؤۡتَفِکٰتِ ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظۡلِمَهُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ۔

(توبہ: ۷۱)

کیا ان منکرین حق تک ان لوگوں کے نتائج اعمال کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ یعنی نوح، عاد، ثمود اور ابراہیم کی قوم، نیز مدین کے رہنے والے اور وہ بستیاں جن کی بستیاں الٹ دی گئیں (یعنی قوم لوط) ان سب کے پاس ہمارے پیغمبر دلائل اور نشانیاں لے کر آئے تاکہ وُہ ہدایت و سعادت حاصل کریں اور اپنی بداعمالیوں کے نتائج مہلکہ سے نجات پائیں۔ خدا اُن لوگوں پر ظلم کرنا نہیں

چاہتا تھا، پر افسوس کہ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا!

اس آیتِ کریمہ میں خداوند تعالیٰ نے اول حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ایک نئی "امۃ صالحہ" کی بنیاد رکھی اور ان کے بعد اُن جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن میں دعوت نوحی کے مجددین آتے رہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا جو حضرت نوحؑ کے بعد دوسرے دور فوقیت کے مصدر و بانی تھے، پھر ان کے بعد کی دعوت ہائے مجددہ کی طرف اشارہ کیا۔

دعوتِ نوحی انبیاء موسسین علیہم السلام میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت موسسہ سامنے آتی ہے جو پہلی صنف انبیاء میں بلحاظ تقدم عہد کے ایک مخصوص امتیاز رکھتے ہیں۔

انھوں نے ایک جدید قوم پیدا کی اور اس کو مذہبی امتیازات و مقومات کی آب و ہوا میں پرورش کرنا چاہا۔ جن لوگوں نے مذہب کی اس حبل المتین کو مضبوط پکڑا، عذاب الٰہی سے نجات پائی مگر جن لوگوں نے اس سر رشتہ حیات کو چھوڑ دیا، ہلاک ہو گئے اور باوجود رحمی و نسلی تعلقات کے خدا نے ان کو نوح علیہ السلام سے بیگانہ قرار دیا۔ ان کی دعوت کی بنیاد نسل اور جغرافیہ نہ تھا وہ ایک نئی قوم پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے خود ان کی نسل جسمانی رشتے کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا گھرانا اب وہی قوم تھی جو حق و سعادت کے رشتے میں منسلک ہو کر طیار ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ خود ہی اپنے پیدا کردہ خاندان ملت کا ایک رکن ہو گئے تھے۔ اگرچہ وما امن معہ الا قلیل[1]:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

(ھود: ۴۵-۴۶)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تیرے خاندان کو عذاب طوفان سے نجات دی جائے گی۔ تو احکم الحاکمین ہے تیرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ میرے لڑکے کو اس عذاب سے نجات دے کیونکہ وہ میرے خاندان میں داخل ہے! خدا نے کہا، اے نوح! جس کو تو اپنا اہل کہہ رہا ہے وہ تیرا اہل نہیں۔ تیرا گھرانا تو دراصل عمل صالح کا گھرانا ہے (جس کی دعوت دے کر تو ایک صالح قوم پیدا کرنا چاہتا ہے) جو اس گھرانے میں داخل ہوا وہ تیرا ہے اور جو اس سے نکل گیا وہ تیرا نہیں رہا بلکہ ان کے گھرانے کا فرزند ہو گیا جن کا عمل بد اس نے اختیار کیا۔ پس مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں دیا گیا۔ اے نوح! یہ نصیحت میں اس لیے کرتا ہوں تاکہ حقائق و اسرار الٰہی تجھ پر کھلیں اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جائے جو علم حقیقت سے محروم ہیں!

---

[1] اور نوحؑ کے ساتھ ایمان نہیں لائے تھے، مگر بہت تھوڑے سے آدمی۔ (ھود: ۴۰)

تشریح مزید اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ عذابِ طوفان سے بچنے کے لیے کشتی بناؤ۔ جب کشتی بن چکی تو فرمایا:

احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ۔ (ھود: ۴۰) کشتی میں تمام ضروری حیوانات و انواع کا ایک ایک جوڑا رکھ لو نیز اپنے گھرانے کے آدمیوں کو بھی سوار کر لو۔

لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا تھا جن کے متعلق پہلے فرمان ہو چکا تھا کہ اپنے کفر و تمرد کی وجہ سے وہ اس عذاب میں سے ضرور حصہ پائیں گے اور ان کے لیے کوئی طلب اور کوئی سوال مقبول نہ ہوگا:

الا من سبق علیه القول۔ (ھود: ۴۰) مگر ان لوگوں کو ساتھ نہ لو جن کی نسبت پہلے حکم ہو چکا ہے۔

وہ پہلا حکم یہ تھا کہ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا (ھود: ۳۷) یعنی جن لوگوں نے حق و عدالت سے انحراف کیا اور اپنی سرکشی و عدوان سے غضب ایزدی کے مورد ٹھہرے، سو ان کی بابت مجھ سے کچھ نہ چاہنا۔

لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو ان کے "اھل" و اقارب کے بچا لینے کا حکم دیا تھا، اور ان کا بیٹا بدرجہ اولیٰ لفظ "اہل" کے جسمانی مفہوم میں داخل تھا، اس لیے آپ کو جرأت ہوئی اور جناب خداوندی میں اسے اپنا "اھل" قرار دے کر سوال کیا۔ اس پر جواب ملا کہ انه لیس من اھلك۔ گو بظاہر وہ تمہارے "اھل" میں سے تھا، لیکن در اصل اسے تم سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل" میں سے وہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ سرے سے تمہاری قوم ہی میں داخل نہ رہا۔ بلاشبہ وہ تمہاری قوم اور تمہارے گھرانے میں سے تھا، لیکن اب تو تمہاری قوم دوسری قوم ہو گئی۔ تم نے حق اور راستی کی رُوح پیدا کر کے جو نئی قومیت صالحہ پیدا کی ہے، اب سے وہی تمہاری قوم، وہی تمہارا گھرانا، وہی تمہارے اہل ہیں۔ تمہارا رشتہ صرف اس نئی قوم ہی کا رشتہ اساس ہونا چاہیے۔ وہ رشتہ خون اور جسم کا نہیں بلکہ حق اور دعوتِ حق کی رُوح کا ہے۔ اسی رشتے میں منسلک کر کے یہ نئی قوم "دعوت نوحی" سے پیدا کی گئی ہے۔ تمہارے جسمانی تعلقات کے جو "اھل" اس قومیت میں داخل نہ ہوں، وہ تم سے کٹ گئے اور تمہاری جگہ "عمل غیر صالح" کی فرزندی میں داخل ہو گئے۔

قوت عظیمۂ ضلالت اس آیۃ کریمہ میں ایک اور بہت بڑا نکتہ پوشیدہ ہے اور ارباب فکر کو اس پر غور کرنا چاہیے صدیوں کے مذہبی عقاید، نسلاً بعد نسل کے پرورش یافتہ رسوم و عوائد، کسی پوری نسل اور آبادی کے جاگرفتہ اعمال اور ان سے بھی بڑھ کر یہ کہ تقلید و عصبیۃ جاہلیۃ کی بندش اور طبیعۃ ثانیۂ انسانیہ کا انجماد ضلالۃ انسانیہ کی ایسی مہیب قوتیں ہیں جن کے مقابل میں سمندر کی قہاری اور پہاڑوں کی صلابت وجسامت بھی کوئی چیز نہیں۔ سمندر انسان کو غرق کر دے سکتا ہے، مگر اس کی قہاری یہ قوت نہیں رکھتی کہ کسی پرورش یافتہ ضلالت انسان کو ایک چھوٹے سے چھوٹے رواج یا رسم کے چھوڑ دینے پر بھی آمادہ کر دے۔ تم نے دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے

بیٹے کو سیلاب و طوفان نے آگھیرا اور شفیق باپ بے اختیار پکار اُٹھا:

يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكَافِرِيْنَ۔ (ہود: ۴۲)

اے میرے نادان بیٹے! اب بھی وقت ہے ظالموں کا ساتھ چھوڑ دے اور ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا۔

مگر دیکھو، قومی اور جماعتی ضلالت کے اندر کیسا غیر متزلزل جمود، کیسا غیر متغیر جحود، کیسی ابلیسانہ جاہلیت اور کیسی غیر مفتوح بہیمی قوت ہے کہ باایں ہمہ معائنہ عذاب و ورود ہلاکت، وہ باطل پرستی کا رشتہ نہ توڑ سکا اُسی عصیانی گھمنڈ و کافرانہ تمرد کے ساتھ اس آخری دعوت نجات کو بھی رد کردیا، جو معائنہ عذاب سے پہلے اس کے اندر کا ابلیس تھا:

سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ (ہود: ۴۳)

اگر زمین پر طوفان آگیا ہے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں ابھی کسی پہاڑ کی بلندی پر جا پہنچوں گا وُہ مجھے پانی کی ہلاکت سے بچالے گا۔

یہی چیز ہے جس کو قرآن نے "قساوت قلب"، "جحود کفر"، "انطباع وجدان"، "ضلالت عقل"، "شقاوت مبین"، "وقر آذان"، "غشاوۂ بصر"، "غطاء قلب"، "اماتت فکر"، "حجاباً مستورا" اور "صمٌ بکمٌ عمیٌ فہم لا یبصرون" فرمایا ہے۔ انسانی ضلالت اور فطرت صالحہ کے تبدل و تغیر کا یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان "شرالدواب عند اللہ" ہوجاتا ہے۔ یہی وُہ مُہر ہے جو انسان کے دل پر لگ جاتی ہے تو پھر وہ کبھی حق کے لیے نہیں کھلتا اور یہی اس انسان کے لیے جو "احسن تقویم" پر پیدا کیا گیا تھا، "اسفل سافلین" ہے جس میں گر کر چارپایوں سے بھی بدتر ہوجاتا ہے، کیونکہ جانور اپنی فطرت اصلیہ پر قایم رہتا ہے پر انسان نے اپنی فطرت صحیحہ کو خارج کی ضلالت سے بالکل مسخ کردیا پس:

اولٰئك كالانعام، بل هم اضل، اولٰئك هم الغافلون۔

وہ مثل چارپایوں کے ہوگئے بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ یہی وُہ بدبخت ہیں جو بصیرت سے محروم ہوگئے اور غفلت ان کے حواس پر چھاگئی۔

خوفناک جمود

اس لیے کہ رسم و رواج، اِلف و عادات، تقلید و خرافات، ملکی و قومی اثرات و علایق اور نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والے عقاید و اعمال اس طرح ان پر حاوی ہوگئے اور اس طرح اُن کی طبیعت کو ان خارجی اثرات ضلالت سے انس و تعلق ہوگیا کہ خدا کی تمام بخشی ہُوئی قوتیں اور عطا کردہ حواس اب اُن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ وُہ اپنی آنکھیں کھو کر اب ان کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے کانوں کو بہرا کرکے ان کے کانوں سے سنتے ہیں، اپنی فکر کو معطل کرکے ان کی عقل سے سمجھتے ہیں۔ پس اگرچہ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر نہیں دیکھتے۔ اگرچہ کان ہیں مگر نہیں سُنتے۔ اگرچہ عقل ہے، مگر نہیں سوچتے: لهم قلوب لا يفقهون بها، ولهم اٰذان لا يسمعون بها، ولهم اعين لا يبصرون بها،

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ وَعَلٰى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۔ (بقرہ : ٧)

اب ان کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کو ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے ان کے لیے یکساں ہے۔ تم انھیں نتائج اعمال سے ڈراؤ تو، اور نہ ڈراؤ تو، وہ کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ کسب ضلالت کے مُہر لگا دی۔ ان کے کان بند ہوگئے۔ ان کی آنکھوں پر جہل و قساوت کا پردہ پڑ گیا، اب اندھے کے آگے خواہ کتنے ہی چراغ روشن کرو، وہ روشنی نہیں دیکھ سکتا، اور بلاشبہ یہ بڑی ہی بدحالی ہے جو ان کے واسطے مہیا ہوگئی!!

علت اصلی

اس کی علت اصلی یہی ہے کہ صدیوں کے رسوم و عادات اور عقاید و اعمال کی زنجیروں کو توڑ کر ایک نئی حیات فکری و عملی کا اختیار کرنا اور جس آب و ہوا سے عمل و اعتقاد میں بچپنے سے لے کر بڑھاپے تک دماغ پرورش پا چکا ہے، یکایک اس سے باہر آجانا، دراصل انسان کے لیے ایک ایسی راہ کی دعوت ہے، جو گویا ایک نئے جسم، نئے دماغ، نئی فکر، نئے حواس میں مبدل ہوجائے۔ اپنی ہر پچھلی مالوف و محبوب چیز سے ہجر و فراق بلکہ قطع علایق کر لینے اور اپنی تمام گزشتہ مالوفات و معمولات و مشغولات کو بھول جانے، غرضکہ از سر نو پیدا ہونے اور ایک نشۂ ثانیہ میں سے گزرنے کی طرف بلاتی ہے اور ایسا کرنا فی الحقیقت انسانی ارادے کے لیے زندگی کا سب سے بڑا مشکل کام ہے، جو اس کے سامنے پیش ہوسکتا ہے۔

انسان جو اکثر انفعال و تاثر ہے، جس کے دامن کسب کے لیے ہستی کا ایک ایک ذرہ کانٹا ہے، جو دنیا میں صرف کھوتا ہے، دیتا، لٹاتا اور اٹکتا ہی ہے اور باہر اثر و فعل کا جب کوئی غبار اڑتا ہے تو اس کے ایک ایک ذرے کو اپنے دامن و آستیں میں محفوظ کرتا ہے، غور کرو اس کے لیے یہ دعوت تجدید، یہ آرزوے تحوّل، یہ صداے تاسّس جو سر سے لے کر پاؤں تک اسے یکسر بدل دینا اور نیا بنا دینا چاہتی ہے، جو اسے ہر محبوب و مالوف شے سے چھڑاتی اور ہر ایسی چیز سے جوڑنا چاہتی ہے جو اس کی نظروں میں اتنی ہی مبغوض ہے جتنی پہلی محبوب تھی، کیسی مشکلوں کی پکار، کیسی سختیوں کی درخواست، اور کس درجہ صعوبتوں اور مصیبتوں کی دعوت ہے؟

باب ۱۲

کائناتِ خُلّت

ما طفل کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

—(۲)—

اجداد کی اندھی تقلید

اس نے اب تک یہ دیکھا کہ چاند اور سورج اس کے دیوتا ہیں اور ایک گھر جو مقدس ناموں سے بنا دیا جائے اس کا مستحق ہے کہ اس کے آگے سجدہ کیا جائے۔ وہ صدیوں سے نسلاً بعد نسل سنتا آیا ہے کہ جب پتھر سے ایک شفیع و متوسل دیوتے کی مورت تراش لی جائے تو پتھر سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت نہیں۔ اس نے ہمیشہ اپنے قابلِ عظمت آباؤ اجداد کے متعلق، جن کے خون کی گرمی سے اس کی عصبیت کی ہر ایک رگ دہک رہی ہے، یہی سنا، یہی معلوم کیا اور اسی کی صدا و فعل میں پکار رہا کہ سچائی نسل و وطن اور بڑے بوڑھوں کی پیروی و تقلید میں ہے اور باپ دادا نے جو کچھ کیا، صداقت اور راست بازی صرف اسی میں ہے۔ انھوں نے بھی عجیب و غریب مقدس عقلوں سے جس قدر اعتقادات و اعمال اپنی اولاد کے لیے یادگار چھوڑے، وہ پہلوں کی طرف سے پچھلوں کے لیے ایک پاک امانت ہیں جن سے ایک ذرّے کا بھی ضائع کرنا، عزتِ نسلی و قومی کا ہلاک کرنا ہے۔

داعیانِ حق

اب ایک نئی صدا اچانک اٹھتی ہے۔ تقلیدِ آباؤ رسوم کی وہ سطحِ ساکن جو صدیوں سے منجمد تھی، یکایک حرکت میں آتی ہے اور ایک انسان جو نسلاً و وطناً یکسر قومی عقاید و افعال اور عادات و رسوم کا مخلوق ہوتا ہے اور جو کہیں باہر سے نہیں آتا تا مجہول الحال ہونے کی وجہ سے پُرہیبت ہو، بلکہ ہمیشہ "من انفسھم" ہوتا ہے یعنی انہی میں کا اور انہی جیسا، اپنی جگہ سے ہلتا ہے اور کسی نامعلوم و مافوق الفہم اثر سے منقلب ہو کر چلا اٹھتا ہے:

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

(الاعراف: ۶۲-۶۳)

میں تم تک اللہ کے بھیجے ہوئے پیغام پہنچاتا ہوں۔ تمھاری بھلائی اور خوش حالی کے لیے تمھیں نصیحت کر رہا ہوں، اور یقین کرو کہ اللہ کی ہدایت و توفیق سے میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے! آہ، کیا تمھیں اس قانونِ الٰہی پر اچنبھا ہوتا ہے کہ تم ہی میں سے اللہ ایک شخص کو سچائی کی دعوت کے لیے چن لے اور اس کے اندر اپنی ہدایت اتار دے، تاکہ وہ تمھیں بدعملیوں کے نتیجے سے ڈرائے تاکہ تم آنے والی تباہیوں اور بدحالیوں سے

بچو، اور تاکہ تم پر غضب کی جگہ رحمت ہو؟

روحانی تقلب کی دعوت

لیکن یہ پیغام الٰہی جس کا وہ اعلان کرتے ہیں، کیا ہوتا ہے؟ یہ تبدل و تجدد روحانی اور تقلب و تحول معنوی کی ایک دعوت ہوتی ہے، جو اُن سے اُن کی تمام پچھلی محبوبات و مالوفات کو چھین لینا چاہتی ہے اور تقلید آباؤ و رسوم و عادات و مالوفات کے لیے پیغام ہلاکت اپنے اندر رکھتی ہے؛

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف: ۳۹ ـ ۴۰)

کچھ تو خدا کے بخشے ہوئے نور بصیرۃ سے کام لو اور سوچو کہ پرستش و غلامی کے لیے بہت سے معبود بنا لینا بہتر ہے یا ایک ہی خدائے واحد و قہار کا ہو رہنا؟ یہ جو تم نے اپنی زندگی کے لیے خدا کے سوا اور بہت سے چوکھٹ بنا رکھے ہیں اور ان کا رشتہ اس درجہ مضبوط پکڑ رکھا ہے تو بتلاؤ ان کی حقیقت بجز اس کے کیا ہے کہ محض چند وہم ساز نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے اپنے دل سے گڑھ لیے اور گمراہانہ اعتقادات اور نسلاً بعد نسل کی تقلید و رسم پرستی نے ان کے اندر ہیبت و قدوسیت پیدا کر دی؟ حالانکہ اس خدا نے کہ پرستش و سلطۃ اعلیٰ کی تمام قوتوں کا مصدر اسی کی ذات ہے، نہ تو ان کے اندر کوئی طاقت رکھی اور نہ ان کی معبودیت و محبوبیت کے لیے کوئی حکم اتارا۔ یقین کرو کہ یہ تمام ماسوی اللہ قوتیں جنھیں تم نے طرح طرح کا حکم اور ہر قسم کی سلطانی تمام کائنات ہستی ہیں نہیں مگر صرف اللہ کے لیے۔ جس نے ہماری فطرت کے اندر یہ بات ودیعت کر دی ہے کہ بندگی نہ کریں مگر صرف اسی کی اور سر نہ جھکائیں مگر صرف اسی کے لیے۔ یہی فطرت صالحہ دین قیم یعنی ہدایت انسانی کا صحیح اور مستقیم راستہ ہے۔ پر افسوس کہ اس ضلالت آباد انسانی میں بڑی تعداد ان کی ہو گئی جن پر اس حقیقت فطریہ سے جہل چھا گیا۔

اسے دعوت

لیکن اب غور کرو کہ اس دعوت کا اصلی منشا زیادہ کھلے لفظوں میں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ جو کچھ انسانوں نے اب تک دیکھا، اُسے اَن دیکھا سمجھیں۔ جو کچھ انھوں نے ہمیشہ سنا، اسے یکسر [illegible] جائیں۔ جو کچھ اب تک انھوں نے سمجھا اور یقین کیا، اس سے یک قلم باہر آجائیں۔ یہ گویا نسلی و قومی افکار و عقاید کی [illegible]انہ ویرانی کی پکار ہوتی ہے، جو اُن کے اس گھر کو اجاڑنا چاہتی ہے، جس میں صدیوں تک پلے اور ایک نیا گھر [illegible]رنا چاہتی ہے جس کے در و دیوار سے انھیں کوئی الفت نہیں۔

[illegible] یہی وجہ ہے کہ جس طرح دعوت و ہدایت نے ہمیشہ اور ہر عہد میں یکساں طور پر اجتہاد فکر و نظر کی پکار بلند کی ہے، [illegible] اسی طرح انسانی ضلالت کی جانب سے بھی ہمیشہ الف و عادات اور تقلید آبا و رسوم کے شغف و محبوبیت کا جواب ملا؛

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝

(سورۂ زخرف: ۲۳)

اے پیغمبر! انسان کی قومی و جماعتی گمراہی کا ظہور کچھ تمھارے ہی سامنے ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا عام اور یکساں حال ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے، تمھیں اپنے سے پہلے کوئی بستی ایسی نظر نہیں آئے گی جس میں اللہ کے طرف سے ڈرانے والے آئے ہوں اور اُنھوں نے اپنی قوموں کے بڑوں سے یہ جواب نہ پایا ہو کہ "ہم نے تو اپنے باپ دادا کو اسی قومی طریقے پر چلتے پایا اور ہم بھی انھیں کے طریق پر چلیں گے۔

پس انسان کے لیے اس تغیر و تجدید سے بڑھ کر اور کون سی کٹھن راہ ہو سکتی ہے؟ اور کاروبار دعوت و تبلیغ میں [illegible]سے زیادہ یکسر مشکلوں اور صعوبتوں سے بھرا ہوا، عقل بر انداز اور ثبات افگن کام اور کون سا ہو سکتا ہے؟

[illegible]بروں کا اصلی مقام

اگر تم اس حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرو اور اس کی "تاسیس فکری و عملی کا ایک ایک جزئیہ اپنے سامنے لاؤ تو تم پاؤ گے کہ کائنات اعمال انسانی میں حیرانیوں اور اچنبھوں [illegible]خری نقطہ ہے۔ محض وہ انسانی قوت جو مادہ کی ترکیب و اثرات سے متقوم ہوئی ہے، اس کام کے لیے کچھ نہیں کر سکتی [illegible]ت تک انسانی ضلالت سے لڑنے کے لیے انسان نہیں، بلکہ انسانیت سے کوئی مافوق قوت نہ اتر آئے، اس [illegible]ت تک انسانی ضلالت ہار نہیں سکتی۔ اس معرکے میں ایک طرف تنہا ایک انسان اور دوسری طرف پوری نسل، پوری [illegible] پوری آبادی بلکہ پوری دنیا ہوتی ہے۔ پس اس آسمان کے نیچے کون سی عقل ہے جو یہ مان سکتی ہے کہ ایک انسانی [illegible]ستی پوری آبادی کو، جو بلحاظ انسانیت کے اس سے مساوی قوت رکھتی اور بلحاظ تعداد کے اس سے ہزار چند ہے، [illegible] اپنی انسانی قوت ہی سے شکست دے سکتا ہے؟

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۷۱-۱۷۳)

اور ہم نے اپنے ان بندوں کے لیے جن کو ہم حق کے اعلان اور ہدایت کی پکار کے لیے دنیا کے سامنے بھیجتے پہلے ہی سے یہ قانون قرار دے دیا ہے کہ فتح و کامیابی اُنہی کو ہوگی۔

پس انسانیت سے مافوق قوت، وہ قوت ربانیہ ہے جو اُترتی ہے اور کسی ایک انسان کو اپنا مہبط و مورد بنا کر اس میں سے اُبھرتی اور اس کے اندر چمکتی ہے۔ پھر اس انسان کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے تو کسی طاقت سے نہیں جُھک سکتا،

ید اللہ فوق ایدیھم (الفتح: ۱۰) اور اس کا عزم خدا کا عزم بن جاتا ہے۔ پس جب وہ اعداء پر تیر افگنی کرے تو خدا کہتا ہے کہ یہی سنے کی:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (انفال: ۱۷)

اور جب تو نے اے محمد دشمنوں پر تیر چلایا تو دراصل تیرا چلانے والا نہ تھا بلکہ خود اللہ چلا رہا تھا۔

عود الی المقصود

تمہید مندرجۂ صدر سے تم پر واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان کی جس اجتماعی ضلالت کا مقابلہ انبیاء کرام کو کرنا پڑتا ہے، وہ اپنے اندر کیسی عظیم الشان اور غیر مفتوح قوۃ رکھتی ہے؛ اور جب تم نے تاریکی کی طاقت کا اندازہ کر لیا تو اب اسی سے اس کا بھی اندازہ کر لو کہ ایسی طاقت ور تاریکی کے دُور کرنے کے لیے کیسی طاقت ور روشنی مطلوب ہے؛ تم نے دیکھ لیا کہ دشمن کی طاقت کا کیا حال ہے؛ اب سوچو کہ ایسے قوی دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے کیسے طاقتور گرز اور کیسے دست و بازو کی ضرورت ہے؛

انبیاء کے آلات و اسلحہ مادی نہیں ہوتے۔ مادی ساز و سامان کے لحاظ سے وہ بالکل فقیر و تہی دست ہوتے ان کے ساز و سامان کے ڈھالنے کا کارخانہ دوسرا ہے۔ وہ جن آلات و اسلحہ کے ساتھ اس معرکۂ ضلالت و ہدایت میں قدم رکھتے ہیں، ان میں اوّلین حربہ "قربانی" کا ہوتا ہے۔

انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعے کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث متواصل علایق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیاء کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات قدیمہ کو مٹا کر، ایک نئے روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر ان کی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقتور حربہ طیار کر لیں۔

اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبار دعوت میں سب سے زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کس طرح

ان الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اُجاڑ دیا اور اُسی عمارت کا ایک گوشہ بن گیا، جس کی چھت کے نیچے ہمیں دے رہا ہے!

رشتۂ عمل صالح

چنانچہ انبیاء کرام اور رسل عظام کے اُس سلسلے میں جنھوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی، سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السّلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ ان کی دعوت اسی قسم کی دعوت تھی، اس لیے ضرور تھا کہ اس اوّلین قربانی کا بھی وُہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔

پس آیت کریمہ مندرجۂ صدر میں جب انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتے کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔ اگر تمھارا بیٹا "عمل صالح" کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا، جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وُہ تمھارا عزیز تھا، لیکن اس نے "عمل صالح" کی جگہ "عمل غیر صالح" سے رشتہ جوڑا۔ پس اب اس کا ذکر بیکار ہے اور یہ بناء قومیت کا وُہ ناموس الٰہی ہے، جس کا تمھیں علم ہونا چاہیے؛

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ۔ (ہود: ۴۷)

حضرت نوح نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی، میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا۔

باب ۱۳

کائناتِ خلقت

طفل کم سواد و سبق قصہ ہاے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

—(۳۰)—

تاسیس اُمت صالحہ کا دوسرا عہد

حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر و جہل انسانیت اس سے دست و گریبان رہے اور اس لیے :

ما اٰمن معه الاقلیل۔ (ہود : ۴۰) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی مگر ایک چھوٹی جماعت

تاہم جس امت صالحہ کی اس عہد اُولیٰ میں بنیاد پڑی تھی ، وہ ضائع نہ گئی اور خدا کا کوئی حکم دعوت ضائع نہیں جا سکتا ۔ اگرچہ خود حضرت نوحؑ پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی مدنیۃ و عمران کا بالکل عہد طفولیت ، بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا اور مذہب کا سلسلۂ ارتقا ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا ، لیکن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے صدیقین متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقاید و اعمال بھی لے گئی ۔ اس طرح دعوت نوحی کا ایک عالمگیر عہدِ نمو شروع ہوا اور طوفان کے بعد انسانی ہدایت کا سررشتہ عرصہ تک اسی کے ہاتھ رہا ۔ وہ ہدایت الٰہیہ کی ابتدائی شعاعیں ، جنھوں نے طوفان کے بعد زمین کے مختلف حصص کی تاریکیوں کا مقابلہ کیا اور اجتماعی ضلالت کے ازمنۂ اُولیٰ میں ہمیشہ ظلمت ارضی کے لیے تنہا سراج منیر رہی ، دراصل حضرت نوحؑ ہی کی دعوت اور اسی دعوت کے مجددین و مصلحین کا سلسلہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی جو زندگی طوفان کے بعد سے شروع ہوتی ہے ، اس کا ذکر قرآن حکیم نے ان لفظوں میں کیا ہے :

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (ہود : ۴۸)

حضرت نوح طوفان کے بعد جب زمین پر دوبارہ قدم رکھنے لگے تو انھیں بشارت دی گئی کہ اس اُترنے اور قدم رکھنے میں سلامتی اور برکتیں رکھ دی گئی ہیں ۔ اے نوح تجھ پر ، تیرے ساتھیوں اور صدیقوں پر ، اور تیرے ساتھیوں سے جو امتیں پیدا ہوں گی ان سب کے لیے

برکت الٰہی کی بشارت ہے۔ ہاں! ان آنے والے گروہوں میں وہ قومیں بھی ہوں گی جو ابتدا میں تو راہ حق پر قائم رہ کر امن و فرصت پائیں گی، لیکن بعد کو گمراہ ہو کر ہمارے عذاب کی مستحق ٹھہریں گی جو بہت ہی سخت عذاب ہوگا

ایک ضروری نکتہ اسی طرح سورۂ الصّٰفّٰت میں فرمایا کہ:

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ۔ (الصّٰفّٰت: ۷۷)

ہم نے حضرت نوح کی ذرّیت ہی کو بقا دی کیونکہ وہی ایک صالح قوم پیدا ہوئی تھی اور اسی طرح بعد کی تمام آنے والی قوموں اور نسلوں کے لیے دعوت نوحی ہی کو وسیلۂ ہدایت قرار دیا۔ پس تمام جہانوں، تمام قوموں اور تمام نسلوں میں سلام ہے نوح کے لیے جس کا وجود تمام عالم کی ہدایت و دعوت کا مرکز تھا!

یہاں یہ واضح رہے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں ایک خاص ترتیب و اخذ نتائج کے ساتھ متعدد انبیاء کرام کے بعض اہم وقائع حیات اور مختارات مواعظ بیان کیے گئے ہیں اور عموماً انداز بیان یہ ہے کہ آخر میں ان پر سلام بھیجا جاتا ہے، لیکن ان سب میں حضرت نوحؑ کے تذکرہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے "سلام" کے ساتھ تو "فی العٰلمین" کا لفظ فرمایا ہے: سلام علی نوح فی العٰلمین، لیکن اور انبیاء کی نسبت صرف "سلام" ہی پر اکتفا کیا ہے مثلاً "سلام علیٰ موسیٰ و ھارون"۔ "سلام علی الیاسین" یعنی اور انبیاء کے متعلق تو صرف یہ ہے کہ ان پر سلامتی ہو یا ان کے لیے فرمانِ سلام ہے لیکن حضرت نوحؑ کی نسبت فرمایا کہ تمام عالموں میں یعنی تمام نسلوں، تمام قوموں، تمام ملکوں میں ان کے لیے اعلان عام سلام کا ہے!

پہلی مکمل دعوت یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کرنے کے لیے نہ تھی، بلکہ وہ اس قسم دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوت دینی پر قائم ہوتی ہے۔ پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوراء رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا، نوع انسانی کا ہر حصہ، اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔

حاصل بیانات بالا یہ کہ سلسلۂ ارسال رسل و شرائع میں سب سے پہلی مکمل دعوت، جس نے نئی امت پیدا کی، حضرت نوحؑ کی دعوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ہر جگہ اس سلسلے کو حضرت نوحؑ ہی سے شروع کیا ہے۔ یہ دور عرصے

تک بھاری رہا اور دنیا کے دُور دراز گوشوں تک پھیلا ۔ انبیاء و مجددین آتے رہے اور ان ضلالتوں کے مقابلہ میں جہاد کرتے رہے ، جو دعوت نوحی کی روشنی کو معدوم کرنا چاہتی تھی ، لیکن چونکہ ابھی انسان مدنیۃ و عمران کے ابتدائی حصّے میں تھا ، اس لیے شریعتِ الٰہیہ بھی اپنے سلسلۂ ارتقاء کی ابتدائی منزلوں سے آگے نہیں بڑھی تھی ۔

یہاں تک کر انقلاب عالم نے ایک نیا صفحہ اُلٹا اور وُہ وقت آگیا جب ایک دور ختم اور دوسرا دور شروع ہو۔ پر مواسم الٰہیہ کا بالکل ایک نیا موسم تھا ، جو تمام فضاء انسانیت پر چھانے والا تھا اور دنیا نے اب اتنی ترقی کر لی تھی کہ " عالم نوحی " سے مرتفع ہو کر " کائنات خلت " میں داخل ہو : وکان امرًا مقضیا !۔

دعوت ابراہیمی

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کی کائنات ہدایت کا دوسرا دور دعوت شروع ہُوا ۔ اس دور کا مصدر و مقصد حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا وجود مقدس تھا ۔

حضرت ابراہیمؑ ، حضرت ہُودؑ یا حضرت صالح علیہما السلام کی طرح پچھلی دعوتوں کے احیاء و اصلاح کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ ٹھیک ٹھیک مثل حضرت نوحؑ کے ایک نئے دور ہدایت کے موسس اور ایک نئی امتِ صالحہ کے پیدا کرنے والے تھے ۔ اس امت صالحہ کے لاتعد ولاتحصی افراد ان کی دعوت کی وحدت اعلیٰ میں مضمر تھے ۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا ۔ (النحل : ۱۲۰)

یقیناً حضرت ابراہیم کا وجود ایک پُوری امت تھا جو ان کی دعوت سے پیدا ہونے والی تھی ۔ صرف اللہ ہی کے نام پر جینے والی اور مرنے والی اور ایک ہی مستقیم و فطری راہ ہدایت پر عامل !!

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے حضرت نوحؑ کی مخصوص صف میں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کو جگہ دی ، اور ان کو حضرت نوحؑ کی طرف منسوب کیا ۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الصّٰفّٰت : ۸۳ ، ۸۴)

اور حضرت نوح ہی کی جماعت میں سے حضرت ابراہیم بھی ہیں جب کہ وُہ اپنے پروردگار کے حضور " قلب سلیم " کے ساتھ حاضر ہوئے ۔ الخ

اس آیت سے پہلے حضرت نوحؑ کا ذکر تھا ۔ فرمایا کہ انہی کی جماعت میں سے یا انہی کے طریق تاسیس امم و اصول تبلیغ شریعت جدیدہ پر چلنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے ۔

تمام قرآن میں کسی نبی کو بھی حضرت نوح کا " شیعہ " یا تبع نہیں کہا ہے ۔ صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کو ان کی طرف منسوب کیا کیونکہ حضرت نوحؑ نے نئی قومیت کی بنیاد رکھی تھی اور یہی مشن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی تھا ۔

مماثلت اعمال و نتائج طوفان کے بعد کی تمام اقوام حضرت نوحؑ ہی کی دعوت کی ذریت و نسل تھی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم کے بعد کے تمام سلاسل ہدایت و شعوب و اقوام صالحہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت پر آکر ختم ہوتے ہیں اور ان سب کا مرکز وجود ابراہیمی ہی ہے۔

طوفان کے بعد جس قدر ہدایت الٰہی کی روشنی پھیلی اور جتنی قوموں میں عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ کا ظہور ہوا، وہ سب کی سب حضرت نوحؑ ہی کی بنا کردہ دعوت کی شاخیں تھیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے بعد جس قدر شریعت الٰہیہ کو قیام ہوا اور حق و عدالت کے عقائد و اعمال کی خدمت جن جن قوموں نے انجام دی، وہ سب کی سب حضرت ابراہیمؑ ہی کی قائم کردہ دعوت، سلسلے اور تبعات تھے۔

دعوت نوحی نے زمین کی وراثت و خلافت کے لیے ایک اُمت پیدا کی، اور وہ مختلف شکلوں، مختلف لباسوں، مختلف گوشوں اور مختلف اثرات قوم و مرز بوم کے ساتھ گردش میں رہی۔ نقطہ اس کا ایک ہی تھا مگر دائرہ کی وسعت نے لاکھوں رقبوں اور کروڑوں نفوس کو اپنے اندر لے لیا تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا نقطۂ خلت نمایاں ہُوا اور اس کے دائرے کے اندر کتنی ہی قومیں، کتنی ہی نسلیں اور کس قدر بے شمار انسانی تعداد سمٹ آئی۔ یہی ایک قوت موسسہ ابراہیمیہ تھی، جو مختلف گوشوں، مختلف شکلوں، مختلف ملکی و قومی اثرات و انفعالات کے ساتھ نشو و نما پاتی اور اپنا فعل کرتی رہی۔

وہ ایک ہی دعوت نوحی تھی جس نے اپنے دور فعل و نشو میں کتنے ہی نام پائے اور کتنی ہی مختلف شکلوں پر اپنا مرکزی فیضان جاری رکھا؛ وہ کبھی اپنے اصل کے نام سے شریعت نوحؑ تھی، پھر اپنی تجدید و احیاء کے دور میں آ کر کبھی حضرت ہودؑ کی پکار، کبھی حضرت صالحؑ کی فریاد اور کبھی ان بے شمار داعیان حق کا دعوۂ حق تھی، جن کے نام ہمیں نہیں بتلائے گئے!

وہ ایک ہی امت صالحہ تھی جس نے اوّلین و حقیقی شکل اُمتِ نوحی کی پائی۔ پر جب پھیلی اور متفرق ہُوئی تو کبھی قوم ثمود کے ضلالت آباد کا ایک گوشۂ ہدایت تھی، کبھی عاد کی آبادیوں میں چند مسکینوں اور مظلوموں کا جھونپڑا تھا، کبھی مابین النہرین کا ایک پاک گھرانا، جو اپنے وطن و قوم کی خباثتوں پر ماتم کرتے کرتے تھک گیا تھا، اور کبھی اصحاب الایکۃ کے چند افراد مومنین اور تبابعۂ یمن کے عظیم الشان تمدنوں میں دعوت نوحی کی ایک صدائے بازگشت: کلٌّ کذب الرسل فحق وعید۔ (ق، ۱۴)[1]

دعوت ابراہیمی اور وحدت خلت ٹھیک ٹھیک اسی طرح دعوت ابراہیمی کی "وحدت خلت" بھی نمایاں ہوئی اور اس نے کثرت و تعینات ہدایت کی کتنی ہی مختلف شکلیں،

---

[1] سب نے رسولوں کو جھٹلایا، پس میرا وعدہ عذاب پورا ہوا۔

مختلف صدائیں اور مختلف کرشمے پائے۔ وہ ایک ہی حسن وجمال خلت کبریٰ تھا جو اپنی اصل شکل میں تو "ابراہیم" کے نام سے آیا، پر اس کے بعد محبوبیتوں کے کتنے ہی مختلف لباس پہنائے گئے اور حسن الٰہی کی کتنی ہی مجلسوں میں کتنے مختلف نقابوں کے ساتھ اس کی نمایش ہوئی؛ وہ اپنے اولین ظہور میں اگرچہ قربانی کی ایک چھری تھی جو جگر گوشے کے گلے پر پھیرنے کے لیے تیز کی گئی، لیکن اپنے دوران وسیران نشوونما میں کبھی چشم یعقوبؑ کا پاک آنسو بن کر نمودار ہوئی جو فراق یوسفی میں بہا اور کبھی خاندان اسحاقؑ و یعقوبؑ کی ایک مقدس وصیت اسلامی بن ظاہر ہوئی، جس نے ملت حنیفی کو آنے والے عہد میں منتقل کیا۔ وہ کبھی خاک مصر کے ایک عیش کدۂ شباب کے اندر "معاذ اللہ! انّ ربی احسن مثوای، انہ لا یفلح الظٰلمون[1]" کی صدائے نبوت تھی، کبھی قیدخانۂ مصر کے اندر دین قیم کا ایک جامع وعظ کہ "ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القهار[2]"، پھر عشق وجستجوئے حقیقت کا وہ بے چین قدم جو بیابان مدین کی وادی مقدس میں آگ کے لیے والہانہ دوڑا اور فطرت نبوت کا وہ سرجوش ہدایت جس نے "انی انا اللہ" کی صدائے عشق نواز پر لبیک کہا، گو اپنے عہد میں "حقیقت موسوی" کا ایک مقام تھا، پر دراصل اس کے اندر بھی حقیقت ابراہیمی ہی کارفرما تھی۔ پھر ظہور صداقت کا وہ عہد اعظم جس نے سرزمین مصر کے ظلم و استبداد کو شکست دی اور نسل اسرائیلی کو فراعنۂ مصر کی غلامی سے نجات دلائی، اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کے "ثعبان مبین" کا کرشمہ تھا، لیکن یہ عصائے موسوی کی قوت بھی وہی قوت تھی جو اس سے پہلے "حجۃ ابراہیمی" بن کر کالڈیا کے استبداد نمرودی کے سامنے چمکی تھی۔ پھر دیکھو، وہ اسرائیلی قدوسیت جو مقدس داؤدؑ کی الٰہی نغمہ سرائیوں کے اندر سے زمزمہ پیرا ہوئی اور وہ عشق الٰہی کی سرمستی جس نے زبور کے پاک گیتوں کے اندر سے اپنے خداوند کو پیار کیا، دراصل اسی عشق خلیلی ہی کی ایک تڑپ تھی جس نے اپنے محبوب کی راہ میں اپنے بیٹے تک کو قربان کر دینا چاہا تھا۔ وہ اسرائیلی عظمت وجمال کا تخت جس پر حضرت سلیمانؑ نے شہنشاہی کی، وہ سچائی اور حقانیت کی شمشیر جو طالوت کے قبضہ میں چمکی، وہ مجددین اسرائیلین کا عظیم الشان سلسلہ جس نے یہودیوں کی ضلالتوں کا مختلف قرون اسرائیلیہ میں مقابلہ کیا، گو دور اسرائیلی کے سلسلے کی کڑیاں ہیں، مگر دراصل ان کے اندر بھی اسی پہلی کڑی کی روح اعلیٰ کام کر رہی تھی جس نے کبھی کالڈیا کے سب سے بڑے بت کو توڑا تھا اور کبھی ایک ریتلی سرزمین میں ہدایت ارضی کا مرکز قائم کیا تھا۔ وہ دانیالؑ نبی کا وعظ حق جس نے بابل کی دیواروں کو ہلا دیا، وہ یسعیاہ نبی کا نوحہ جس نے یروشلیم کی تباہی پر اپنے دل وجگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، وہ یرمیاہ نبی کا ماتم جس نے خداوند کے تخت کو غیروں کے پاؤں تلے پامال ہوتے دیکھا اور اس کی تاب نہ لا سکا، وہ پاک حزقی ایلؑ کا مرثیہ جس نے خداوند کے ملک کی محکومی و غلامی پر برسوں خون

---

[1] معاذ اللہ (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی) تیرا شوہر میرا آقا ہے اس نے مجھے گھر میں جگہ دی ہے (میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا) اور حد سے گزرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ [2] کیا جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے

کے آنسو بہائے اور نبوت کی آنکھوں سے رویا کہ اسرائیل کی عورت نے اپنے خاوند کو چھوڑ دیا اور غیروں سے لگاوٹ کی۔ وہ ذکریا کی پیغمبرانہ فغاں سنجی جس نے بیابانِ قدس کے ایک ایک ذرّے کو خونبار بنا دیا اور خداوند کے تخت کی تذلیل و تحقیر پر زخمی انسانوں کی طرح چلّایا اور تڑپا۔ پھر بالآخر بیابان کا وہ مقدس سیاہ پوش جس نے آسمان کی بادشاہت کی منادی بلند کی اور کہا کہ راہ صاف کرو کیونکہ آنے والا بہت قریب آچکا ہے۔ سو یہ سب کے سب اگرچہ اپنے بروز و تعین میں مختلف ناموں سے پکارے گئے، پر اصل میں یہ سب کچھ اس ایک حقیقت الحقائقِ ابراہیمی ہی کی نیرنگ طرازیاں تھیں جسے خدا نے بقائے دوام اور "لسان صدق فی الآخرین" کے لیے چُن لیا تھا!

پھر ان سب کے آخر میں احیاء و تجدید موسویت کا وہ آخری ظہورِ اعظم جس نے اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ بھیڑوں کا سراغ لگایا اور خداوند کے تخت کی آلودگی و ذلت پر آخری مرثیہ پڑھا اور خوش خوش سُولی کے تختہ کی طرف بڑھا، تا وہ چلا جائے اور اپنے باپ سے کہے کہ آنے والے کو جلد بھیج دے۔ اگرچہ تم کہتے ہو کہ وُہ انگور کے باغ میں "مسیح" کا آخری پیام تھا، لیکن فی الحقیقت وُہ بھی "وادی غیر ذی زرع" کے جمالِ خلت ہی کی ایک نئی بخشش حسن تھی:

عباراتنا شتّی وحسنك واحد
وكل الى ذاك الجمال يشير

ولنعم ما قیل:

مشتق چو نیک درنگری عین مصدر است
کیں در صفات ظاہر خود منتشر آمدہ

باب ۱۴

کائناتِ خِلّت

ما طفل کم سواد و سبق قصہ ہاے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

—(۴)—

مقصد گفتگو پس فی الحقیقت حضرت نوح اور حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہما السلام) کے حقائقِ دعوت کے اندر جو مماثلت و مشارکت موجود ہے اور جس طرح یہ دونوں دعوتیں دو مختلف سلسلہ ہاے تاسیسِ اُمم کی موسس و بانی ہُوئی ہیں، وہ اس قدر واضح و آشکارا ہے کہ تمام صفِ انبیاے کرام میں ان کو بیک نظر ممتاز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر جگہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ حضرت ابراہیم کو ایک خاص نسبت دی اور تمام انبیاے مابعد میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کو حضرت نوحؑ کا "شیعہ" کہا، کیونکہ حضرت نوحؑ کے بعد دوسرا دورِ موسس صرف ابراہیمی دعوت ہی کا وجود میں آیا تھا اور ان سے پہلے جس قدر انبیاء آئے تھے، وہ سب کے سب حضرت نوحؑ کی دعوت موسسہ کے مجدد و محی تھے۔ خود کوئی موسس دعوۃ نہیں رکھتے تھے۔

اگر تم کہو کہ حضرت انبیاء کرام کی یہ دو قسمیں اور ان کےؑ اعمال و آثار کے حقائق و معارف کی طرف رہنمائی ایک فضل مخصوص ہے، جس کے انکشاف کے لیے خدا تعالیٰ نے اس عاجز و درماندہ قلب کو چُن لیا تو یہ فی الحقیقت سچ ہے: ویا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین۔ (یٰس: ۲۶)[1]

لیکن اگر تم کہو کہ چونکہ اس کی تشریح بالکل نئی ہے، اس لیے درخورِ قبول نہیں تو یقین کرو کہ یہ تمھاری ایک خطرناک نادانی ہوگی اور تمھیں کلام الٰہی کی روشنی سے مہجور کر دے گی کیونکہ یہ تقسیم بیناً و اصلاً قرآن حکیم کی تصریحات بیّنہ سے ماخوذ ہے، جس میں تفسیر بالراے کی بدعت مضلہ کو ذرا بھی دخل نہیں اور فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا مخصوص احسان اس عاجز پر یہی ہے کہ اس نے تفسیر بالراے کی آلودگی سے پاک رکھ کر حقائقِ قرآنیہ کو منکشف کر دیا: وذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء و اللّٰہ ذو الفضل العظیم۔

اس حقیقت کی پُوری تفصیل کے لیے تو تفسیر "البیان فی مقاصد القرآن" کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے، جس میں بضمن تفسیر سورۂ بقرہ نہایت تفصیل و بسط کے ساتھ اس مبحث پر نظر ڈالی گئی ہے البتہ مجملاً یہاں چند اشارے

---

[1] کاش میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے کس طرح مجھے بخش دیا اور اپنے نوازے ہوؤں میں شامل کر لیا۔

ضروری ہیں۔

باہمی مماثلت | حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی باہمی مماثلت و مشارکت کی طرف قرآن حکیم کی جن آیات کریمہ نے رہنمائی کی ہے، ان میں سے دو آیتیں اُوپر درج ہو چکی ہیں لیکن اس حقیقت کے لیے اس سے بھی زیادہ روشنی قرآن حکیم میں موجود ہے اور از انجملہ چند آیات پر تدبّر نہایت ضروری ہے۔

مقاصد قصص قرآنی | قرآن حکیم کی جن جن سورتوں میں گزشتہ انبیاء اور قوموں کے قصص بیان کیے گئے ہیں، وُہ اپنے موضوع و مقصد اور طرزِ استدلال و استنباط نتائج کی بنا پر کئی قسموں میں منقسم ہیں اور لوگوں نے بالعموم ان کے سمجھنے میں بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں:

۱۔ بعض سورتیں ہیں، جن میں ان قصص کے بیان کرنے سے ایک طرح کا استقرا تاریخی مقصود ہے، یعنی یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ آغاز نزولِ ہدایت سے اس وقت تک شریعت الٰہیہ کی یکساں تعلیمات نے ہمیشہ یکساں نتائج پیدا کیے ہیں اور اس لیے ماضی کا استقراء ثابت کرتا ہے کہ حال و مستقبل میں بھی اُن موثرات و اسباب سے وہی نتائج پیدا ہوں گے۔

جن سورتوں میں یہ طرزِ استدلال مقصود ہے، ان میں گزشتہ واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور وہ بالکل ایک مرتب و منظم زنجیر کی طرح ہیں، جس میں یکے بعد دیگرے ایک ہی شکل و صورت کی کڑیاں رکھ دی گئی ہوں۔

۲۔ بعض سورتیں ہیں، جن میں یہ استقراء تاریخی مقصود نہیں، بلکہ صرف کسی ایک عمل اور اس کے نتیجے کی طرف دنیا کو متوجہ کرنا ہے جو بار ہا دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے اور ہمیشہ وہی نتیجہ پیدا ہُوا ہے اس کے لیے ترتیب تاریخی کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف گزشتہ واقعات میں سے زیادہ واضح، زیادہ موثر، زیادہ جامع اور مخاطبین کی معلومات و فہم سے زیادہ اقرب حوادث کا چن لینا کافی تھا۔ چنانچہ ان سورتوں کا انداز یہی ہے اور تم پاؤ گے کہ ان میں تاریخی ترتیب بالکل مفقود ہے۔

اسی طرح قصص القرآن کے مختلف موضوع ہیں اور مختلف طرقِ استدلال پر مشتمل ہیں۔ پہلی قسم کی سورتوں میں سے میں سورۂ "ہُود" کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اور دُوسری میں سے سورۂ "الشعراء" پر۔ (یہ ایک نہایت ہی اہم اور تفصیل طلب مقام ہے، مگر اس کے سوا چارہ نہیں کہ تفسیر "البیان" کے حصۂ قصص القرآن کا انتظار کیا جائے)

قرآن اور ذکر انبیائے کرام | چنانچہ سورۂ ہُود پر اول سے آخر تک نظر ڈالو، انبیاء کے تمام ذکر میں تاریخی ترتیب ہر جگہ قائم نظر آئے گی۔ پھر دیکھو گے کہ موسسین و مجددین کی ہر دونوں

صنفیں بھی بالکل الگ الگ اس میں موجود ہیں۔ تاسیس امم صالحہ کے ان دونوں دوروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور ہر دور میں پہلے دعوت موسسہ کا تذکرہ ہے، پھر اس کے مجددین کا۔

لیکن سورۂ شعراء، سورۂ ابراہیم، سورۂ مریم، سورۂ عنکبوت میں دیکھو گے کہ انبیاء کرام کے ذکر میں کوئی تاریخی ترتیب نہیں۔ شعراء میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، پھر حضرت نوح، پھر حضرت ہُود کا، پھر حضرت صالح کا، پھر حضرت لُوط کا اور سب کے آخر میں حضرت شعیب (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا۔ اس طرح بلحاظ زمانہ کے جو مقدم تھے، وُہ موخر ہیں، اور جو معاصر تھے (مثل حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کے) وہ اس طرح الگ کر دیئے گئے ہیں، گویا ان دونوں کے درمیان صدہا سال حائل تھے۔

اسی طرح سورۂ ابراہیم میں پہلے حضرت نوحؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کا ایک مفصل بیان شروع ہو گیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰؑ، حضرت نوحؑ کے کس قدر بعد گزرے ہیں؟

سورۂ مریم میں ابتدا حضرت زکریا اور مسیح علیہما السلام سے کی ہے۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

سورۂ ہُود اور تاریخی استقراء

برخلاف ان کے سورۂ "ھود" میں اول سے آخر تک بالکل تاریخی ترتیب قائم ہے۔ جو انبیاء پہلے گزرے ہیں ان کا ذکر پہلے ہے، جو ان کے بعد آئے، وہ ان کے بعد ذکر کیے گئے ہیں۔

یہ ترتیب اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے کہ تاسیس امم صالحہ کے دور تاریخی دور تھے اور چونکہ سورۂ ہُود میں مقصود تاریخی استقراء تھا، اس لیے ٹھیک ٹھیک ان کے ظہور کے اصلی اوقات و ازمنہ کے مطابق سلسلۂ ظہور و بعثت میں ان کو جگہ دی گئی ہے، وہی اس کی اصلی تاریخی جگہ ہے اور دوسری سورتوں میں ان کی صفوف بلحاظ زمانۂ ظہور یا بلحاظ صنفِ دعوت کے نہیں، بلکہ وہاں کچھ اور مقاصد پیش نظر ہیں، جن کے لیے ترتیب تاریخی و صنفی کی ضرورت نہ تھی۔

چنانچہ سورۂ ہُود میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ حضرت نوح ہی کے زمانے میں سب سے پہلے اجتماع انسانی نے ایک متقوم و منظم اجتماع تک ترقی کی، جس پر لفظ "امۃ" کا حسب لغت عرب اطلاق ہو سکتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت موسسہ تھی۔ ان کی تاسیس سے پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے بعد دعوت نوحی کے مجددین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سے حضرت ہُود اور حضرت صالح علیہما السلام کے تذکرے کو بوجہ کمال عبرت و تذکیر و ظہور معجزات قوانین الٰہیہ و روحانیہ و معلومات مخاطبین و علائق قدیمۂ عرب، چن لیا ہے اور قوم عاد و ثمود کی ضلالت اور اس کے نتائج پر توجہ دلائی ہے۔

اسحاقؑ و یعقوبؑ کی بشارت

اب پہلا دور تاسیس ختم ہو گیا اور دعوت نوحی کی جگہ ایک نیا دور تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا شروع ہوا چنانچہ حضرت صالحؑ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے اگر ان کے تمام وقائع و اعمال حیات اجتماعی و شخصی میں سے صرف اس ایک واقعہ ہی کو سورۂ ہود کے لیے چُنا ہے جس میں حضرت اسحاق کی پیدائش کی انھیں بشارت دی گئی تھی اور اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے ،

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۔ (ھود : ۷۱)

پس ہم نے حضرت ابراہیم کی بیوی کو اسحاق کی پیدائش کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد ان سے یعقوب کے پیدا ہونے کی ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام " اسرائیل " ہے اور " بنی اسرائیل " انہی کی طرف منسوب ہیں ۔ پس یہاں قرآن نے صرف حضرت اسحاق کی بشارت کے تذکرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا ، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ان سے حضرت اسرائیل پیدا ہوں گے ۔

اس سے مقصود یہ تھا کہ انبیاء مجددین کا جو سلسلہ قوم بنی اسرائیل میں قائم ہونے والا تھا ، اور دعوت ابراہیمی کی امت موسسہ جس طرح امت بنی اسرائیل کی شکل میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے والی تھی ، اس کی طرف زیادہ واضح اشارہ کر دیا جائے ۔ اس اشارہ کے لیے صرف حضرت اسحاق کا نام لے دینا کافی نہ تھا ، کیونکہ گو حضرت اسحاق ہی سے حضرت یعقوب پیدا ہوئے ، لیکن بنی اسرائیل کی قوم اور اس کے تمام انبیاء مجددین حضرت اسحاق کی طرف منسوب نہ ہوئے ، حضرت یعقوب کی نسبت سے پکارے گئے ۔ اس لیے " و من وراء اسحٰق ، یعقوب " کہہ کر نسل ابراہیمی کو ان تک پہنچا دیا گیا ، جس کے بعد سے معاً بغیر کسی درمیانی کڑی کے امت بنی اسرائیل اور دعوت ہائے مجددۂ ابراہیمیہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔

غور کرو ، سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم کی حیات طیبہ کے اور کسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا ، صرف اس بشارت ہی کا ذکر کیا ۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہاں مقصود تاریخی ترتیب کے ساتھ دو موسس دوروں اور ان کے دو سلسلہ ہائے تجدید و احیاء کا ذکر کرنا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا یہی واقعۂ بشارت وہ واقعہ ہے جس سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے اور ان کے اولاد میں حضرت یعقوبؑ تھے ، جن سے دعوت ابراہیمی کا سلسلۂ مجددین و امم قائم ہوا ۔

مجددین دعوت ابراہیمی

پھر دعوت ابراہیمی کے بعد بالترتیب اس کے مجددین کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ہے جن کی دعوت ، دعوتِ ابراہیمی ہی کے ذیل میں داخل تھی ۔ حضرت لوط کے بعد حضرت شعیبؑ کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ، جن کی دعوت اندر اس قوت سے چکی ، گویا ایک دعوت موسسہ تھی اور جن کے تذکرے کے اندر ان تمام مجددین اسرائیلین کا ذکر ضمناً آگیا جو یکے بعد دیگرے آتے رہے اور دراصل وہ سب کے سب مع حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے

دعوت موسسۂ ابراہیمی کے مجدد تھے : ذٰلك من انباءِ القرٰی نقصه علیك منها قائم وحصید۔

(ہود : ۱۰۲)

اب غور کرو کہ سورۂ ہُود کی یہ ترتیب جو ٹھیک ایک تاریخی اور صنفی ترتیب ہے، کس طرح اس حقیقت کو واضح کرتی ہے؛ تم اکثر مقامات پر حضرت موسیٰؑ کا نام حضرت نوحؑ کے ساتھ دیکھوگے، بعض مقامات میں حضرت ہُودؑ اور صالحؑ کا ذکر بلا کسی فصل کے حضرت لوطؑ یا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آجائے گا، لیکن سورۂ ہود میں ایسا نہیں۔ حضرت ہُودؑ اور حضرت صالحؑ موسس نہ تھے، دعوتِ نوحی کے مجدد تھے، لہٰذا ان کا ذکر بالترتیب ان کی دعوت موسسہ کے بعد کیا گیا۔ حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام، حضرت ابراہیمؑ کے بعد آئے اور یہ تمام انبیاء موسس اقوام و امم نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی قائم کردہ اُمت صالحہ کے مصلح و مجدد تھے، اس لیے ان سب کا ذکر نہ تو حضرت نوحؑ کے ساتھ کیا، نہ حضرت ہُودؑ و صالحؑ کے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت موسسہ کے بعد کیا اور اس طرح کیا، جس طرح ان کی تجدید یکے بعد دیگرے بتقدیم وتاخیر زمانی ظاہر ہُوئی : فهٰذا ما الهمنی ربی انه هو اللطیف الوهاب!

تکرار بیان و مطالب کی حقیقت

قرآن حکیم میں حضرت انبیاء کا تذکرہ ایک ہی مقصد اور ایک ہی استدلال کے ماتحت نہیں بلکہ ہر جگہ وہ ایک نیا مقصد، ایک نیا نتیجہ، ایک نیا استدلال اور ایک نیا طرز استنباط بصائر و حکم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عاجز قرآن حکیم میں محض تاکید و ازدیاد اثر کے لیے تکرار بیان و مطالب کا قائل نہیں، بلکہ اس کو کلام الٰہی کے لیے ایک نقص یقین کرتا ہے اور مطالب متکررہ کو بھی ہر جگہ بلحاظ نتائج بالکل ایک نیا اور مستقل بیان پاتا ہے۔ اسی بناء پر بلاشبہ ایک ظاہر بیں نگاہ دیکھے گی کہ بہت سے مقامات بظاہر اس حقیقت کے خلاف ہیں اور جن انبیاء کرام کو ہم مجدد قرار دیتے ہیں، ان کا نام موسسین کے ساتھ اس طرح لیا گیا ہے، گویا صنف کے اعتبار سے ان میں باہم کوئی امتیاز نہیں۔ لیکن ایسا سمجھنا فی الحقیقت ایک سخت کوتاہ بینی اور حقیقت ناشناسی ہوگی اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

وما یعقلها الا العالمون! حقائق قرآنیہ کا ادراک نہیں کر سکتے مگر وہ لوگ جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے علم حق کے لیے کھول دیا ہے۔

نیز سورۂ عنکبوت میں فرمایا: بل هو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم۔ یعنی جن خوش نصیبوں کے سینوں کو خدا نے علم نبوی و الٰہی کے لیے کھول دیا ہے، صرف وہی ہیں جو قرآن حکیم کے حقائق و معارف کا آشیانہ

لہ یہ پچھلی آبادیوں کی خبروں میں سے چند کا بیان ہے، جو ہم سنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو اس وقت تک قائم ہیں، کچھ بالکل اُجڑ گئیں۔

بن سکتے ہیں ورنہ ارباب جہل کی نظروں سے دیکھا جائے تو "اساطیر الاولین" کے سوا اس کے قصص کے اندر اور دھرا ہی کیا ہے؟

قصص و اخبار کے مقاصد بہرحال اس اختلاف طرز ذکر کا راز دراصل اس نکتہ کے حل ہونے پر موقوف ہے کہ قرآن حکیم کے قصص و اخبار کے مقاصد و اغراض پر سے پردہ اٹھایا جائے اور جو حقائق و معارف ان میں پوشیدہ ہیں اور اختلاف مقاصد بیان نے جس طرح بیان کے انداز و ترتیب کو بھی مختلف کر دیا ہے، اسے واضح کیا جائے مگر یہ موضوع تفسیر کا ہے۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جن سورتوں میں انبیاے موسسین کے ساتھ ہی بغیر کسی فصل و امتیاز کے بعض انبیاے مجددین (علیٰ نبینا وعلیہم السلام) کا بھی ذکر کیا گیا ہے، (ان مقامات میں نہ تو مقصود ترتیب تاریخی ہے، نہ تفریق تاسیس و تجدید، اور نہ ہی قسم دعوت کی بنا پر مختلف طبقات کی تمیز، بلکہ وہاں ان کے اعمال مشترکہ و عامہ اور اس کے نتائج غیر مخصوصہ و متحدہ میں سے بعض خاص امور کو پیش کرنا ہے اور صرف انہی کی جانب مخاطب کو متوجہ کرنا یا مسلمانوں کو توجہ دلانا ہے) اس مقصد کے لیے انبیاؑ کے ازمنۂ ظہور و تبلیغ کی تقدیم و تاخیر اور اصناف تاسیس و تجدید بالکل غیر موثر تھے، اس لیے بالکل ضرورت نہ تھی کہ ان پہلوؤں کا وہاں لحاظ کیا جاتا۔

یا پھر بعض مقامات میں یہ نظر آتا ہے کہ مقصود انبیاء کا ظہور نہیں بلکہ ایک خاص طرح کی دعوت، ایک خاص طرح کی طرز تبلیغ، ایک خاص طرح کی جماعت مومنین، ایک خاص قسم کی ضلالت منکرین اور ان سب امور کا کوئی خاص طرح کا نتیجۂ حسن و قبح یا عذاب و ثواب مقصود ہے، اس لیے قدرتی طور پر ترتیب زمانی وصف نبوت و قسم دعوت سے بالکل قطع نظر کر لیا گیا ہے اور صرف اُن نبیوں اور دعوتوں کو یکجا کر کے بیان کر دیا ہے جو اُس پیش نظر و زیر مقصد امر میں باہم سب سے زیادہ مشابہت و مشارکت رکھتے تھے اگر حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے زمانے میں وہ امر زیادہ یکسانیت و مشارکت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے، تو بلا خیال اس کے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ کب تھا اور حضرت موسیٰؑ کب ظاہر ہوئے، اور بغیر اس ترتیب کے کہ حضرت نوحؑ موسس تھے اور حضرت موسیٰؑ مجدد، دونوں کا ذکر ایک ساتھ کر دیا ہے کیونکہ مقصد زمانہ، صنف اور وجود داعی نہیں، بلکہ ایک اور چیز جو بہ نسبت دوسرے انبیاء کرام کے ان دونوں کے زمانے میں زیادہ وسعت کے ساتھ ظاہر ہوئی اور اس لیے عبرت و تذکیر کے لیے ان کا یکجائی ذکر زیادہ قوی و موثر ہے۔

مگر جن مقامات میں اس طرح کے مقاصد نہ تھے بلکہ خاص طور پر زمانہ اور قسم دعوت و صنف ظہور مقصود تھا، وہاں تم صاف صاف پاؤ گے کہ موسسین بالکل الگ ہیں اور مجددین کی صف بالکل دوسری ہے اور بالتصریح ظاہر کر دیا ہے کہ ان میں موسسین امم کا سلسلہ اس طرح چلا اور مجددین امم اس طرح ظاہر ہوئے۔

تمثیل دعوت اسلام اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد میرا ساتھ دو اور قرآن حکیم کے ان بیانات کو

جو جا بجا متفرق ہیں یکجا کر کے غور کرو۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم نے جن مقامات پر قسم دعوت و صنف انبیاء کی بنا پر کوئی تذکرہ کیا ہے، یا کسی موسس کو بر بنائے دعوت و تبلیغ تشبیہ دی ہے تو اس طرح کے تمام مواقع پر اس امتیاز و فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

چنانچہ تمام قرآن میں ہم پاتے ہیں کہ حضرت ختم المرسلین کی دعوت کو حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی قسم دعوت سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت ہود یا حضرت صالح وغیرہم مجددین سے تشبیہ نہیں دی، کیونکہ اسلام کی دعوت موسسہ تھی، مجددہ نہ تھی اور حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ ہی تمام انبیاء متذکرہ قرآن میں موسس تھے، پس اسلام کے لیے انہی کی صنف میں جگہ رکھی گئی۔

سورۂ نساء میں فرمایا:

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (النساء: ۱۶۳)

ہم نے اسی طرح تیرے وجود کو مہبط وحی الٰہی بنایا، جس طرح نوح کو اور اُن انبیاء (مجددین) کو جو دعوت نوحی کے بعد ہوئے نیز جس طرح ابراہیم پر ہم نے وحی کی اور ان کے بعد اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، تمام اسباط اسرائیل، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان آئے اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کیا۔

اب دیکھو کہ اس آیہ کریمہ میں کس قدر تدبر و تفکر عمیق کی ضرورت ہے؟ آیت میں مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پہلے ان کو حضرت نوح سے تشبیہ دی، جنھوں نے ایک نئی اُمت صالحہ کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر کہا کہ "والنبیین من بعدہ" اور جو نبی ان کے بعد آئے یہ طرز بیان صاف بتلاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے بعد والے انبیاء دعوت نوحی کے اس طرح اتباع و متعلقین میں داخل تھے کہ صرف حضرت نوح ہی کا نام لے دینا ان کے لیے کافی تھا۔ پھر حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ سے مزید تشبیہ نہیں دی، حضرت صالحؑ سے نہیں دی، حضرت لوطؑ سے نہیں دی، حضرت اسحاقؑ سے نہیں حالانکہ اگر مقصود محض وحی کے مورد و مہبط ہونے کے لحاظ سے تشبیہ تھی تو اس کے لیے تمام انبیاے کرام یکساں مگر تم دیکھتے ہو کہ حضرت نوحؑ کے بعد ہی دوسرا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لیا گیا اور یہ دوسری تشبیہ و مماثلت ہے دعوت اسلامی کو دی گئی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے بعد بہت سے انبیاء کا نام لیا جو سب کے سب بلا استثناء دعوت ابراہیمی کے مجدد تھے اور اس طرح صاف صاف بتلا دیا کہ تاسیس امم صالحہ کے سلسلے دو ہیں: ایک حضرت نوح اور "والنبیین من بعدہ" کا۔ دوسرا حضرت ابراہیم اور ان کے مجددین اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب علیہم السلام کا۔

مزید تصریحات | اگر کہا جائے کہ حضرت نوح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام محض ترتیب تاریخی کے

لیا ورنہ کوئی مخصوص امتیاز نہ تھا، تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس آیت کریمہ میں تاریخی ترتیب بالکل نہیں نظر آتی، تم دیکھ رہے ہو کہ حضرت یعقوبؑ و اسباط کے بعد ہی حضرت عیسیٰؑ کا نام آگیا ہے جو سب کے بعد آئے اور حضرت سلیمانؑ کے بعد حضرت داؤدؑ کا نام لیا گیا حالانکہ حضرت داؤد حضرت سلیمانؑ کے والد ہیں۔

پس اس آیت میں دعوت اسلامی کو تشبیہ صرف دو دعوتوں سے دی گئی ہے دعوت نوحی اور دعوت ابراہیمی، اور یہ "کما اوحینا الیٰ نوح" "و اوحینا الی ابراهیم" سے ظاہر ہے ان کے علاوہ یہاں جتنے انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان سے مماثلت مقصود نہیں، بلکہ ان کے نام تبعاً آئے ہیں کہ وہ ان دعوت ہائے مؤسسہ کے مجدد تھے۔

رہی یہ بات کہ حضرت نوحؑ کے مجددین کی طرف تو صرف مجمل اشارہ کر دیا، مگر حضرت ابراہیمؑ کے مجددین کے نام تصریح الگ الگ لیے گئے تو اس کے بھی متعدد اسباب ہیں۔ از انجملہ واضح تو یہ کہ سورۂ نساء کے اس حصہ میں تمام تر خطاب اہل کتاب سے ہے اور ان کی زیادہ تر معلومات حضرت ابراہیمؑ کے بعد کے انبیاء سے متعلق تھیں۔ نیز تعلق موسوی و اسرائیلی کی وجہ سے وہ ان انبیاء کو زیادہ محترم و مقدس سمجھتے تھے اور تورات ان کے تذکرہ سے لبریز تھی۔ پس حضرت نوحؑ کے مجددین کے لیے تو صرف اشارہ کر دیا اور حضرت ابراہیمؑ کے مجددین کی تفصیل کی تاکہ بیان زدہ اوقع اور زیادہ حجت ہو۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اگر تم کو شبہ ہو کہ قرآن نے اسی طرح اور اسی طریق تشبیہ کے ساتھ تو حضرت موسیٰ اور آنحضرت علیہما السلام کو بھی باہم مشابہ قرار دیا ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ (المزمل: ۱۵)

ہم نے تمہاری جانب اپنا ایک رسول بھیجا، تمہارے آگے حق کی شہادت دینے والا، جس طرح فرعون کی جانب اپنے ایک رسول (حضرت موسیٰ) کو بھیجا تھا۔

تو واضح رہے کہ یہ مشابہت اس حقیقت کے لیے بالکل مخالف نہیں۔ بلاشبہ قرآن نے حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے داعی اسلام کی بعثت کو تشبیہ دی ہے اور اسی ارشاد الٰہی کا اعادہ و یاد آوری ہے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ "میں تیرے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تیرا جیسا ایک نبی بھیجوں گا" لیکن یہ مشابہت قسم تاسیس و تجدید اور صنف نبوت میں نہیں، بلکہ صرف حق اور باطل کے مقابلے میں ہے۔ سورۂ نساء کی آیت میں "کما اوحینا" ہے یعنی جس طرح ہم نے حضرت نوح و ابراہیم پر نبوت و رسالت کی "وحی" کی۔ یہاں "ارسلنا" ہے یعنی ہم نے اس عہد کے باطل پرستوں اور متکبر و سرکش کفار کے مقابلے میں فتح ربانی اور نصرت الٰہی کے ساتھ اسی طرح پیغمبر اسلام کو "بھیجا" ہے۔ جس طرح اب سے پہلے ایک بہت بڑے ظالم و مغرور ابلیس کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ کو بھیجا تھا اور باوجود اس کے تمام ساز و سامان دنیوی کے وہ اس پر غالب و فتح مند ہوئے تھے۔

اس تشبیہ سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باطل کو اپنی شیطانی قوتوں کے گھمنڈ میں مغرور نہ ہوجانا چاہیے۔ جس طرح باوجود تنہائی و بے سروسامانی کے حضرت موسیٰ نے فرعون کو تباہ و برباد کیا تھا، اسی طرح ہم نے پیغمبر اسلام کو بھی اس عہد کے فراعنہ و فارعنہ کے مقابلے میں بھیجا ہے۔ اب بھی وہی نتیجہ نکلے گا، جو پہلے نکل چکا ہے۔

تائید مزید

اس کی مزید تائید اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے۔ یہ آیت سورۂ مزمل کی ہے جو آغاز ظہور اسلام کے زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا موضوع تنزیل یہ تھا کہ تبلیغ حق کی مشکلات و مقامات کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہی بخشی جائے اور بتلادیا جائے کہ حق کا ظہور ہمیشہ ابتدا میں مظلومی و بے سروسامانی ہی کے ساتھ ہوتا ہے، پر آخر میں فتح مندی چمکتی ہے۔ چنانچہ آیت زیر بحث سے پہلے راہ حق کی مشکلات و تکالیف پر اور اس انکار و سرکشی پر جو باطل پرستوں میں نظر آتی تھی، آپ کو تسکین و تسلی دی ہے اور فرمایا کہ ان حالات کو دیکھ کر اپنے اندر مایوسی نہ لاؤ۔ یہ حق کی ابتداء ہے، مگر تھوڑے سے صبر و انتظار کے بعد اس کی انتہا بھی آنے والی ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝ إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ۝

(المزمل: ۸-۱۲)

اپنے پروردگار کا ذکر کرو اور سب کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف اسی کے ہو جاؤ۔ وہ پروردگار کہ تمام عالم میں اسی کی ربوبیت کارفرما ہے اور اس کے سوا کارساز عالم اور کوئی نہیں، سو جب ایسا کارساز تمہارے ساتھ ہو تو تم اور کسی طرف کیوں نظر اٹھاؤ؛ بس اسی کو اپنا کارساز یقین کرو! رہا منکرین حق کا ظلم، ان کا کبر باطل، اور ان کے باطل پرستانہ کامیابیوں کے دعوے اور اعلانات، تو چاہیے کہ ان پر صبر کرو، سردست بغیر کسی سختی کے ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں ان کے حال پر زیادہ نہیں، تھوڑے دنوں کے لیے چھوڑ دو پھر دیکھو کہ حق کے یہ جھٹلانے والے جو طرح طرح کی خوش حالیوں اور دنیوی عزتوں میں اپنے تئیں پاکر ہی متکبر و مغرور ہو گئے ہیں، بالآخر کیسا نتیجہ پاتے ہیں! ہمارے پاس اگر ان کے لیے مہلت تھی تو اب ان کے جکڑنے کے لیے بیڑیاں اور ان کی عقوبت کے لیے آگ بھی ہے۔

وعدۂ الٰہی پورا ہوگیا اس کے بعد پھر ان منکرین و مغرورین کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمھاری جانب اسی طرح حق کا یہ اعلان بھیجا گیا ہے جس طرح تمھاری نسل ابلیسی کے ایک وارث اعلیٰ فرعون کے سامنے حق کا ظہور ہوا تھا اور جس طرح تم نے باطل پر گھمنڈ کیا، اس نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ۝ فَكَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا ؟ (المزمل: ۱۶)

فرعون نے ہمارے رسول کی نافرمانی کی، سو ہمارے غضب نے اسے بڑا ہی سخت پکڑا اور اس کا سارا گھمنڈ اور غرور باطل بے کار گیا۔ پھر اے منکرین اسلام! اگر تم بھی اسی طرح نافرمانی کروگے تو اس دن کی مصیبت سے کیسے بچ سکوگے جس کی سختی بچوں کو مارے غم کے بوڑھا کر دے گی؟

یہ اشارہ بدر اور فتح مکہ کی طرف تھا، سو وعید الٰہی نے جو کہا تھا پورا کر دکھایا۔

بہرحال سورۂ مزمل کے موضوع تنزیل اور آیت زیر بحث کے سباق و سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ سے آیت نساء کی طرح دعوت اور داعی میں تشبیہ نہیں دی گئی، بلکہ دعوت و داعی کے انکار اور منکرین میں دی گئی ہے۔ پس تشبیہ آنحضرت اور حضرت موسیٰ علیہما السلام میں نہ ہوئی۔ منکر موسیٰ اور منکر محمدؐ میں ہوئی (صلی اللہ علیہما ولعنۃ اللہ علی منکرین الخاسرین)

...اور ثبوت ٹھیک ٹھیک اسی طرح سورۂ "شوریٰ" میں جہاں وحدتِ ادیان و توحید شرائع کی طرف دلائی ہے تو وہاں بھی دعوت اسلامی کا ذکر حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی صف میں جو فصل کیا گیا ہے اور اس طرح اس کی قوت موسسہ کی نمایاں صنف واضح کر دی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَ عِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (شوریٰ: ۱۱)

تمھارے لیے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے جس کے لیے نوح کو وصیت کی گئی تھی، اور اے پیغمبر اسلام! جس کے لیے ہم نے تم پر وحی کی ہے۔ نیز یہ وہی راہ ہے کہ اس کے لیے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی ہم نے وصیت کی تھی کہ دین الٰہی کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اب غور کرو کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح پیغمبر اسلام کو نمایاں طور پر حضرت نوحؑ کے ساتھ کھڑا کیا ہے ...جن انبیاء کرام علیہم السلام کو ہم نے دوسری صنف مجددین میں قرار دیا ہے، ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا؛ ...پھر اس پر بھی نظر رہے کہ یہاں دعوت اسلام کا ذکر جس طرح ترتیب تاریخی و زمانی کو یک قلم نظرانداز کرکے کیا گیا ہے، وہ ...حقیقت کے لیے بالکل ایک بے حجاب روشنی ہے۔ آیت کریمہ کا مقصود یہ تھا کہ دین الٰہی کی وحدت اور قانون ظہور

رسالت کی یکساں حالت کی طرف توجہ دلائی جائے۔ پس فرمایا کہ وُہ ایک ہی شریعتِ الٰہیہ ہے جس کی طرف برابر ہر ظہور نے دعوت دی اور سب کی دعوت کا مقصد قیام دین الٰہی و عدم تفرقہ و اختلاف تھا۔ پھر اس سلسلے کو حضرت نوحؑ سے شروع کیا۔ اگر بہ لحاظ صفت کے تمام ظہوروں میں کوئی فرق نہ تھا تو قدرتی ترتیب تو یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کے بعد اُن کے بعد کے انبیاء کا ذکر کیا جاتا اور اگر ان کو کسی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا تو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ کو تو ضرور ہی ان کے بعد جگہ دی جاتی، پھر سب کے آخر میں اسلام کا ذکر کیا جاتا، جیسا کہ سب کے بعد وُہ ظاہر ہُوا، لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ حضرت نوحؑ کے بعد یکایک لسان الٰہی اسلام کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور پیغمبرِ اسلامؐ کو مخاطب کرکے ان کی دعوت کا ذکر کرتی ہے۔ پھر اُن کا ذکر کرکے مکرر درمیانی کڑیوں کی طرف عود کرتی ہے اور ان میں سے بھی سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا نام لیتی ہے جو دعوت نوحی کے بعد دوسرے دورِ تاسیس کے مؤسس تھے البتہ ان کے ساتھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے!

حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان کا ذکر بالکل ایک طرح کا جملۂ معترضہ معلوم ہوتا ہے، جو ترتیبِ بیان کے بالکل خلاف ہے۔

پس بیان کا یہ انداز صاف صاف کہہ رہا ہے کہ سلسلۂ ادیان و توصیۂ شرائع میں اسلام کو کوئی ایسی خصوصیت حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے ایک خاص تعلق و ربط رکھتا ہے اور اس لیے گو اس کا ظہور سب سے آخر ہُوا، تاہم اپنے تعلق و ربط کی بنا پر حضرت نوحؑ کے ساتھ اس کا ذکر نہایت ضروری تھا، اسی طرح اسلام کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا گیا اور ان کو حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے ناموں پر مقدم رکھا۔ نہ اس لیے کہ بہ لحاظ زمانے کے وُہ مقدم تھے، کیونکہ زمانے کو تو یہاں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور دعوتِ نوحی کے بعد دعوت اسلامی کا نام آگیا ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ بھی مثل حضرت نوحؑ و حضرت ختم المرسلینؐ کے مؤسس تھے اس لیے وہی اس صف میں کھڑے ہو سکتے تھے البتہ ان کے بعد ان کے مجددوں کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا تاکہ ایک طرف تو یہ واضح ہو جائے کہ مؤسس و مجدد، دونوں طرح کے نبیوں کا مقصد ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور سب کو ایک ہی دین الٰہی کی وصیت کی گئی ہے، دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے تخاطب میں اُن انبیاء کا ذکر آ جائے جن کی ذات سے ان کا اوّلیں تعلق ہے۔

اتحاد دعوۃ نوحی و ابراہیمی

سورۂ انعام میں ایک مقام پر بہ تفصیل حضرت ابراہیم کے مقامات و درجات الٰہیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں فرمایا ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ	اور یہ ہماری ہی حُجّت تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو

حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ○ وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ كُلًّا هَدَیۡنَا ۚ وَ نُوۡحًا هَدَیۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ وَ اَیُّوۡبَ الخ (انعام: ۸۳ - ۸۴)

ظہور حق کے لیے چن لیتے ہیں، اس کے مدارج علی الہی کو اسی طرح بلند کرتے ہیں۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار حکیم وعلیم ہے کہ اس کے تمام کاموں کے اندر حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں اور پھر دیکھو کہ ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب جیسی نسل دی کہ ان دونوں کے آگے دین حق کی راہ ہم نے کھول دی تھی اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ابراہیم سے پہلے نوح کو بھی دین حق کی راہ اسی طرح دکھا چکے ہیں۔ بہرحال ہم نے ابراہیم کو اسحاق و یعقوب کی نسل دی نیز اس کی ذریت میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب (الخ) کو پیدا کیا۔

اس آیت کریمہ کا انداز بیان بھی کس قدر واضح و نمایاں طور پر اس حقیقت مستورہ کو بے حجاب کر رہا ہے۔ یہاں تذکرہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جو " و اذ قال ابراهیم لابیه آزر" سے شروع ہوا ہے اور مسلسل بڑھتا آیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کے مباحثۂ حق و ضلالت کا ذکر کیا ہے اور ایک خاص برہان الہی کو نقل کر کے "حجۃ" قرار دیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ یہ ہماری حجۃ ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو دی اور اُن کے درجات کو بلند کیا۔

کائناتِ خُلّت

ما طفل کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

—(۵)—

جملۂ معترضہ کیوں؟

اب یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں حضرت نوحؑ کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ نہ اس سے پہلے ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ذکر صرف حضرت ابراہیمؑ کا ہے اور ان کی اس فضیلت کا ہے کہ خدا نے حضرت اسحاقؑ اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کے ذریعے سے نسلِ ابراہیمی کو پھیلایا اور زمین پر قائم کیا، لیکن یکایک بیچ میں ایک جملۂ معترضہ سا آگیا ہے جو بظاہر ربطِ بیان کے بالکل مخالف ہے کہ "و نوحا ھدینا من قبل" (اور نوحؑ جن کو ان سے پہلے ہم نے ہدایت بخشی) سوال یہ ہے کہ اس جملۂ معترضہ کا یہاں کون موقع تھا؛ اور حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ میں بغیر ربطِ بیان کے صرف حضرت نوحؑ کے ظہورِ ہدایت بخشی کی جانب اشارہ کر دینا کیوں ضروری ہوا؛

ممکن ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک کلامِ الٰہی کی تقدیس و عظمت کے لیے ربطِ بیان و ترتیبِ مطالب کچھ ضروری نہیں، (حالانکہ وہ خود انسان ہو کر اپنے بیان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں) وہ اس چیز کو چنداں قابلِ غور نہ سمجھیں، لیکن الحمد للہ ہم کہ انسانوں کے اندر مربوط و مرتب بیان کرنے کی قدرت دیکھتے ہیں، کسی طرح اس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے کہ خدا کے کلام کو بے ربط قرار دیں۔ انسان اگر نہیں سمجھتا تو اس کے لیے بہتر ہے کہ اپنی سمجھ کا گلہ کرے، بہ نسبت اس کے کہ کلامِ الٰہی کی عظمت کو اپنی کم فہمی سے آلودہ کرے؛

درجۂ تاسیس میں اشتراک

پس واضح ہو کہ یہ آیتِ کریمہ بھی بہ لحاظ اپنے خاص موضوعِ بحث کے اسی طرح مربوط اور متصل بیان ہے، جیسا کہ اوّل سے لے کر آخر تک قرآنِ حکیم کا ہر حصہ مرتب و منظم ہے۔ بلاشبہ یہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کا تذکرہ ہے۔ حضرت نوحؑ کا کوئی تذکرہ نہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کے مقامات میں سے اُس مقام کا تذکرہ آگیا ہے جو ان کی دعوت کی قوتِ موسسہ اور اس کے آثارِ باقیہ و جاریہ سے تعلق رکھتا ہے، یعنی یہ بیان شروع ہو گیا ہے کہ ہم نے ان کے وجود کو ہدایتِ ارضی کا ایک ایسا تخم بنایا؛ جس سے بے شمار شاخیں آگے چل کر پھوٹیں اور پھیلیں اور ان کو حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی نسل دی، جس سے کتنے ہی انبیاء و مجددینِ پیدا ہوئے اور اپنے اپنے عہدوں میں دعوتِ ابراہیمی کی تجدید کرتے رہے۔ و وھبنا لہٗ اسحٰق و یعقوب۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ درجہ اسی طرح کا تھا، جیسا کہ درجۂ تاسیس حضرت نوحؑ کو ان سے پہلے

گیا تھا اور ان کی دعوتِ موسسہ کی نسل و ذریت عرصہ تک قائم و جاری رہی تھی، اس لیے ضرور تھا کہ اس کی طرف بھی رہ کر دیا جاتا تا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس فضیلت و خصوصیت کی صنف واضح ہو جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بتلا یا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو ایک نسل ہدایت ہم نے بخشی تو یہ اسی قسم کی بخشش الٰہی ہے، جیسی کہ ان سے پہلے حضرت نوحؑ کے ذریعہ سے ہو چکی ہے۔ ان کی نسل بھی نسل ابراہیمی کی طرح ہدایت ارضی کے لیے عرصہ تک قائم رکھی گئی۔

حضرت نوحؑ کا ذکر، حضرت اسحاقؑ و یعقوبؑ کے بعد کیا ہے نہ کہ پہلے۔ تم جانتے ہو کہ حضرت اسحاقؑ و یعقوبؑ ہی سے نسل ابراہیمی بنی اسرائیل کے نام سے بڑھی اور پھیلی اور یہ بھی تمھیں معلوم ہے کہ حضرت یعقوبؑ ہی کا دوسرا نام "اسرائیل" تھا۔ پس یہ کیسا کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ حضرت نوحؑ کا یہاں ذکر صرف بقاے نسل و ذریت کے اشتراک براہیم حنفی ہی کی بنا پر کیا گیا ہے اور چونکہ اس وصف میں صرف وہی ایک ایسی دعوت تھی جو حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ موسسہ سے نسبت رکھتی تھی، اس لیے صرف اسی کا ذکر کیا گیا۔ ان کا ذکر نہیں کیا جو موسس کی جگہ مجدد تھے۔ مثلاً حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت لوط علیہم السلام۔

سورۂ انعام اور ذکر انبیاء

سورۂ انعام کی آیت کریمہ کا پہلا ٹکڑا آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن اس کے بقیہ حصہ سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسٰى وَهَارُونَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَإِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ ۝

(انعام: ۸۴-۸۶)

اور ابراہیم کو ہم نے اسحاق و یعقوب کی نسل بخشی اور نوح بھی جن کو ان سے پہلے ہم نے راہ دعوت حق دکھائی تھی ایسی ہی ایک نسل حق کی بخشش سے ممتاز ہوئے تھے اور ان کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو ہم نے پیدا کیا، جو اقوام و امم کی ہدایت کا وسیلہ بنے۔ یہ بہت ہی بڑی فضیلت ہے اور جو صاحبان احسان ہیں ان کو اسی طرح خدا تعالیٰ جزاء خیر دیتا ہے۔ نیز زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کہ یہ سب کے سب صالحین میں سے تھے اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کہ ان سب کو ہم نے تمام جہان میں فضیلت و امتیاز سے سربلند کیا!!

سورۂ انعام کی یہ آیت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ جس طرح ایک مقام پر انبیاء کرام کی ایک بڑی تعداد کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس طرح اور بہت کم کیا گیا ہے۔ اس آیت نے بغیر کسی پیچیدگی کے بالکل صاف صاف واضح

کر دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت موسسہ تھی، اس کے لیے انبیاء مجددین کا ایک بڑا سلسلہ قائم ہوا، وہ سب کے سب دعوتِ ابراہیمی ہی کے ذیل میں داخل ہیں کیونکہ وہ سب "ذریت ابراہیمی" کی نسبت سے بیان کیے گئے۔ ان تمام انبیاء کرام میں سب سے زیادہ نمایاں اور عظیم الاثر انبیاء چودہ تھے، جن کے نام بعض پیشِ نظر مقاصد کے لحاظ سے خاص طور پر لیے گئے ہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس آیت کریمہ سے ہم استدلال کریں، چند اہم مباحث کا صاف کر دینا نہایت ضروری ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے اس آیت کا صاف صاف اور ایک ہی مطلب خواہ مخواہ کی پیچیدگیوں میں پڑ گیا ہے اور حضرت مفسرین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے مختلف بحثیں اس کے ضمن میں چھیڑ دی ہیں۔

مرجع ضمیر "ذرّیتہ" اور حقیقت "ذرّیتہ"

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس آیت اور اس کے ماقبل کی آیتوں میں تذکرہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقامات و درجات ہی کا ہے اور بیچ میں محض ایک ضمنی اشارہ حضرت نوح علیہ السلام کی جانب بھی کر دیا گیا ہے، لیکن چونکہ حضرت نوحؑ کے ضمنی تذکرہ کے بعد پھر ایک ضمیر آ گئی ہے، اس لیے حضرت مفسرین رحمہم اللہ کے سامنے یہ بحث آ گئی کہ اس ضمیر کا مرجع کون ہے؛ حضرت نوح یا حضرت ابراہیم؛ (علیٰ نبینا وعلیہم السلام)

وضاحتِ مبحث کے لیے آیت کریمہ کا وہ ٹکڑا پھر ایک بار پڑھیے: ووھبنا لہٗ اسحٰق و یعقوب کلاً ھدینا، و نوحا ھدینا من قبل، و من "ذریتہ" داوٗد و سلیمان و ایوب۔ الخ یعنی ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسا فرزند اور پوتا دیا اور نوحؑ جن کو ان سے پہلے ہدایت کی، اور "ان کی" ذریت میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ پیدا ہوئے۔ الخ چونکہ حضرت نوحؑ کے ذکر کے بعد ہی "و من ذریتہ" (اور ان کی ذریت میں سے) آ گیا ہے، اس لیے سوال پیدا ہو گیا کہ یہ "ان کی" کی ضمیر کس کی طرف راجع ہے؛

یہ بالکل واضح تھا کہ تذکرہ اصلی حضرت ابراہیمؑ کا ہے، اس لیے اس ضمیر کو بھی انھی کی طرف راجع ہونا چاہیے، لیکن حضرات مفسرین کو اس میں ایک سخت مشکل نظر آئی۔ انھوں نے دیکھا کہ یہاں لفظ "ذریتہ" کا آیا ہے اور اس کے بعد متعدد انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں حضرت لوطؑ اور حضرت یونس علیہما السلام کا بھی نام آیا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے معاصر تھے۔ ان کی نسل میں نہ تھے۔ اسی طرح اُن کے نزدیک حضرت یونسؑ کو بھی نسل ابراہیمی سے تعلق نہ تھا۔ پس ضرور ہے کہ "و من ذریتہ" کی ضمیر کا مرجع حضرت نوحؑ ہوں اور ترتیب بیان کے لحاظ سے بھی اس کا قریبی مرجع وہی ہیں۔

طبری کا بیان

چنانچہ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اور ضمیر کی "ھاء" جو "و من ذریتہ" میں ہے، حضرت نوح سے متعلق ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے سلسلے میں حضرت لوطؑ کا بھی نام لیا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم کی نسل سے نہ تھے..... اگر قرآن کا مقصود لفظ "ذریۃ" سے حضرت ابراہیمؑ کی "ذریۃ" ہوتا تو ان کی نسل میں حضرت لوط اور حضرت یونس کے ناموں کو کبھی داخل نہ کرتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم کی نسل سے نہیں بلکہ حضرت نوح کی نسل سے تھے، اس بنا پر ضروری ہوا کہ "ذریۃ" کی "ھاء" کو ذکر حضرت نوحؑ ہی میں سے قرار دیا جائے۔ (جلد ۷ صفحہ ۱۷۲)

اس تفسیر کے مطابق تاویل عبارت یوں ہوئی کہ "و نوحا وفقنا للحق من قبل ابراھیم و اسحٰق و یعقوب، وھدینا ایضاً من ذریتہ نوح، داؤد و سلیمٰن" یعنی نوحؑ کو ہم نے ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ سے قبل راہ ارشاد دکھلائی نیز نوحؑ کی نسل میں سے داؤد و سلیمانؑ وغیرہم کی بھی ہدایت کی۔

تاہم چونکہ آیت کا موضوع اور سیاق و سباق کی ترتیب صاف صاف ظاہر کرتی تھی کہ اصل تذکرہ حضرت ابراہیم کا ہے نہ کہ حضرت نوحؑ کا، اس لیے ایک جماعت محققین کی اس طرف بھی گئی کہ یہ ضمیر حضرت ابراہیمؑ ہی کی طرف راجع ہے، اور انہی کی ذریت کی آگے چل کر مزید تشریح کی ہے۔

امام رازی

چنانچہ امام رازی نے دونوں جماعتوں کے قول نقل کیے ہیں اور دونوں کو 'قیل' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، نیز قائلین ذکر نوحؑ کے دلائل بھی زیادہ تفصیل سے بیان کیے ہیں:

"کہا گیا ہے کہ مراد اس ضمیر سے ذریۃ حضرت نوحؑ کی ہے اور اس کے لیے متعدد وجوہ ہیں:

۱۔ اس ضمیر کے لیے سب سے زیادہ قریبی مرجع حضرت نوح ہی کا ہے۔

۲۔ من جملہ انبیاء ذریۃ کے حضرت لوط ہیں اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور ان کے عہد کے ایک رسول تھے، ان کی نسل سے نہ تھے۔

۳۔ کسی آدمی کے بیٹے کو اس کی نسل نہیں کہیں گے، ذریت کا اطلاق اولاد کی اولاد در اولاد پر ہوتا ہے۔ پس اس بنا پر حضرت اسماعیلؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کی ذریۃ میں نہ ہونے۔ ذریۃ حضرت نوح کی ہوئی مگر ان کا ذکر بھی اس سلسلے میں آیا ہے۔

۴۔ حضرت یونس کا بھی نام آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ بھی نسل ابراہیمی سے نہ تھے۔

دوسرا قول اسی آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ ضمیر حضرت ابراہیمؑ ہی کی طرف راجع ہے۔ اس تفسیر کے قائلین نے اس دلیل سے حجت پکڑی ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ انہی کی نسل کا ذکر جاری رہے۔" (جلد ۳۔ ص ۷۶)

چنانچہ عام متداول تفاسیر مثلاً مدارک وخازن وغیرہ میں تم پاؤ گے کہ دونوں قول نقل کر دیے ہیں، مگر ترجیح حضرت نوحؑ کے مرجع ہونے کو دی ہے اور قدماء میں امام ابن جریر کے علاوہ فراء، قشیری، ابن عطیہ (رحمہم اللہ) بھی اسی طرف گئے ہیں۔ بغوی نے زجاج کا یہ قول نقل کیا ہے: "کلا القولین جائز لان ذکرھا جمیعاً قد جری" (دونوں تفسیر کرنا جائز ہے کیونکہ دونوں کا وہاں ذکر کیا گیا ہے)

اصل یہ ہے کہ حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کے ناموں کا آجانا ایک ایسی سخت مشکل سمجھی گئی، جس کا کوئی عمدہ حل نظر نہیں آتا اس لیے تمام متاخرین اس سے متاثر ہوئے اور اس مشکل سے بچنے کے لیے سب نے ضروری سمجھا کہ حضرت نوحؑ ہی کی طرف ضمیر کو لے جائیں۔ یہاں تک کہ ہمارے جلالین نے تو اختلاف کا ذکر بھی نہیں کیا۔ بطور ایک مسلم قول کے "و من ذریتہ" کی تفسیر "و من ذریۃ نوح" ہی کر دی۔

حافظ ابن کثیر

جن لوگوں نے اس ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا، انھوں نے تذکرۂ حضرت لوطؑ و یونسؑ کی مشکل کا کیا حل کیا؛ اس کی تفصیل امام رازی نے نہیں کی حالانکہ پہلے قول کے دلائل پوری تفصیل کے ساتھ جمع کیے لیکن تفسیر بالروایت کے امام فن اور تمام طبقۂ مفسرین متاخرین میں اکمل و افضل، حافظ ابوالفداء ابن کثیر (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی بے نظیر تفسیر میں ان کے دلائل نقل کیے ہیں:

انہ دخل فی الذریۃ تغلیباً کما فی قولہ تعالیٰ: "ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ: ما تعبدون من بعدی؟ قالوا: نعبد الٰھک و الٰہ اٰبائک ابراھیم و اسمٰعیل و اسحٰق" فاسمٰعیل: عمہ و دخل فی اٰبائہ تغلیباً۔

حضرت لوطؑ کا ذکر اس سلسلے میں بطور تغلیب کے آگیا ہے، اگرچہ وہ نسل ابراہیمی سے نہ تھے، جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ "جب یعقوب نے اپنے بیٹوں سے پوچھا، میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے؟ تو انھوں نے کہا: ہم تیرے خدا اور تیرے آباؤ اجداد ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحاق کے خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔

(برحاشیۂ فتح البیان جلد ۴ صفحہ ۹۳۰)

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت یعقوبؑ کے چچا تھے، باپ نہ تھے۔ لیکن اولاد یعقوبؑ نے ان کو بھی "اٰبائک" میں داخل کیا۔ پس جس طرح یہاں تغلیباً ان کا نام لیا گیا ہے، اسی طرح نسل ابراہیمیؑ میں حضرت لوطؑ کو بھی داخل کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو محققین اس طرف گئے کہ ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف عائد ہے، وہ بھی اس مشکل سے پوری طرح متاثر ہوئے کہ حضرت لوطؑ و یونسؑ کا ذکر سلسلۂ ذریت میں کیوں آگیا؟ اور اس کے سوا اور کوئی حل نہ قرار دے سکے کہ حضرت لوطؑ کو تغلیباً ذریۃ ابراہیم علیہ السلام میں داخل کر دیا جائے۔

کیا جواب تسلی بخش ہے؟

لیکن کیا یہ جواب تشفی بخش ہو سکتا ہے؟ دلیل میں انھوں نے ایک آیت پیش کی ہے جس میں اولاد یعقوبؑ نے حضرت یعقوبؑ کے چچا (حضرت اسماعیل) کو بھی اُن کے "آبا" میں داخل کیا تھا، لیکن کیا یہ مثال واقعی اس مشکل کا حل کر دیتی ہے؟

زیادہ غور کی ضرورت نہیں، ایک سرسری نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ جواب نہ صرف ضعیف بلکہ ضعیف سے بھی کچھ زیادہ ہے اور قرار دادہ تغلیب کے ثبوت میں جو آیت پیش کی گئی ہے، اس سے پیش نظر مشکل کے لیے کوئی مدد نہیں ملتی۔

بلاشبہ اولاد یعقوبؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو بھی "ابائك" میں شامل کیا لیکن یہ کوئی طرز بیان کی مخصوص تغلیب نہیں، بلکہ لغت و زبان اور اطلاقات رسم و ملک کا عام سوال ہے۔ "چچا" اپنی بزرگی اور رشتے کی عظمت کے لحاظ سے ہر جگہ مثل باپ کے سمجھا جاتا ہے اور علی الخصوص عربی زبان میں تو "اب" کا اطلاق بکثرت "عم" پر ہوتا ہے خالہ کو بھی اہل عرب "ام" کہتے ہیں۔ "آزر" حضرت ابراہیمؑ کے چچا تھے، باپ نہ تھے۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام "تارح" ہے اور حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ابن جریحؒ اور سدیؒ نے اس کی تصریح کر دی ہے، لیکن قرآن کریم نے "آزر" کو اسی آیت کریمہ کے آغاز میں حضرت ابراہیمؑ کا "باپ" کہا: واذ قال ابراهیم لابیه آزر۔ خود احادیث میں اس اطلاق کے شواہد مل سکتے ہیں۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کی نسبت فرمایا تھا: ردوا علی ابی۔ حالانکہ حضرت عباسؓ آپ کے چچا تھے۔ پس اگر "ابائك" میں حضرت اسماعیل داخل کیے گئے تو یہ ایک ایسی تغلیب ہے جو لغت عرب میں رائج ہے اور "اب" کا اطلاق "عم" پر بربنائے لغت کیا جا سکتا ہے بلکہ لغت کی بنا پر "اب" کے مفہوم کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ فن لغت و الفاظ قرآنیہ کا ایک مسلم الثبوت امام لکھتا ہے:

"الاب" الوالد، و یسمی کل من کان سببًا فی ایجاد شی او اصلاحه و یسمی العم مع الاب ابوین، و کذالك الام مع الاب و الجد مع الاب۔

"الاب" یعنی باپ اور ہر اس وجود کو جو کسی چیز کی ایجاد یا اصلاح یا ظہور کا سبب ہو "اب" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں .... اور اہل عرب "ابوین" میں باپ کے ساتھ چچا کو بھی داخل کرتے ہیں اور ماں اور دادا بھی "اب" کے ساتھ تبعاً مفہوم میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(مفردات امام راغب اصفہانی صفحہ ۴)

لیس بشیءٍ

لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ اُن اشخاص کو بھی کسی شخص کی نسل میں داخل کر دیا جا سکتا ہے، جو اس کی نسل سے نہیں؟ "اب" کا اطلاق خود زبان عربی میں چچا پر ہوتا ہے اور اس لیے

حضرت اسماعیلؑ بھی آبار یعقوب میں شامل کر لیے گئے، لیکن عربی میں ذریت کا اطلاق غیر ذریت و نسل پر کب ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ بھی " ذریتہ " کے اطلاق میں آسکتے ؛ مثال جو دی گئی ہے وہ یقیناً لغت کے مطابق ہے اور اس لیے بالکل ٹھیک ہے، لیکن جس دعوے کے لیے اس سے شاہد کا کام لیا گیا ہے، اس کے لیے لغۃ میں گنجایش کہاں ہے ؛ کہا گیا ہے کہ وہ بھی تغلیب ہے اور یہ بھی تغلیب ہے، لیکن وہ تو ایسی تغلیب ہے جو لغۃ نے کی عرف و رسم نے کی اور اس کے شواہد موجود ہیں، مگر یہ کیسی تغلیب ہے جس کے لیے نہ تو لغۃ موید ہے، نہ عرف و عوائد اور نہ اور کوئی وجہ و سبب ہے ؛

غرض قائلین قول ثانی نے جو وجہ بتلائی ہے، وہ تشفی بخش نہیں اور " لیس بشئی " میں داخل ہے۔

کشفِ حقیقت

اب چاہیے کہ بطور خود اس آیت کریمہ پر تدبر کریں۔

بلاشبہ اس آیت میں " وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ " کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرف عائد ہے، اور جن مفسرین کرام نے اس کا مرجع حضرت نوحؑ کو قرار دیا ہے، ان کی تفسیر بوجوہ متعدد و بینہ مرجوح ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ان آیات میں ابتدا سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ انہی کے فضائل و مدارج کی خبر دی گئی ہے، انہی کی نسبت اپنے اس فضل و کرم کو بتلایا ہے کہ بقائے نسل و دوام ذکر کا مرتبہ عطا کیا گیا، وہی ہیں جن کو حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی سی اولاد و احفاد دی گئی، جن کے ذریعے سے نسل ابراہیمی نے ایک وسیع سلسلہ اقوام و انبیاء کا پایا۔۔۔

اب بیچ میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف صرف اس قدر اشارہ آگیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ان پر بھی ایسا ہی فضل الٰہی ہوا تھا، لیکن یہ بالکل ایسا درمیانی وغیر مسلسل جملہ ہے، جیسا ہم لوگ بیچ میں جملۂ معترضہ بول جاتے ہیں اور ترتیب بیان، ربط مضمون، احاطۂ موضوع، سلسلۂ ماسبق، داعیۂ مطالب، یہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اس درمیانی تذکرۂ نوحؑ کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ ربط و نظم کے خلاف ہے اور لوگ اسے کلام الٰہی کے لیے جائز رکھیں، مگر ہم جائز نہیں رکھ سکتے۔

جن مفسرین نے اس رائے کو قبول نہ کیا، بلاشبہ انھوں نے حقیقت شناسی کا زیادہ ساتھ دیا، لیکن افسوس کہ جس قدر ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، اس میں ان کی جانب سے کوئی تشفی بخش حل اُن مشکلات کا نہیں ملتا جو قائلین مذہب اول نے پیدا کر دیے ہیں۔

" ذریت " کے لفظ اور حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کے تذکرہ نے کچھ ایسا اُلجھاؤ پیدا کر دیا ہے کہ پہلی جماعت نے تو اس کو لاعلاج قرار دے کر سرے سے ضمیر ہی کو وہاں سے ہٹا دیا اور دوسری نے بھی تغلیب کے سوا اور کچھ چارۂ کار نہ دیکھا۔

ریت سے مراد دعوت ہے

لیکن دراصل اس کا حل دوسرا ہے، ممکن ہے ہم حقیقت سے کوئی قریب تر جگہ پا لیں۔ "ذریۃ" کی ضمیر تو ضرور حضرت ابراہیمؑ کی طرف پھرتی ہے۔ س میں کوئی شک نہیں لیکن "ذریۃ" کے لفظ سے یہاں مقصود محض جسمانی نسل ہی نہیں، انبیاء کی ذریت اصلی، ذریت مانی نہیں ہوتی اور نہ جسمانی نسل کوئی ایسی چیز ہے کہ اسے انبیاء کے لیے خدا ایک بہت بڑی نعمت قرار دے بلکہ اں حضرت ابراہیمؑ کی وہ عظیم الشان "ذریۃ" معنوی مراد ہے جو ان کی "دعوت موسسہ" سے مثل حضرت نوحؑ کے ا ہوئی اور پھیلی اور جس کے بڑے بڑے مجدد وہ انبیاء کرام علیہم السلام تھے، جن کے اسماء گرامی اس آیت کریمہ ں لیے گئے ہیں۔

خدا تعالیٰ یہاں اپنے احسان و فضل کا ذکر کر رہا ہے، جو خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر زول ہوا۔

لٰلہ تعالیٰ کے احسان

اس احسان کا ایک ٹکڑا تو خاص ان کی ذات و عہد سے تعلق رکھتا تھا کہ اللہ نے ان کے قلب کو تمام نقائص خارجیہ سے "سلیم" رکھا اور ان کی فطرت اصلیہ اسلامیہ کسی ارجی اثر ضلالت و نمائش بطلان سے مرعوب نہ ہوئی، نیز ان کو وہ "حجج الٰہیہ" عطا کیے گئے جن کے ذریعے سے انھوں نے پنے پاس عقل و ادراک انسانی کے لیے سب سے بڑا پیام ہدایت پایا، اور ان کے مراتب معنویہ مرتفع و سرفراز ہوئے۔

دوسرا حصہ احسان الٰہی کا وہ ہے جسے قرآن حکیم بقاء ذکر اور "لسان صدق فی الآخرین" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی حقیقت تم گزشتہ صحبتوں میں سن چکے ہو کہ مرتبۂ نبوت کی قوت "موسسہ" کی طرف اشارہ ہے، جو اپنی دعوت کے ذریعے سے ایک باقی و قائم امت صالحہ پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح آنے والے قرون و اجیال میں اس دعوت کا سلسلۂ ہدایت ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ ان کی دعوت کے گھرانے اور نسل کی زندگی افراد و اشخاص کی موت و حیات کے دائرۂ اثر سے باہر ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وجود موسس دنیا سے چلا جائے، لیکن اس کی "تاسیس" پر موت طاری نہیں ہوتی۔

پہلے قسم کے احسان کا ذکر اس آیت میں وہاں ختم ہوتا ہے، جہاں فرمایا کہ، وَتلك حُجّتنا اٰتینٰها ابراهیم علیٰ قومه، نرفع درجٰت من نشاء، ان ربك حكیم علیم ۔اور دوسرا احسان بقاء دعوت اور "لسان صدق فی الآخرین" کا وہ ہے جس کو یوں تعبیر کیا کہ، ووهبنالهٗ اسحٰق و یعقوب كلاً هدینا۔ نیز ہم نے حضرت ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد و احفاد دی، جن کے ذریعے سے دعوت ابراہیمی کے بقاء و تسلسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسرائیلؑ (حضرت یعقوبؑ) سے بنو اسرائیل کی امت پیدا ہوئی اور ان کی اصلاح و تجدید و احیاء کے لیے یکے بعد دیگرے انبیاء کرام (بہ تحت تاسیس ابراہیمی) آتے رہے۔

پس وہ "ذریت" اور "نسل" جو حضرت ابراہیمؑ کو خدا نے دی، جسم اور خون کی نسل نہیں، جس کے ماتحت تم حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کو کسی طرح نہیں لا سکتے اور اس لیے حیران ہو۔ جسمانی نسل حضرت ابراہیمؑ کے لیے کوئی انعام نہ تھی، بلکہ کسی پیغمبر کے لیے اللہ کا ممتاز انعام نہیں ہو سکتا۔ ان کا گھرانا دیوار و در کا احاطہ نہیں بلکہ حق اور تبلیغ حق کا رشتہ ہے۔ ان کا وجود گوشت اور پٹھوں کا ڈھانچا نہیں بلکہ شریعت اور شریعت کی پکار ہے۔ ان کا وطن گرد اور غبار کا کوئی منجمد ٹکڑا نہیں، بلکہ سچائی اور راست بازی کی دعوت کا رقبہ ہے، پھر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ان کی ذریت بھی جسم اور خون کی نہیں بلکہ دعوت الٰہی اور رسالت ربانی کے بقاء و قیام کی ہے؟

ساری مشکل اس آیت کی تفسیر میں لفظ "ذریت" سے پیدا ہو گئی ہے کہ حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ نسل ابراہیمی سے نہ تھے اور یہ مشکل سرتاسر نتیجہ اس کا ہے کہ صنف "تاسیس" و "تجدید" کی جو حقیقت گزشتہ صحبتوں میں واضح کی گئی ہے، وہ پیش نظر نہیں۔

یہاں "ذریت" سے مراد دعوت ابراہیمی کی وہ "ذریت" ہے جو ان کی دعوت "موسسہ" نے پیدا کی۔ وہ "مؤسس" تھے، مجدد نہ تھے۔ پس جو انبیاء مجددین دعوت ابراہیمی کے ذیل میں ظاہر ہوئے، قرآن حکیم نے ان میں سے چند ناموں کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے، اور بیچ میں حضرت نوحؑ کی "تاسیس" کی طرف اشارہ مماثلۃً کر دیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو کیسا کچھ مؤسس بنایا؟ اور کیسی نسل دعوت ان سے پھوٹی اور پھلی پھولی۔

حضرت لوطؑ کا معاملہ

سب سے پہلی دقت اس تفسیر میں حضرت لوطؑ کے متعلق ہے کہ ان کا نام کیوں آ گیا لیکن یہ دقت، دقت ہی کب ہے، جب کہ خود قرآن حکیم نے بتلا دیا ہے،

وَاِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ .... فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (عنکبوت، ۱۶-۲۶)	اور ابراہیم نے جب قوم سے مخاطب ہوتے کہا، اللہ کی پرستش کرو اور اسی سے ڈرو۔ اگر تم سمجھ رکھتے ہو کو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہاری فلاح اسی میں ہے .... لیکن قوم کی جہالت و ضلالت کے لیے یہ دعوت حق کچھ سودمند نہ ہوئی اور صرف لوط ابراہیم پر ایمان لائے۔

تورات کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ، حاران برادر تارح کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ (۱۱: ۲۷)

اور قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیت بتلاتی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم پر ایمان لائے اور ان کی دعوت کے ساتھی ہو گئے۔ پس حضرت لوطؑ گو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے نہیں تھے، ان کے بھتیجے تھے، لیکن چونکہ ان کی دعوت، دعوت موسسہ

مستقل نہ تھی بلکہ دعوت ابراہیمی ہی کے تابع تھی، وہ اسی دعوت موسسہ کے ایک مجدد تھے، اس لیے وہ حضرت ابراہیم کی "ذریت رسالت" ہی میں داخل تھے اور اسی لیے اس آیت میں ان کو بسلسلۂ مجددین دعوت ابراہیمی میں شامل کیا گیا۔

مجددین دعوت ابراہیمی

اس آیت کریمہ میں "ومن ذریتہ" کے بعد سے "علی العلمین" تک جتنے انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب کے سب بلا استثناء دعوت موسسۂ ابراہیمیہ کے مجدد ہیں، اور اسی لیے "ذریت" ابراہیمی میں داخل۔

ان کی تعداد چودہ ہے اور بیان میں ترتیب تاریخی نہیں، کیونکہ یہاں استقراء تاریخی مقصود نہ تھا، صرف دعوت موسسہ ابراہیمی کی بقاء و ذریت اور قیام سلسلہ کو ظاہر کرنا تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ: ومن ذریتہ: داؤد وسلیمان و ایوب و یوسف و موسٰی وھارون وکذالک نجزی المحسنین و زکریا و یحیٰی و عیسٰی و الیاس کل من الصّٰلحین و اسمٰعیل و الیسع و یونس و لوطا وکلًّا فضلنا علی العلمین!

بلاغت قرآنی کا اعجاز

گو اس کا موقع نہیں، لیکن کہنے کے لیے طبیعت میں بے اختیار بے قراری اٹھتی ہے کہ گو یہ تمام مقام مع چند اسماء کو عطف کے ساتھ جمع کر دینے کا تھا، لیکن بلاغت قرآنی یہاں بھی اپنے اعجاز سے غافل نہیں تم دیکھ رہے ہو کہ ان چودہ نبیوں کے ناموں کو ایک ہی جملہ میں نہیں گن دیا ہے، بلکہ اس کے تین ٹکڑے کر دیے ہیں اور سب کے درمیان وقف ہے۔ پہلا ٹکڑا "محسنین" پر ختم ہوا، دوسرا "صالحین" پر اور تیسرا "عالمین" پر۔ ایک بہت بڑا نکتۂ بلاغت اس میں یہ ہے کہ اگر ایک ہی جملۂ تامہ کے اندر یہ پورے چودہ نام آجاتے تو وہ ناموں کے اجتماع کا اتنا بڑا جملہ ہوتا جس کو بیک دم پڑھنے سے طبیعت نہایت گرانی و ثقالت محسوس کرتی۔ اس لیے بہ لحاظ اوصاف غالبہ ان انبیاء کی تین جماعتیں کر دیں اور ہر جماعت کے اسماء کے بعد اُن کی زندگی کے اُن غالب اوصاف کی طرف اشارہ کر دیا اور اس طرح ایک لمبا سلسلہ جس میں یکے بعد دیگرے معطوف ہوتے ہوئے چودہ نام آجاتے، تین چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملوں میں منقسم ہو گیا۔

بہرحال اس سلسلہ میں بقیہ انبیاء کے متعلق تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بنی اسرائیل میں آئے اور ہمارا استدلال یہ ہے کہ یہ تمام سلسلہ دعوتِ ابراہیمی کے مجددین ہی کا تھا، لیکن حضرت لوطؑ، حضرت یونس، حضرت الیاسؑ اور حضرت الیسعؑ کے متعلق مفسرین کو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔

حضرت یونسؑ کا معاملہ

حضرت لوطؑ کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ حضرت یونس بھی انبیاء اسرائیل کے سلسلے کے ایک نبی ہیں جن کا اصلی عبرانی نام "یوناہ" ہے۔ وہ "متی" کے بیٹے تھے۔ عہد عتیق کے صحائف میں عبدیاہ نبی کے بعد ان کے ظہور و مواعظ کا بھی ایک مستقل تذکرہ ہے۔ مثل متقدم انبیاء متاخرین

کے یہ بھی اُمّت اسرائیلی کے آخری عبادت گزاروں میں سے تھے۔

پس تعجب ہے کہ حضرت مفسرین (رحمہم اللہ) نے کیوں کر یہ قرار دے لیا کہ حضرت یونسؑ نسل ابراہیمی سے نہ تھے، اگر وہ مثل حضرت لوطؑ کے نہ ہوتے، جب بھی وہ ذریت ابراہیمی ہی میں داخل تھے کیونکہ سلسلۂ بنواسرائیل میں جتنے انبیاء کرام آئے، سب کے سب دعوت موسسۂ ابراہیمی کے مجدد تھے، لیکن لطف یہ ہے کہ جسمانی نسل کے اعتبار سے بھی حضرت یونسؑ نسل یعقوبؑ سے ہیں اور یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے اور اسحاقؑ حضرت ابراہیم کے (علیہم السلام)

حضرت الیاسؑ

حضرت "الیاس" کے متعلق بھی لوگوں نے عجیب وغریب قیاسات کیے ہیں اور بعض کا یہ حال ہے کہ وہ انبیاء کے عبرانی الاصل ناموں کے لیے عربی مادوں اور مصدروں کو ڈھونڈتے ہیں۔

دراصل تورات میں جو نام "ایلیاہ" کی شکل میں تم دیکھتے ہو، وہی عربی میں آکر "الیاس" ہوگیا ہے۔ حضرت ایلیاہ کا مفصل تذکرہ کتاب سلاطین اول و دوم دونوں میں موجود ہے۔ ان کا ظہور "اخی اب" پادشاہ کے زمانے میں ہوا، جو یہودی ہو کر بعلبک کے بتوں سے مرعوب ہوگیا تھا۔ ان کے متعلق کتاب سلاطین دوم (۲: ۱۰) میں لکھا ہے کہ جب یردن پار اُترے تو ایک آتشیں رتھ آسمان سے اترا اور وہ یکایک غائب ہوگئے۔ صدوقیوں کو انہی کے دوبارہ ظہور کا انتظار تھا۔

بہرحال یہ بھی ایک رسول اور مجدد اسرائیلی تھے اور دعوت ابراہیمی کی ذریت میں جسم و روح دونوں اعتبار سے داخل۔

حضرت الیسعؑ

حضرت "الیسعؑ" کے متعلق ان سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اور ان کی شخصیت کے متعلق کوئی صاف فیصلہ نہیں کیا گیا۔

بعض تو اسی عام غلط فہمی کی بنا پر کہ یہ نام عربی ہیں، الیسع مصادر و مواد ڈھونڈنے لگے۔ بعض نے "الیاس" اور "الیسع" دونوں کو ایک قرار دیا، بعض نے کہا کہ اس پر الف لام کا آنا اس کی عربیت کی پوری دلیل ہے۔

اس سے بھی زیادہ آجکل کے بعض مدعیانِ تحقیق جدید نے ٹھوکر کھائی ہے اور لکھا ہے کہ تورات میں جس نبی کا نام "یسعیاہ" آیا ہے اور جن کا ایک صحیفہ بھی موجود ہے، وہی الیسع ہیں۔

لیکن دراصل یہ تمام تحقیقات بے سُود ہے۔ مثل اور ناموں کے یہ نام بھی عبرانی ہے، مگر بغیر کسی تبدیلی کے بجنسہٖ عربی میں آگیا ہے۔ کتاب سلاطین اول و دوم میں جہاں حضرت ایلیاہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں ان کے ایک ساتھی "الیسع" بھی ہیں جو ان کی غیبت کے بعد ان کی نبوت کے وارث ٹھہرے اور جب یردن پار اُترے تو یریحو کے انبیاء زادوں نے پکارا، "ایلیاہ کی روح الیسع پر اُتری"

(سلاطین ۲: ۱۵)

اگر ہمارے مصنفین نے تورات کا مطالعہ کیا ہوتا تو یہ دقتیں پیدا نہ ہوتیں۔

بہر حال حضرت "الیسع" علیہ السلام بھی قطعاً اسرائیلی ہیں، اس لیے قطعاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جسمانی ذریت سے بھی ہیں اور ان کی روحانی ذریت سے بھی۔ وہ بھی مثل دیگر انبیاء بنو اسرائیل کے تجدید دعوت ابراہیمی کے لیے آئے جو شریعت موسوی کے نام سے موسوم تھی۔

تفسیر آئمۂ اہل بیت علیہم السلام

اور الحمد للہ کہ "و من ذریتہ" کی یہی تفسیر بعض ائمۂ اہل بیت کرام علیہم السلام نے بھی کی ہے اور فی الحقیقت ان خزائن و ینابیع علوم نبوت سے بڑھ کر اور کون ہے جس کی تفسیر مقبول و مطلوب ہو سکتی ہے؛

حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت امام باقر علیہ وعلی اجدادہ وآبائہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ آپ لوگ حضرت حسنین علیہما السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن سے ثابت ہے مگر میں نے تمام قرآن کا مطالعہ کیا، مجھے کہیں ان کا ذکر نہیں ملا۔

اس پر حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا؛

الیس تقرء سورۃ الانعام "و من ذریتہ داؤد و سلیمٰن" حتّٰی بلغ: و یحیٰی و عیسٰی، فقال: الیس من ذریتہ ابراھیم و لیس لہ اب؟	"کیا تو نے سورۂ انعام میں یہ آیت نہیں پڑھی کہ: و من ذریتہ داؤد و سلیمٰن" اور کیا اسی سلسلہ میں حضرت یحیٰی اور حضرت عیسٰی علیہما السلام کا بھی نام نہیں آیا؟ اگر آیا ہے تو حضرت عیسٰی، حضرت ابراہیم کی ذریت کیونکر ہوئے، حالانکہ ان کا باپ نہ تھا؛

جواب کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کے نسب کی بنا پر خدا نے حضرت عیسٰی کو ذریت ابراہیم قرار دیا تو پھر حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کے لخت جگر کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت نہ ہوں؛

امام رازی وغیرہ نے اس جواب کو حضرت امام باقر علیہ السلام کی طرف نسبت دی ہے، لیکن حافظ ابوالفدا نے بسلسلۂ روایت یحیٰی بن یعمر کی طرف منسوب کیا ہے۔ میں نے حضرات مفسرین اثنا عشریہ کی مصنفات اس غرض سے دیکھیں تو تفسیر صافی میں بجنسہ حضرت امام کا مندرجۂ صدر قول مل گیا۔

اس جواب سے ثابت ہوا کہ آیت انعام میں "و من ذریتہ" کی ضمیر کا حضرت ابراہیمؑ کی طرف عود اس درجہ مسلّم تھا کہ جب حضرت امام نے استدلال کیا تو معترضین نادین کچھ جواب نہ دے سکے۔

نیز یہ کہ حضرت آئمہ اہل بیت نبوۃ علیہم السلام کا بھی یہی مسلک تھا۔ وَالحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

باب ۱۶

قصص قرآن

سلسلۂ ابراہیمی کے صاحب شریعت رسول

حضرت موسیٰ اور حضرت رسول اکرم صلعم

—(۱)—

حضرت موسیٰ اور داعی اسلام صلعم

سلسلۂ ابراہیمی میں دراصل صرف دو ہی صاحب شریعت رسول آئے۔ پہلا بنی اسحاق میں خاندان بنی اسرائیل کا اولوالعزم پیغمبر، جس نے فراعنۂ مصر کی شخصی حکمرانی اور محکومی و غلامی سے اپنی قوم کو نجات دلائی، دوسرا اس کے مورث اعلیٰ خلیل اللہ کی مقدس دعا کا مقصود و مطلوب اور بنی اسماعیل کا بنی امی، جس نے نہ صرف اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے وطن کو، بلکہ تمام عالم انسانیت کو انسانی حکمرانی کی لعنت سے نجات دلائی، وما ارسلنٰك الا كافة للناس بشيراً و نذيراً (سبا ۲۸)

حضرت عیسیٰ

(مسیح ناصری) شریعت موسوی کا ایک مصلح تھا، خود صاحب شریعت نہ تھا۔ اس کی مثال ان مجددین ملت قویۂ اسلامیہ کی سی تھی، جن کا حسب ارشاد صادق مصدوق، تاریخ اسلام میں ہمیشہ ظہور ہوتا رہا۔ وہ کوئی شریعت نہیں لایا۔ اس کے پاس کوئی قانون نہ تھا۔ وہ خود بھی قانون عشرۂ موسویہ کا تابع تھا اس نے خود تصریح کر دی کہ "میں تورات کو مٹانے نہیں بلکہ پورا کرنے کے لیے آیا ہوں"۔ اس نے کہا کہ "میرا مقصد صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش ہے"۔ اسی لیے اس نے اپنی اصلاح کو صرف یہودیوں تک محدود رکھا، اور غیر قوموں میں وعظ کرنے کی ممانعت کر دی۔ پس دو ہی شریعتیں ہیں، جو سلسلۂ ابراہیمی میں آئیں، اور دو ہی تھے جن کو خدا نے اپنے قانون کا ایلچی بنایا۔

دو خصوصیتیں

یہی سبب ہے کہ جب خدا نے موسیٰ (ع) سے کلام کیا، اور اس کو شریعت الٰہیہ کے ظہور آخری کی خبر دی تو کہا:

"تیرا خدا تیرے لیے، تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی بھیجے گا، تو اس کو مانیو! میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ جو کچھ میں اس سے کہوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا!"

(تورات۔ کتاب استثنا۔ باب ۱۸)

آیت ۱۹ اس ارشادِ الٰہی میں ظہورِ رسالتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کی خبر دیتے ہوئے وجودِ منتظر اقدس کی دو خصوصیتیں بیان کی گئیں ؛

۱۔ وہ حضرت موسیٰ کے مانند ہوگا۔

۲۔ خدا کا کلام اس کے مُنہ میں سے ظاہر ہوگا، اور جو کچھ خدا اس سے کہے گا، وہی وہ انسانوں کو سنائے گا۔

قرآن کریم نے بھی ان دو خصائص نبویہٗ محمدیہ کی طرف اشارہ کیا۔

دوسری خصوصیت کے لیے سورہ (والنجم) کے آغاز پر نظر ڈالیے، جہاں فرمایا؛

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىۙ (النجم : ۳-۴)

وہ اپنی خودی اور ارادے سے کچھ نہیں کہتا۔ اس کے مُنہ سے جو کچھ نکلتا ہے، وہی ہے جو اس پر وحی کیا جاتا ہے۔

پہلی خصوصیت کی تصریح سورہ (مزمل) میں کی ؛

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۗ (المزمل : ۱۶)

ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو ہدایت و ضلالت کا تم پر گواہ ہے، بالکل اسی طرح، جیسا کہ فرعون کی طرف حضرت موسیٰ کو بھیجا تھا۔

غرض حضرت موسیٰ سے حضرت داعی اسلام علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مماثلت و مشابہت کو تورات اور قرآن، دونوں نے بیان کیا ہے۔

اسباب و وجوہ مماثلت جن لوگوں نے تورات کی اس بشارت بیّنہ پر بحث کی ہے، ان کے لیے ہمیشہ یہ ایک نہایت دلچسپ اور اہم سوال رہا ہے کہ اس مماثلت کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اور دونوں برگزیدہ رسولوں کے اعمال اور نتائج اعمال میں وہ کون سی مشابہتیں اور یکساں حالتیں ہیں، جن کی بنا پر اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے کا مثیل و مانند قرار دیا؛

قرآن کریم کے قصص و مواعظ اور حکم و معارف کے متعلق "الہلال" کا جو انداز بحث و نظر ہے، اس کے لحاظ سے اس موضوع بحث میں بھی بہت سے ملاحظات خاص ہیں، جن کو فرداً فرداً واضح کرنا ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب "اسوۂ موسوی" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا جائے گا اور اسی کے ضمن میں یہ بحث عظیم و مفید بھی پیش کش ارباب ذوق و نظر ہوگی، وما توفیقی الا باللہ۔

قرآن کریم نے اپنے قصص و مواعظ میں سب سے زیادہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا کیوں ذکر کیا ؟ اپنے تمام

لہ ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

کے اعلان اور ابتلاء و تعذیب کے اظہار، دونوں کے لیے زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے تذکرہ کو کیوں منتخب فرمایا؛ انقلاب وحوادث کی تعبیر و تمثیل کے لیے دنیا کی اور بہت سی قومیں موجود تھیں، ان سب میں سے صرف ایک یہی قوم کیوں ہر موقع پر پیش کی گئی؛

یہ نہایت اہم سوالات ہیں اور تفسیر کلام اللہ کے ضروری اجزاء جن کا جواب اِن شاءَ اللہ اُسی مضمون سے ملے گا۔

بنی اسرائیل اور امت مرحومہ

لیکن اس سلسلے کے اطراف بحث میں سے ایک بحث خاص قوم بنی اسرائیل اور امت مرحومۂ محمدیہ کی باہمی مماثلت و مشابہت بھی ہے، اور یہ بھی دراصل اسی مماثلت اُولی پر متفرع ہے۔ وقت اور حالات کا اقتضا ہے کہ کم از کم آج ایک سرسری اور غیر مرتب نظر صرف اس ٹکڑے پر ڈال لیں کہ مستقبل کی فرصتوں پر (جن کی امید ہے، مگر جن پر اختیار نہیں) کس کس ارادے کو ملتوی رکھیں؛

حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۵

(طٰہٰ: ۸۷ - ۸۸)

اے موسیٰ! مصر سے ہم، لوگوں کے سونے چاندی کے زیور لے آئے تھے، یہاں ہم نے انھیں پھینک دیا۔ اس طرح سامری نے ان زیوروں کو گلا کر ایک گوسالے کی شکل کا بُت بنایا، جس میں سے آواز بھی نکلتی تھی، لوگ پکارے کہ یہی تم لوگوں کا اور موسیٰ کا خدا ہے۔

پھر،

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۵ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۵

(طٰہٰ: ۹۰ - ۹۱)

ہارون نے پہلے انھیں صاف صاف بتلا دیا تھا: لوگو! تم ایک فتنے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تمھارا خدا تو بس وہی ہے نہایت رحم والا۔ کہاں جاتے ہو؟ آؤ، میرے پیچھے چلو، میری بات مانو، ان گمراہوں نے کہا، ہم اپنے اس طلائی خدا کو چھوڑ نہیں سکتے اور ہم تو آخر تک اسی کے سامنے معتکف رہیں گے جب تک موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آجائے۔

پیغمبر کے ارشاد سے سرتابی

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! خدا کی نعمتوں کو ایک ایک

اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ
اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ٥ يٰقَوْمِ
ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ
لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِيْنَ ٥ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا
جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا
مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ٥ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ
الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ
الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ
وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا
فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ٥ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ
اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا
وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ٥ قَالَ فَاِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ٥

(مائدہ: ۲۰ - ۲۵)

کر کے یاد کر، اس نے تجھ کو حکومتیں دیں اور بادشاہیاں بخشیں،
اور جو تجھ کو دیا وہ دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔ اے میری قوم!
میری بات سن اور ارض مقدس میں جس کو خدا تیرے حصہ میں
لکھ چکا ہے، چل اور داخل ہو، اور پشت نہ پھیر، کہ خسران و
نقصان میں گرفتار ہو جائے گی۔ لیکن گنہگار قوم نے سرتابی کی
اور کہا کہ اے موسیٰ! اس پر تو ایک جبار و قوی قوم قابض ہے
ہم تو وہاں اس وقت تک نہیں جائیں گے، جب تک کہ خود
وہ نہ نکل جائیں۔ اگر وہ اس سرزمین کو چھوڑ کر نکل گئے تو پھر ہم
کو وہاں جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس پر خدا کی نعمتوں سے
دو بہرہ مند انسانوں[1] نے کہا کہ ڈرو نہیں اور نہ خدا کے
وعدے کو جھٹلاؤ۔ شہر کے دروازے میں چل کر داخل ہو جاؤ۔
فتح تمہیں کو ہوگی، خدا پر بھروسا رکھو، اگر تم میں کچھ بھی ایمان ہے
وہ بولے، اے موسیٰ ہم تو اس قوت والی قوم سے لڑنے
نہیں جائیں گے اور نہ اس سرزمین میں داخل ہوں گے۔ تم جو
کہہ رہے ہو، اور تمہارا خدا جو حکم دے رہا ہے، تو تم ہی
دونوں جاؤ، اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ نے جناب
الٰہی میں عرض کی، خدایا! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا
کسی پر زور نہیں رکھتا، ہم میں اور اس گنہگار قوم میں تفریق
کر دے۔ خدا اس قوم کی سرکشی سے غضبناک ہوا اور اس نے
کہا کہ وہ پاک زمین چالیس برس تک اُن پر حرام رہے گی، وہ
زمین میں سرگرداں و پریشاں بھٹکتے پھریں گے۔ اے موسیٰ!
ان گنہگاروں کا کچھ غم نہ کھانا۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ٥

(بقرہ: ۵۸)

دیکھو ارض مقدس کے دروازے میں جھک کر داخل ہو اور
کہو کہ خدا ہمارے گناہ کا غبار جھاڑ دے، اب ہم تمہارے
گناہ بخش دیں گے اور نیکوں کے درجہ کو بڑھائیں گے۔

---

[1] توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں سے یہ دو بہرہ مند انسان یوشع بن نون اور کالب بن یفنّہ تھے (گنتی، باب ۱۴، آیت ۶)

دائمی معجزۂ محمدیہ نبوت محمدیہ کی حقیقت وثبوت کے لیے سیکڑوں دلائل و معجزات اور براہین و آیات ہیں، جو سوا تیرہ برس ہُوے، مکہ میں کفار قریش کے سامنے ظاہر ہوے۔ اہل بصیرت نے انھیں دیکھا اور قبول کیا۔ لیکن ایک معجزۂ محمدیہ ہے، جو کسی زمانہ کے ساتھ متعین نہیں، کسی آبادی میں محدود نہیں، اور ناظرین و مشاہدین خاص سے مخصوص نہیں، اسے دنیا دیکھتی اور قبول کرتی ہے۔

وہ معجزہ، امت مرحومہ کے حالات و حوادث کا اظہار اور اس کے ہر زمانہ کے دور تغیر و انقلاب کا بیان ہے اس نے ہم کو جس ظہور و فتح کی بشارت دی، ہم نے اسے پایا۔ اس نے ہم کو جن حالات و حوادث کی اطلاع دی، ہم نے انھیں دیکھا۔ اُس نے ہم کو جن فتن و مصائب کی خبر دی، ہم نے ان کا مشاہدہ کیا۔ آخر میں اس نے ہم سے کہا:

لتتبعن سنة من كان قبلكم (اى اليهود) باعًا بباع و ذراعًا بذراع و شبرًا بشبرا حتّٰى لو دخلوا فی جحر ضب لدخلتم فيه۔

تم سے پہلے جو قوم تھی (یعنی یہودی) تمھاری حالت بھی بالکل انھی جیسی ہوگی۔ ایک گز، ایک ہاتھ اور ایک بالشت کا بھی فرق نہ ہوگا، یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں گھسے ہوں گے، تو تم بھی گھسو گے۔

مماثلت کے پہلو جس طرح بنی اسرائیل کا باپ یعقوب اپنے گھرانے کو لے کر ارض کنعان سے مصر آیا، جہاں اس نے خیر و برکت اور حکومت و قوت پائی، اسی طرح ہم کو بھی ہمارے بزرگ ارض عرب سے لے کر تمام اطراف عالم میں پھیلے۔ ہم نے جدھر رُخ کیا، خیر و برکت اور حکومت و قوت کی نعمتیں اپنے ساتھ پائیں۔ حضرت یوسف نے عزیز مصر سے کہا تھا کہ "اجعلنی علیٰ خزائن الارض (۱۲ : ۵۵)" مجھ کو زمین کی خزینہ داری پر متعین کر دیجیے لیکن ہمارے سامنے خود زمین نے اپنے خزانے اُگل دیے اور پکاری کہ مجھے قبول کر لو!

بنی اسرائیل ایک مدت تک مصر کی سرزمین میں بڑی عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے، تا آنکہ فرعون مصر نے ان کے عہد سے توڑ دیے، اُن کے مناصب چھین لیے، ان کے عزیز فرزندوں کا خُون بہایا، اور ان کی عورتوں کو ذلت کی زندگی جینے کے لیے زندہ رکھا۔

ہم بھی جس سرزمین میں گئے، ایک مدت تک عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے، تا آنکہ فراعنۂ عصر نے ہمیں ہماری شہنشاہیوں سے معزول کر دیا، ہماری عزت و جلال کے تخت اُلٹ دیے۔ ہمارے بھائیوں اور فرزندوں کا خون بہایا۔ کبھی گرم ریگستانوں میں، کبھی سنگلاخ زمینوں میں، کبھی آباد شہروں میں اور کبھی کسی مقدس عمارت کی دیوار کے نیچے!! ہماری عورتیں بھی مردوں کے بعد زندہ رہیں کہ ذلت و نکبت قومی کے تماشے دیکھیں۔ بنی اسرائیل کا فرعون ایک تھا، جو افریقہ کے ایک گوشے میں صرف "الیس لی ملک" پر مغرور تھا لیکن ہمارے سامنے

ہر زمانہ کی ایک جماعت ہے، جس کا فرعون اکبر صرف " الیس لی ملک مصر " (کیا میرے قبضہ میں ملک مصر نہیں) ہی کا زور نہیں ہے، بلکہ " الیس لی العالم کلہ ؟ " کیا تمام دنیا میرے لیے نہیں) کا مدعی ہے !!

فرعون کی غرقابی

خدا نے اس وقت بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کو کھڑا کیا جنھوں نے فرعون کی غلامی سے قوم کو نجات دلائی اور فرعون کو اس کے نوکروں اور رتھوں کے ساتھ اس بحر احمر میں ڈبو دیا، جو بہتے ہوئے پانی کی ایک خلیج ہے۔

ہم میں سے بھی ہر دور فرعونیت میں نئے نئے موسیٰ اٹھے، جنھوں نے ہمیں فرعونوں سے نجات دلائی اور انھیں ان کے سامانوں کے ساتھ اُس " بحر احمر " میں ڈبو دیا، جو بہتے ہوئے خونوں کا حقیقۃً ایک سرخ دریا تھا!

سامری کا فتنہ

عبور بحر احمر کے بعد بنی اسرائیل میں (سامری) پیدا ہوا جس نے انھیں دین موسوی سے بیزار کیا، ان کی جمعیت سیاسیہ کو منتشر کر دیا، سونے چاندی کے زیوروں کو بہ زور سحر بچھڑے کی صورت میں ڈھال کر خدا بنایا، آستانہ الٰہی سے مغرور ہو کر اپنا اور اس اسرائیل کے گھرانے کا سر اُن کے آگے جھکایا جسے کہا گیا تھا،

" سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔"

" اور تو (بتوں) کے آگے سرخم مت ہوجیو، نہ ان کی بندگی کیجیو، اس لیے کہ میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں۔

ہندوستان کی کیفیت

مسلمانوں کے لیے بھی ہر دور موسوی میں خود ان کی قوم سے " سامری " اُٹھے، جنھوں نے حق کے ابطال اور باطل کے احقاق کی کوشش کی۔ اسلامی ممالک کے دیگر اطراف و جوانب سے قطع نظر کیجیے! خود اس ہندوستان میں بھی ایک سامری اُٹھا، جس نے اپنی جاہ و عزت کے جادو سے مسلمانوں کو عجیب و غریب کرتب دکھائے۔ اُس نے ملتِ بیضا کی تحقیر کی، قلوب کو مذہب سے بیزار کیا، مسلمانوں کی جمعیت سیاسی کو منتشر کیا، اور خدا سے مغرور ہو گئے۔ اصنام حیوانیہ کے آگے، نہیں بلکہ " انسانی بتوں " کے سامنے اپنا اور تمام قوم کا سر جھکا دیا اور اس خلیل کے فرزندوں کو بت پرستی کی دعوت دی، جس نے کہا تھا،

بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ۔ (انبیاء: ۵۶)	تمہارا خدا وہ ہے، جو آسمان و زمین کا خدا اور ان کا خالق ہے!

اور کہا،

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ؟ (انبیاء: ۵۲)	یہ کیسے بت ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو؟

وہ خدا کے عجائبات قدرت کا منکر تھا، لیکن انسانی خداؤں کی قدرت و استیلاء سے مرعوب تھا۔ وہ گو ملکوتی صفت انسانوں کے خوارق عادات، اور دلائل معجزات کا قائل نہ تھا، لیکن وہ خود شیاطین انس کے عمل زیر لبی کا معتقد اور سحر خوش لقبی سے مسحور تھا۔ اس نے سونے چاندی کے سکوں سے تبدیل کیمیادی کر کے ایک صنم خاکی بنایا، جس سے صدائے باطل پرستی اٹھتی تھی، پھر کہا:

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى۔ (طٰہٰ: ۸۸) دیکھو، تمھارا اور موسیٰ کا خدا یہ ہے!

اس دور فرعونیت و سامریت ہند کے ہارون نے اسے سمجھایا:

يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝ (طٰہٰ: ۹۰)

لوگو! تم فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہو، تمھارا خدا تو وہی رحمٰن خدا ہے۔ میرے پیچھے چلو، اور میری بات مانو۔

لیکن "فرعون" سے ڈرنے والوں "سامری" کے پیروکاروں اور صنم خاکی کے پرستاروں نے جواب دیا:

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ۔ (طٰہٰ: ۹۱) ہم تو کبھی اس خدائے مجسم کو نہیں چھوڑیں گے!!

بنی اسرائیل کی بے ہمتی

جب بنی اسرائیل آگے بڑھے اور خدا نے انھیں "نور علم و ہدایت" سے سرفراز کیا، اور خود انھوں نے "گزشتہ" پر ندامت ظاہر کی، تو اس عہد کے موسیٰ صفت انسانوں نے کہا:

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۱)

لوگو! خدا کی نعمتوں کو یاد کرو! اس نے تم کو حکومتیں دیں، شہنشاہیاں بخشیں، اور پھر تم کو ایمان کی وہ قوت دی جو دنیا میں کسی کو نہیں دی۔ لوگو! آؤ اس ارض مقدس میں داخل ہو جس کو خدا نے تمھارے حصہ میں لکھا ہے۔ پشت نہ پھیرو ورنہ خسران و نقصان اٹھاؤ گے۔

جو لوگ "فرعون" کی جاہ و حشمت سے مرعوب اور "عمالقہ" کی قوت و استیلاء سے دہشت زدہ تھے، وہ بولے:

يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ

اے موسیٰ! اس سرزمین پر آج ایک جابر و قاہر قوم قابض ہے، جب تک وہ خود اس کو چھوڑ کر نکل جائے

يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (مائدہ، ۲۲) — ہم تو اس سرزمین میں قدم نہ رکھیں گے۔

ان "اسرائیلیان زمانہ" کی نادانی کتنی عجیب اور ان کی حقیقت ناشناسی کتنی درد انگیز ہے جو ایک "جبار نما قوم" کی سطوت و قہر سے خوفزدہ ہوئے، پھر عجیب تر اور درد انگیز تر یہ کہ اس نے کہا، "ہم ارض مقدس اس وقت داخل ہوں گے، جب دشمن خود اسے ہمارے لیے خالی کر دیں گے"۔

انتہائی نادانی اور بے خبری

نادانو! غور کرو! یہ "قاہر و جابر قوم" خود "ارض مقدس" میں کس طرح داخل ہوئی؟ کیا اس کے دشمنوں نے شہر اس کے لیے خود خالی کر دیا تھا، جیسا کہ تم ان سے امید رکھتے ہو؟ یا خود اس نے ان سے خالی کرالیا تھا، جیسا کہ درحقیقت ہوا؟

اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (مائدہ، ۲۳)

چلو، شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور جب وہاں داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی فتح مند و غالب رہو گے۔ ان کی قوت اور ساز و سامان کی پروا نہ کرو۔ خدا پر بھروسا رکھو، اگر تم میں ذرا بھی ایمان ہے۔

"اسرائیلی" جو اپنے سینوں میں خوفزدہ قلوب رکھتے تھے اور قلوب میں قنوط و یاس کے سبب سے شرک و کفر کی سیاہی و ظلمت تھی، ڈرے کہ "قوم جبار" جو ظاہری ساز و سامان میں ان سے زیادہ ہے انھیں پامال کر دے۔ انھوں نے صاف کہہ دیا،

اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (مائدہ: ۲۴)

ہم ہرگز ہرگز اس وقت تک اس پر قبضہ کرنے نہ جائیں گے، جب تک کہ یہ قوت والی قوم وہاں موجود ہے، تم جو کہہ رہے ہو اور تمھارا خدا جو حکم دے رہا ہے، تو بس یہی دونوں لڑنے کے لیے جائیں، ہم تو بس یہاں بیٹھے ہیں۔

اب کس پامالی کا ڈر ہے؟

لیکن اے یہود کی زندگی جینے والو! جب اُس "ارض مقدس" کو، جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے، اور جسے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا نے تمھارے باپ دادوں کو دیا تھا۔ اس "قہار و جبار قوم" نے پامال کر دیا ہے اور تمھاری وراثت تم سے چھین لی ہے تو اب کس پامالی سے ڈرتے ہو؟ اور اب کون سی وراثت باقی رہ گئی ہے، جس کے مالک بننے کی امید کرتے ہو؟

اس عہد کے موسیٰ نے یہ کہا، پر ان کا دل نرم نہ ہوا اور نہ "ارض مقدس" پر اپنی جانوں کی قربانیاں چڑھائی گئیں کہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہوتا، بلکہ انھوں نے اسے جھٹلایا۔ "خدا جباروں سے لڑنے کا حکم دیتا ہے"۔

یہ دیکھ کر صالحین و مومنین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے:

رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَ أَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ۔

خدایا! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی اور پر زور نہیں رکھتا، ان گنہگاروں میں اور ہم میں تفریق کر دے

(المائدہ: ۲۸)

باب ۱۰

سلسلہ ابراہیمی کے صاحب شریعت رسول

حضرت موسیٰ اور حضرت رسول اکرم صلعم

—(۲)—

خدا نے سنا اور مومنین و فاسقین میں امتیاز کیا، اور وہ نور امتیاز اپنے مخلصین کو بھی بخشا، جس سے انھوں نے فاسقین کو پہچانا، جنھوں نے اپنے پکارنے والوں کی آواز نہیں سُنی تھی۔ خدا کا کلام ان تک پہنچا لیکن انھوں نے کہا "سمعنا و عصینا (۲-۸۷)" ہم سنتے ہیں اور نہیں مانتے!" واشربوا فی قلوبھم العجل بکفرھم۔ (۲-۸۷)"۔ اس صنم نقرئی و طلائی کی محبت ان کے کفر کے سبب رگ رگ میں سما گئی۔

تب خدا کا غضب اس قوم پر بھڑکا، اور اس نے کہا؛

فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۵ : ۲۶)	اس "ارض مقدس" میں داخل ہونا اب چالیس برس تک تمہارے لیے حرام کر دیا گیا۔ سرگرداں و پریشاں ملک میں پھرتے رہو! اے موسیٰ! ان گنہگاروں کا تم کچھ غم نہ کھانا۔

توبہ و انابت

لیکن اے خدا! جن پر چالیس برس تک تیرا غضب بھڑکا وہ اپنی سزا کو پہنچ چکے اور اب وہ اپنی "چہل سالہ گمراہی" کے بعد تیری طرف جھکے ہیں اور جیسا تو نے حکم دیا تھا کہ؛

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ۔ (۲ : ۵۵)	ارض مقدس کے دروازے میں خدا کے سامنے جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔

اب وہ صداقت و حریت کے اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے ہیں تاکہ "ارض مقدس" کو "جباروں" کی نجاست سے پاک کریں، اور جیسا کہ تو نے کہنے کے لیے کہا تھا؛

حِطَّةٌ ۔ (۲ : ۵۵)	خدایا! ہمارے گناہ جھاڑ دے۔

اب وہ کہتے ہیں کہ "ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا" پس اپنا وہ وعدہ پورا کر، جو تو نے کیا تھا کہ:

نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۲ : ۵۵)	ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور نیکوں کے مراتب و مدارج بڑھا دیں گے۔

مصر کے سامی فاتح

اس سے پہلے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے ہم کو پندرھویں صدی (ق م) میں مصر کے

سیاسی حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

تقریباً دو ہزار قبل مسیح حدود عرب سے ایک سامی قوم جو مختلف قبائل کا مجموعہ تھی، مصر پر حملہ آور ہوئی اور اسے فتح کیا۔ عرب اس کو عاد، ثمود اور مدین وغیرہ قبائل کا مجموعہ سمجھتے ہیں، اسرائیل اسے "عمالیق" کہتے ہیں، اہل بابل و عراق کے ہاں اس کا نام "عربی" اور "عمورانی" ہے اور خود مصری اس کو بہ نظر تحقیر "شاشو" اور "ہیک شاس" یعنی "شاہان بادیہ" اور "شاہان چوپان" کہتے ہیں، کیونکہ عرب کے سامی بادیہ نشین درحقیقت اونٹوں کے چرواہے تھے۔

مصر، عہد قدیم سے دو حصوں پر منقسم ہے: مصر بالا اور مصر زیریں۔ مصر زیریں بالکل بحر احمر کے کنارے حدود عرب کے مقابل واقع ہے، نہر سویز کے کھدنے سے پہلے بحر روم اور بحر احمر کے مابین، ایک چھوٹا سا خشک قطعہ حاجز تھا، جو مصر کو حدود عرب و جزیرہ نمائے سینا سے ملاتا تھا۔ نہر سویز اسی خشک قطعۂ ارض کو کاٹ کر اور ان دونوں سمندروں کو باہم ملا کر بنائی گئی ہے، درحقیقت اس نہر نے اس دیوار کو جو مشرق و مغرب یا یورپ و ایشیا کے درمیان حائل تھی، منہدم کر دیا، جس سے سیلاب فتنہ و بلا کو مغرب سے مشرق میں داخل ہونے کے لیے نہایت آسان راستہ ملا۔

شاشو یا عمالیق اسی خشک راستہ سے، جزیرہ نمائے سینا ہو کر مصر زیریں میں چلے آئے[۱] مصر کے خاص باشندے جو سام کے بھائی "حام" کی اولاد تھے، شکست کھا کر مصر بالا میں چلے گئے۔ ان سامی فاتحین نے یہاں ایک عظیم الشان حکومت قائم کی، جو تقریباً تین چار سو برس تک عمالیق کے لیے نشان فخر و امتیاز رہی۔ عام سامی قبائل مختلف اوقات و حالات میں اپنے ہم نسب و خاندان قوم کے پاس بغرض استمداد و استعانت آتے جاتے رہتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا سفر مصر

یہی سبب ہے کہ بیسویں صدی (ق۔م) میں سرخیل قبائل سامیہ حضرت ابراہیم خلیل کو بابل و عراق یعنی کلدان سے حدود مصر و شام کی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر جب اس ملک میں قحط نمودار ہوتا ہے، تو حضرت مع اپنی بیوی سارہ کے یہاں سے مصر کا رخ کرتے ہیں۔ مصر زیریں کا سامی بادشاہ جب ایک سامی خاندان کی آمد کی خبر پاتا ہے، اور اس کے ساتھ ایک خاتون کا ہونا بھی سنتا ہے، تو اسے اپنے قدیم خاندان سے اتصال کے شوق میں نکاح کا پیغام دیتا ہے، لیکن یہ سن کر وہ شوہر دار خاتون ہے، سوء قسمت پر افسوس کرتا ہے۔ بالآخر سعادت اتصال خاندان اس طرح حاصل کرتا ہے کہ اپنی بیٹی "ہاجرہ" کو حضرت کی خدمت میں دے دیتا ہے، جس سے اسماعیلی عربوں کی نسل پیدا ہوتی ہے[۲] حضرت ابراہیم

---

[۱] عام اصطلاحات مصر کے تعلق میں عموماً غلط فہمی پیدا کر دیتی ہیں۔ مصر زیریں سے مراد ہے شمالی مصر، جس میں ڈیلٹا واقع ہے۔ مصر بالا سے مراد جنوبی مصر۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مصر زیریں ہی پر چرواہے بادشاہوں کا قبضہ ہوا تھا اور انہی میں سے کسی ایک فرمانروا کے زمانے میں حضرت یوسفؑ مصر

[۲] یہودیوں کا بیان ہے کہ "شاہ مصر" نے زبردستی حضرت سارہ کو اپنے تصرف میں لانا چاہا تھا اور بالآخر حضرت سارہ (باقی اگلے صفحہ

نی دونوں بیویوں کے ساتھ بیل، گدھا، خچر اور اونٹ وغیرہ بہت سامان جہیز میں لے کر کنعان واپس آتے ہیں۔

بھائیوں میں تفرقہ اور اتصال

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے اسماعیل و اسحٰق ہوئے۔ اسماعیل ملک عرب میں آباد ہوئے۔ اسحاق سے یعقوب پیدا ہوئے جن کا دوسرا نام "اسرائیل" تھا۔ ان کی اولاد "بنی اسرائیل" یعنی فرزندانِ اسرائیل کہلائی اور خدا نے خود اپنی زبان سے انھیں برکت دی۔

حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں میں سے جن کی نسل سے بنی اسرائیل کے بارہ گھرانے قائم ہوئے، ایک بیٹے حضرت یوسفؑ تھے۔ بھائیوں کے اسی تحاسد برادرانہ سے مغلوب ہو کر جس نے اس سے پہلے اس گھرانے کے ... اور بھائیوں یعنی" اسماعیل و اسحاق "میں افتراق کر دیا تھا، اپنے بھائی یوسف کو ایک اسماعیلی قافلے کے ہاتھ ... عرب سے مصر کو جا رہا تھا، بیچ ڈالا۔ عجائب ایام دیکھو کہ آخر الامر بنی اسحاق اور بنی اسماعیل کا اس عجیب طریقے سے اتصال ہوا۔

خاندانِ یعقوبؑ مصر میں

مصر پہنچ کر اسماعیلی قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو ایک مصری سردار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، جہاں "عزیز" کی بیوی اور حضرت یوسفؑ کا واقعہ پیش آیا اور انھیں قید خانے جانا پڑا، بالآخر تعبیرِ خواب کی تقریب سے شاہ مصر کے دربار میں پہنچے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک سامی النسل نوجوان ہے، تو وہ نہایت مسرور ہوا۔ وہ فرزند سے محروم تھا اور رفتہ رفتہ اس نے زمام حکومت حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں دے دی۔

حضرت یوسفؑ نے اب مناسب سمجھا کہ اپنے خاندان کو کنعان سے جہاں وہ مبتلائے قحط تھا، مصر بلا لیں، کیونکہ ... اب اس کے لیے حکومت کا سامان تھا۔ حضرت یعقوبؑ مع اپنے خاندان کے مصر آ گئے۔ شاہ مصر نے بزرگ خاندان سام کا استقبال کیا اور جاگیر و مناصب انھیں عطا کیے۔ حضرت یعقوبؑ نے اتحاد نسل کے اظہار کے لیے کہا کہ "ہم بھی اسے پادشاہ چرواہے ہیں۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲)

... کرامت دیکھ کر اور یہ سن کر کہ اس کا شوہر موجود ہے، اپنے ارادے سے باز رہا۔ اس افسانے کی صرف یہی حقیقت اصلی ہے جو ہم نے ... ان کی مزید تفصیل "البصائر" کے باب تفسیر میں ہوگی۔ حضرت ہاجرہ ام اسماعیل کو لونڈی کہنا بھی یہودیوں کی حاسدانہ جہالت ہے ... افسوس ہے کہ مسلمان بھی غلطی سے اس کا یقین کر لیتے ہیں، حالانکہ خود یہودیوں کی تاریخ سے اس کی پوری تردید ہوتی ہے (مولانا ... "البصائر" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ تفسیر وغیرہ کے لیے نکالنا چاہا تھا تاکہ "الہلال" میں عام مضامین شائع ہوتے رہیں ... لیکن ضرورت کے مطابق کارکن نہ مل سکے اس لیے یہ رسالہ جاری نہ ہو سکا)۔

عمالقہ کی حکومت کا خاتمہ

اس واقعہ سے تقریباً تین سو برس بعد تک اسرائیل کی اولاد ملک مصر میں بڑھتی اور پھیلتی گئی لیکن خود اصل حکمران سامی خاندان روز بروز ضعیف ہوتا گیا یعنی عاقبۃ الامر جیسا کہ ہمیشہ اہل ملک بیرونی قوم پر غالب آتے ہیں، حامی خاندان جو مصر قدیم کا باشندہ تھا، غالب آگیا اور سامیوں کو مصر سے نکال دیا۔ صرف بنی اسرائیل، جو دراصل دوسرا سامی خاندان تھا اور عہد یوسف ع سے مصر کے ایک سرسبز و شاداب قطعۂ ارض پر قابض تھا، ملک میں باقی رہ گیا۔

" اسرائیل کی اولاد برومند اور فراوان ہوئی، اس نے نہایت زور پیدا کیا اور زمین ان سے معمور ہوگئی تب مصر میں ایک نیا بادشاہ (یعنی نئی بادشاہی) جو یوسف کو نہ جانتا تھا، پیدا ہوا اور اس نے لوگوں سے کہا:

دیکھو! بنی اسرائیل ہم سے زیادہ قوی ہیں، آؤ ہم ان کے ساتھ ایک دانش مندانہ چال چلیں، تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور جنگ پڑے تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں، ہم سے لڑیں اور ہم ملک سے نکل جائیں۔

اس لیے مصریوں نے ان پر خراج کے لیے محصل بٹھائے تاکہ وہ سخت کاموں کے بوجھ سے ان کو ستائیں ان محصلوں نے فرعون کے لیے شہر "پتوم" اور "رعمسیس[1]" میں خزانے بنوائے۔

(خروج باب ۱: ۱۴)

لیکن سنن الٰہیہ کا یہ قاعدہ جاری ہے کہ قوت حاکمہ ملت محکومہ کو جس قدر دباتی ہے اسی قدر وہ اور ابھرتی ہے اور جس قدر اس کے مظالم میں اشتداد ہوتا ہے، اتنا ہی خیال انتقام، ملت محکومہ کے بازوؤں میں زور اور ارادوں میں عزیمت پیدا کر دیتا ہے۔

مصریوں نے اسرائیل کی اولاد کو جتنا دکھ دیا وہ اور زیادہ بڑھی کہ ایسا ہونا سنت الٰہی کا اقتضا تھا۔

دباؤ اور ردّ عمل

تم نے دیکھا ہوگا کہ ربڑ کا ایک گیند جب ایک بچے نے تمہارے سامنے زمین پر پٹکا تھا ردعمل کے لیے جس قوت کے ساتھ وہ پٹکا گیا تھا، اسی قوت و زور کے ساتھ وہ زمین سے بلند ہوا۔ زخم کے مواد فاسد کو اگر نکلنے کا راستہ نہ دو گے تو کیا وہ آخر کار ناسور بن کر باہر نہ ہو جائے گا جس کا اندمال موت کے سوا ممکن نہیں؛

کوہ آتش فشاں کی حقیقت کیا ہے؟ اس حرارت وجوش کی ایک لہر ہے، جسے زمین سے نکلنے کی راہ نہ دی آخر الامر طبقات زمین کی دیواروں کو توڑ کر قلہ کوہ کو ہلاتی ہوئی باہر نکلی اور دور دور تک آبادیوں کو بے نشان کر دیا۔

---

[1] یہ دونوں شہر اسماعیلیہ سے مغرب میں اور تل الکبیر سے مشرق میں تھے۔

لوگ مکانوں میں پانی نکلنے کے لیے راستے بناتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ایک ہی برسات میں مکانوں کی بنیادیں ہل جائیں۔

مصری اب بنی اسرائیل کی کثرت و قوت سے خوف زدہ ہوئے۔ انھوں نے بنی اسرائیل سے کام لینے میں سختی کی۔ ذلیل، سافلانہ اور نیچے درجہ کی ہر قسم کی خدمت ان سے لے کر ان کی زندگی تلخ کر دی، کیونکہ ان کی وہ ساری خدمتیں جو وہ کرتے تھے، مشقت اور ذلت کی تھیں" (خروج ۱: ۱۵)

قدرت کی کارفرمائی

فطرت اپنی ضرورتوں کو آپ پورا کرتی ہے، ایک صحرائی حیوان اگر کسی کوہستان میں پہنچ جائے تو چند نسلوں کے بعد کوہستانی زندگی کے لائق اس کے ناخن، پنجے، جبڑے اور روئیں خود بخود ہو جائیں گے۔ اگر کسی گرم ملک کے حیوان کو برفستان میں پرورش کرو تو چند انقلابات نسلیہ کے بعد شاید برودت و برف کے تحمل کے لائق وہ خود اپنا جسم طیار کر لے گا۔

جب زمین میں گرمی، ہوا میں تپش اور موسم میں امس ہوتی ہے تو دست نصرت الٰہیہ بارش کے لیے ابر کی چادر خود ہوا میں پھیلا دیتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو مدبر عالم کی شان تدبیر و تہیۂ اسباب کی تحقیر ہو۔ وہ ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کے لیے تہیۂ سامان و اسباب کرتا ہے، وما ذالك عليه بعزيز۔

پس جب کوئی قوم مضطر و مضطرب، شدائد و خطرات سے محاط، آلام و مصائب کا مرجع، قہر و جبر و اکراہ کا نشانہ، انواع تشدید و تعذیب کا ہدف ہو تو یقین کرو کہ خدائے مدبر عالم کا دست تدبیر مصروف کار ہے اور سد ضرورت کیلیے وہ خود ہی سامان پیدا کر رہا ہے، کیونکہ خود اسی نے تو پہلے ضرورت بھی پیدا کی تھی۔

موسیٰ کے لیے حکم دعوت

بنی اسرائیل مصر کی سرزمین میں انواع قہر و تعذیب میں گرفتار تھے۔ ضرورت پیدا تھی، پس خدا نے نظر اٹھائی اور اس نے موسیٰؑ کو "وادی طویٰ" میں "جبل طور" کے نیچے کھڑا دیکھا۔ وہ پکارا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ (طٰہٰ: ۲۵)	موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ، اب اس کا طغیان حد کو پہنچ چکا۔

موسیٰؑ تنہا لیکن حق و صداقت کی جمعیت غیر مرئیہ کے ساتھ ساتھ، جبل طور سے اترا اور دربار شاہی کا رخ کیا۔ اس نے فرعون کو خطاب ربانی سنایا:

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۥ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۥ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ	بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے، انھیں دکھ نہ دے، ہم خدا کی نشانی تیرے پاس لائے ہیں، اگر اس نشانی کی اطاعت کرے گا، تو سلامت رہے گا، ورنہ خدا نے ہم کو

اِلَيۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰى مَنۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۝ (طٰہٰ : ۴۸-۴۹)
بتایا ہے کہ جو اس نشانی کو تسلیم نہ کرے گا وہ آخر الامر گرفتار عذاب ہوگا ،

فرعون کی خود فریبی اور حیلہ گری

وہ ، جو دنیاوی ساز و سامان پر مغرور ، حکومت فانیہ کے نشے سے چُور اور اپنی قوت و استیلاء اور قہر و جبر پر متکبر ہیں ، وہ ہر صدائے اصلاح ، اور ہر ندائے موعظت کو اپنے لیے صاعقۂ موت اور صیحۂ قیامت سمجھتے ہیں ، يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ[1] (۶۳ : ۴)
وہ صدائے اخلاص و موعظت کے استماع کی قوت نہیں رکھتے کہ اُن کا دل اُن سے کہتا ہے : "یہ صدائے اخلاص و موعظت نہیں ، ہماری حکومت قائمہ کے لیے ندائے رحیل ہے"۔
وہ اعمال تنبیہ و اصلاح کے دیکھنے کی قوت نہیں رکھتے کہ ان کا نفس اُن کو کہتا ہے : "یہ اعمال تنبیہ و اصلاح نہیں ، ہماری عزت و قوت کے غیر فانی جسم کے لیے سازشِ قتل و سامانِ موت ہے"۔
کبھی وہ داعی و منادیِ حق کو خطاب کرتا ہے :
" میں تمہاری آواز سے ڈرتا ہوں کہ اس سے میرے کنگرۂ حکومت کو لرزش ہوتی ہے"۔
کبھی وہ خود اپنی قوم کے افراد صالحہ کو آواز دیتا ہے :
" ہاں ! اس کی صدائے جاذب اور ندائے دلربا سے متاثر نہ ہونا ! یہ تم کو اپنی آواز مقناطیسی سے معمول کر کے حکم دے گا کہ ان میٹھے چشموں ، ان سرسبز میدانوں ، اور ان بلند خیموں سے نکل جاؤ ، کیونکہ اب ان کا مالک آتا ہے اور تم ان پر بغیر حق کے قابض تھے"۔
فرعون نے موسیٰؑ کو کہا جو اس عہد کا داعی اور حق کا منادی تھا :

اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى ! (طٰہٰ : ۵۹)
اے موسیٰ ! کیا اس لیے تو ہمارے پاس آیا ہے کہ اپنے زورِ سحر سے ہم کو ہماری حکومت سے بے دخل کر دے ؟

پھر اپنی قوم کے اُن رجال صالحین کی طرف مخاطب ہوا ، جن کا قلب حق کا مستقر ، جن کے کان استماعِ صداقت کے لیے مستعد ، جن کے ہاتھ اعانت ضعفا کے لیے بلند رہتے ہیں اور جن کی حسب تدبیر الٰہی کسی عہد و ملک میں کمی نہیں اور کہا :

اِنۡ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيۡدٰنِ اَنۡ يُّخۡرِجٰكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ بِسِحۡرِهِمَا وَ يَذۡهَبَا بِطَرِيۡقَتِكُمُ
یہ ساحر ہیں جو چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ملک و حکومت سے بے دخل کر دیں اور تمہارے بہترین طریقہ و تہذیب کو بر

---

[1] ہر آواز کو اپنے لیے تباہی سمجھتے ہیں۔

اَنْتٰی ٥ فَاَجْمِعُوْا کَیْدَکُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰی۔

کردیں، کوئی تدبیر متفقاً سوچو، پھر صف بہ صف مقابلہ کے لیے آجاؤ۔ آج جو بلند رہا، وہی کل کامیاب ہوگا۔

(طٰہٰ: ۶۴-۶۵)

داعیٔ حق کا حربہ

جب کوئی ضعیف و کمزور قوم آمادۂ اہانت ہوتی ہے تو اعدائے حق و صداقت اپنی قوت و طاقت کے عجیب و غریب کرشموں سے اس کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے فرمان سزا اور فرو تعزیر کی تحریریں زہرناک سانپوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتی نظر آتی ہیں، حالانکہ وہ بے جان ہوتی ہیں:

فاذا حبالھم و عصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعٰی۔

جادوگرانِ فرعون کی رسیاں اور ڈنڈے ان کے زورِ سحر سے، ایسا خیال ہوتا تھا (گویا) سانپ بن بن کر دوڑ رہے ہیں!!

ناصرِ حق اور داعیٔ صداقت چند لمحوں کے لیے خوف سے کانپ جاتا ہے کہ آخر وہ بھی انسان ہے،

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی۔

حضرت موسیٰ نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔

مگر پھر معاً خدائے مجیب الدعوات کی آواز غیر مسموع دل کو تسلی بخشتی اور روح کو اطمینان دیتی ہوئی سنائی دیتی ہے:

لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ (طٰہٰ: ۶۸)

اے ناصرِ حق و صداقت! خوف نہ کر کہ غلبہ تیرے ہی لیے ہے۔

ہاں! تیرے پاس شمشیر آہنی نہیں لیکن تیرے دہنے ہاتھ میں لکڑی کا ایک خشک آلہ ہے۔ اس "آلۂ معجز نما" سے دشمنوں پر حملہ آور ہو کہ یہ اُن کی شہرت کا چراغ گل، اُن کے ساز و سامان کی نمائشی چمک کو دھندلا، اور ان کے ظالمانہ امن اور جابرانہ عدل کے ایوان کو متزلزل کر دے گا:

اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ٥

موسیٰ! اپنے دہنے ہاتھ کی لکڑی ڈال دے۔ انھوں نے اپنے تصنع و فریب سے جو کچھ بنایا ہے اس کو نگل جائے گی۔ یہ صرف ساحرانہ فریب و تدبر ہے، جو کسی طرح آخر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(طٰہٰ: ۶۹)

معجزۂ صداقت

صداقت ایک معجزہ ہے جو اپنی تاثیر کے لیے شرمندۂ اسباب نہیں، وہ جو دشمن ہیں، وہ جو عداوت رکھتے ہیں، وہ جو اپنی قوت و استیلا پر مغرور ہیں، صداقت کا جب ظہور ہوتا ہے تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں کہ ہم نے صداقت آسمانی کو بادلوں سے اُترتے دیکھا اور قبول کیا:

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ٥

"ساحر جو اپنی قوت سحر کے زور پر موسیٰ کے مقابلہ کو نکلے تھے، حق کا نشان دیکھ کر اطاعت کے لیے سجدہ میں گر پڑے، اور پکار اٹھے، ہم نے خدائے ہارون و موسیٰ کا نشان دیکھا اور قبول کیا۔"

(طٰہٰ: ۷۰)

شریر فرعونیوں کی آنکھیں روشن، لیکن دل اندھے ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی قوت پر مغرور اور نشۂ حکومت سے مخمور ہیں۔ لوگ جب روشنی کو چشمۂ خورشید سے طلوع ہوتے ہُوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ روشنی طلوع ہُوئی اور ہم نے دیکھا۔ وُہ جو کہتے ہیں کہ "روشنی طلوع ہُوئی اور ہم نے دیکھا" دل کے سچے ہیں اور آنکھ کے بھی، لیکن فرعونی کہتے ہیں کہ جیسا ہم نے نہیں کہا کہ دیکھا تو ہم نے کیسے دیکھا اور قبول کیا؟

فرعون کا عزم سزا

فرعون نے کہا، کیا تم میری ہیبت سے نہ ڈرے؟ کیا تم میرے زورِ حکومت سے مرعوب نہ ہُوئے؟ کیا تم میری قوت تعزیر سے خوفزدہ ہو کر نہ کانپے؟ تم کس کی صدا کو قبول کرتے اور کس کی روشنی کو نور کہتے ہو؟ تم کہو کہ نہ ہم سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں، ورنہ تم دیکھتے ہو کہ جلاد کی تلوار تمھارے سامنے اور سولی کا درخت تمھارے پیچھے ہے؛

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۚ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَا اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى۔ (طٰہٰ: ۷۱)

فرعون بولا! بغیر میرے کہے تم نے قبول کر لیا، موسیٰ تم سب کا سحر میں استاذ ہے۔ اس قبول سے فوراً انکار کرو، ورنہ تمھارے ہاتھ پاؤں ٹکڑے کر دیں گے، اور تم کو کسی درخت کے تنے پر لٹکا کر سُولی دے دیں گے، دیکھو تو کس کا عذاب سخت اور دائمی ہے؟

حق پرست گروہ کا جواب

لیکن جو سنتے ہیں کیونکر کہیں کہ نہیں سنتے؟ اور جو دیکھتے ہیں وُہ کیونکر کہیں کہ نہیں دیکھتے؟ پھر اے قہر و ظلم کے تخت پر بیٹھنے والو! اے حکومت فانیہ کے تاج سر پر رکھنے والو! اے قوانین ظالمہ و قواعد جائرہ کی تلواریں چمکانے والو! اور اے جلا وطنی اور سُولی سے ڈرانے والو! ہم تمھاری قوت جانتے ہیں، لیکن مانتے نہیں۔ ہم تمھاری طاقت سے بے خبر نہیں، لیکن ہمیں اس کا ڈر بھی نہیں۔ تمھاری قوت و طاقت سے بھی پرے ہم ایک اور قوت و طاقت کو دیکھتے ہیں۔ جسم تمھارے ہاتھ میں ہے، لیکن دل تمھارے ہاتھ میں نہیں۔ پس جو کچھ کرنا ہو کر گزرو کہ دل نے جسے دیکھا ہے، اس کے قبول دعوت سے آسمان کے نیچے اسے کوئی شے روک نہیں سکتی۔ کیا یہی جواب نہ تھا، جو موسیٰ پر ایمان لانے والوں نے فرعون کو دیا تھا؛

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا ، فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ ، اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَا اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ، وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا

اے فرعون! ہمیں خدا کی جو نشانیاں پہنچ چکی ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا اس کو چھوڑ کر تیری اطاعت نہیں کر سکتے۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے کر، تیرا حکم صرف ہماری اس دنیوی زندگی ہی تک ہے اور بس۔ ہم اپنے خدا کے احکام کو قبول کر چکے تاکہ وہ ہماری خطاؤں سے درگزر کرے اور جن برائیوں کے کرنے پر تو

فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى ○ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذٰلِكَ جَزَآءُ مَنْ تَزَكّٰى ○

(طٰہٰ : ۲۰ : ۷۶)

مجبور کیا (یعنی جادوگری) ۔ انھیں مٹا دے ۔ ہمارا خدا نیک اور دائم ہے ۔ خدا کے احکام کا جو مجرم ہوگا، اس کے لیے جہنم ہے، جس میں نہ تو زندگی ہے کہ اس میں مسرت نہیں، اور نہ موت ہے کہ تکلیف سے نجات نہیں اور جو خدا کے احکام کو مانے گا اور اس کے بتائے ہوئے نیک کام کرے گا، اس کے لیے درجات عالیہ ہیں ۔ سبز باغ جاوید جس کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور دراصل یہ پاک لوگوں کے ایمان و ایقان کا پاک اجر اور پاک جزا ہے ۔

• یہ مولانا کا کمال تھا کہ قرآن کی ہر تعلیم کی تشریح بھی پوری تفصیل سے فرماتے تھے اور ہر تعلیم کو گرد و پیش کے
لات کی مطابقت سے لائحہ عمل بھی بنانے جانتے تھے جیسا کہ اس مضمون میں کیا ۔ یعنی بیک وقت تین وظیفے انجام دیتے تھے
ل قرآن مجید کی تعلیم و تفسیر، دوم ارشادات قرآنی کا انطباق احوال گرد و پیش سے اور سوم قوم کے لیے دعوت عمل ۔

باب ۱۸

قتل نفس

قرآن مجید کی حکمت عفو و انتقام

(بر سلسلۂ قصص بنی اسرائیل)

قابیل و ہابیل حقوق و فرائض عباد میں سے سب سے اول و افضل فرض یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی کی حرمت اور اس کی جان کی عزت کرے۔ جب تک حرمت زندگی و عزت جان نہیں، اس وقت تک دنیا میں راحت و اطمینان بھی نہیں۔

کتب الٰہیہ نے بتایا ہے کہ اس بدترین فعل شیطانی کا مبتدع اول وہ گنہگار انسان (قابیل) تھا، جس کے سوء نیت اور خباثت قلب کو دیکھ کر خدا نے قربان گاہ میں اس کی قربانی قبول نہ کی، لیکن اس کے بھائی (ہابیل) کی قربانی قبول ہوئی کہ وہ نیت کا خالص اور دل کا نیک تھا۔ یہیں سے قربانی کی حقیقت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ جانور کی گردن سے خون گرانے کا نام نہیں، بلکہ نیکی اور پاکی کے چند قطرات خونیں سے عبارت ہے، جو خدا کے نام پر دل سے کہ مستقر خیالات ہے ٹپکیں:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ (حج: ۳۸)

خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ صرف تمہاری نیکی ہی خدا تک پہنچتی ہے۔

(قابیل) نے دیکھا کہ خدا نے اس کے بھائی (ہابیل) کی قربانی کو قبول کی عزت بخشی، لیکن اس کی قربانی کو عزت نہ دی، وہ رنجیدہ ہوا اور اپنے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا (توراۃ۔ پیدائش ۴:۴)

قرآن مجید کا بیان قرآن مجید نے اسی قصہ کو ان الفاظ میں دہرایا ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ

اے پیغمبر! ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا سچا واقعہ سنا۔ جب دونوں نے خدا کے حضور اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں تو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ جس کی قبول نہ ہوئی اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ میں تجھ

اِنَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ج اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ج وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ○ فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ قَتْلَ اَخِیْہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○
(مائدہ: ۲۶ - ۷۹)

قتل کروں گا۔ بھائی نے کہا: قربانی خدا نیکوں کی قبول کرتا ہے اور تم اگر میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہو تو بڑھاؤ، لیکن میں تو نہیں بڑھاتا۔ میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا دونوں کا گناہ تم خود ہی اٹھاؤ اور دوزخ کے سزاوار ہو کہ ظالموں کی یہی جزا ہے۔ پہلا بھائی اپنے نفس کا مطیع بن کر اپنے بھائی کا قاتل ہوا اور مبتلاے خسران۔

یہ پہلی خونریزی تھی جو دنیا میں ہوئی اور خون بے گناہی کا پہلا قطرہ تھا جو زمین پر گرا۔ دنیا میں جب کبھی اس کی مثال ظاہر ہوگی تو آدمؑ کا قاتل فرزند ہی اس کا ذمہ دار ہوگا کہ اس شرارت کا تخم زمین میں سب سے پہلے اُسی نے بویا۔ حدیث صحیح ہے:

لا تقتل نفس الا کان لابن آدم الاول کفل منہا۔ (بخاری)

دنیا میں جب کوئی مظلوم قتل کیا جاتا ہے تو آدم کے فرزند اول کو بھی اس میں سے حصہ ملتا ہے۔

نیکی اور بدی

اسی طرح ہر نیکی کا مبتدع اور فاعل اول، جب تک وہ نیکی دنیا میں باقی ہے، اس کے ثواب عمل سے بہرہ ور ہوگا کیونکہ سب سے پہلے اُسی نے دُنیا کو یہ نیکی سکھائی۔ یہی مطلب ہے اس حدیث مشہور کا:

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا۔

جو کوئی نیک طریقہ جاری کرے گا، اسے بھی اس نیکی کرنے والے کی طرح ہمیشہ ثواب ملے گا۔

پس جو جو دنیا میں کوئی بدی لایا، وُہ تمام دنیا کا دشمن ہے کہ وہ بدی ہر ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے اور جو دنیا کو کوئی نیکی سکھاتا ہے، وُہ تمام دنیا کا محسن ہے کیونکہ اس سے دنیا کی ہر زندگی متمتع ہوگی۔ اسی لیے خداے پاک نے آدمؑ کے ان دونوں بیٹوں کے قصے کے بعد فرمایا:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَ مَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔
(مائدہ: ۳۲)

اسی لیے ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ جو کسی کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں اس نے کوئی فتنہ برپا کیا ہو، قتل کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوع انسانی کو قتل کرتا ہے اور جو کسی کو اپنی مہربانی سے زندہ کرتا ہے وُہ گویا تمام نوع انسانی کو زندہ کرتا ہے۔

حفظِ نفس اس معجزانہ، پُراثر اور مخفی طرزِ ادا کے علاوہ خدا نے کئی بار اعلاناً بھی خونریزی سے منع فرمایا۔ سورۂ انعام میں ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (۶ : ۱۵۱)

جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا، حق کے سوا کسی اور سبب سے اسے ہلاک نہ کرو۔ خدا تمہارے سمجھنے کے لیے تم کو یہ نصیحت کرتا ہے۔

پھر سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا۔ (۱۷ : ۳۳)

جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا، حق کے سوا کسی اور سبب سے اسے ہلاک نہ کرو۔ جو مظلوم ہو کر مارا جائے اس کے وارث کو ہم نے قصاص اور بدلے کا اختیار دیا ہے، مگر وہ اس انتقام میں تعدی اور زیادتی کسی طرح نہ کرے۔ اس طرح یقیناً وہ مظفر و منصور ہوگا۔

یہ حکم امن عالم اور حفظ انسانیت سے متعلق ہے، اسی لیے جب کسی دور و عصر میں امن عالم کا محافظ ربانی اور حفظ انسانیت کا واعظ روحانی دنیا میں آیا تو اس نے اس حکم کا اعادہ کیا۔

تم نے اس فرمان کو سُنا ہے جو امن عالم کے ایک "محافظ اکبر" نے مقدس جماعت انسانی کے روبرو اور "بیت خلیل" کے سامنے دُنیا کو سُنایا تھا؟

الا ان دماءکم و اموالکم محرمة علیکم کحرمة یومکم هذا، فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا۔

آگاہ ہو کہ تمہارا خون، تمہارا مال، ایک دوسرے کے لیے محترم ہے، جس طرح آج روزِ حج اس شہر مکہ میں، اس ماہ ذی الحجہ میں محترم ہے۔

اسی طرح وہ جو "کوہ طور" (حضرت موسیٰؑ) سے آیا اور اس نے بھی جو "کوہِ زیتون" (حضرت عیسیٰؑ) پر نمودار ہُوا، یہی کہا تھا کہ "تُو خُون مت کر"۔

لیکن جس طرح قیام امن و احترام رُوحِ انسانیت کے لیے سفک دم و قتل نفس ممنوع ہے، اسی طرح کبھی کبھی انھیں عزیز ترین متاعِ عالم کی حفاظت و عزت کے لیے سفک دم و قتل نفس ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ ایک جماعت انسانی کا مُجرم، ایک نفس زکیہ کا قاتل، ایک حکومت صالحہ کا باغی، اور ایک برہم زنِ امن عالم کا قتل، عین عدل و نفس انصاف ہے تاکہ دنیا کی صلح و سلام واپس آئے اور انسانیت و رُوح کی عزت و احترام باقی رہے۔

عفو و انتقام اسلام سے پہلے دنیا نے صرف دو اصولوں پر کام کیا ہے۔ عفو اور انتقام۔ ہم نے موسیٰ (ع) کی

ریت میں "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" پڑھا ہے لیکن یہ نہیں پڑھا
ہ" اسے اسرائیل! بُرے بندوں کو معاف کر دے"[1]
ہم نے مسیح (ع) کو سُنا کہ اس نے (گلیل) کی سرزمین میں ایک پہاڑ کے نیچے کہا:
"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تم سے کہتا ہوں
کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے، تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے، جو
تیرا کُرتہ لے، اس کو چوغہ بھی لے لینے دے، جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے، اس کے ساتھ
دو کوس چلا جا۔"[2]
ہم نے یہ سُنا، لیکن یہ تو نہیں سُنا کہ اُس نے کہا ہو:
"شریروں اور بدکاروں کو اُن کے اعمال کی سزا دو کہ آسمان کی بادشاہت کی طرح زمین کی بادشاہت
میں بھی امن و سلامتی ہو۔"
لیکن ہم نے مسیح کے بعد بطحاء کی سرزمین میں، جبل حراء کے درمیان، ایک اور بولنے والے کا کلام سُنا، جس نے
گلیل کے مناری کی طرح پہلے کہا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ۔ (مومنون: ۹۶)	برائی کا معاوضہ ہمیشہ نیکی سے دو۔
وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (الرعد: ۲۲)	عاقبت کا گھران کے لیے ہے جو بُرائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں۔

لیکن ساتھ ہی اس نے سلطان عدل کے جلال، امنیت عالم کے احترام، نظام مدنیت کے قوام اور قانون و
عدالت کی ہیبت کے ساتھ کہا، جیسا کہ موسیٰ (ع) نے بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور قرنا کی آواز میں سنا تھا:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (البقرہ: ۱۹۴)	"جو تم پر تعدی کرے تم بھی اسی طرح اور اسی قدر اس پر تعدی کرو، خدا سے ڈرو اور یقین کرو کہ خدا اپنے سے ڈرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔"

پھر اس نے موسیٰؑ کے قانون کا اعادہ کیا:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ	ہم نے تورات میں لکھ دیا ہے کہ جان کے بدلے جان،

---

[1] تورات۔ سفر خروج۔ [2] متی ۵: ۳۸ (منہ)

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط (مائدہ: ۴۵)

آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم ہے۔

ادھوری باتوں کی تکمیل

وہ ادھوری باتوں کو جیسا کہ مسیحؑ نے کہا تھا، پُورا کرنے کے لیے آیا تھا، وہ آیا اور اُن کو پُورا کیا۔ اس نے کہا کہ "تم دشمنوں سے درگزر کرو اور بُرائی کو نیکی کے ذریعے سے دُور کرو" اس نے صرف یہی نہیں کہا کہ دشمنوں کے شدائد صبر کے ساتھ تحمل کرو، بلکہ یہ بھی کہا کہ تحمل کرو اور احسان کرو، بُرائی کو انگیز کرو اور اس کی جزا نیکی کے ساتھ دو کہ یہ حصول امن کا ذریعہ اور کسب صلح وسلام کی تدبیر ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَ مَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ، وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حم السجدہ: ۳۴-۳۵)

نیکی اور بدی برابر نہیں۔ نیکی سے بدی کو دُور کرو کہ اس سلوک سے وہ، جس کو تم سے عداوت ہے، تمہارا دوست ہو جائے گا یہ وُہ طریقۂ اخلاق ہے جس پر صرف صابر اور خوش قسمت انسان ہی عمل کرتے ہیں۔

قانون حفظ وقتل

لیکن یہ عفو وحلم، یہ صفح ودرگزر، یہ تحمل وانگیز، کب تک؟ اس وقت تک، جب تک کہ اس شر اور بدی کا اثر شخص واحد تک محدود اور صرف ایک ذاتِ خاص ہی کے منافع خصوصیہ میں محصور ہو کہ یہ جرم ایک شخص واحد اور ذات خاص کا ہے جس کے معاملات وحوادث خصوصیہ کو ہیئتِ اجتماعیہ اور سوسائٹی سے تعلق نہیں۔

وُہ پانی کا ایک بُلبُلہ ہے جو ایک ٹھوکر سے پیدا ہُوا اور مٹ گیا۔ اس جرم کو معاف کرو کہ اشخاص کی ذاتی محبت و مروت اور شخصی لُطف ورحم کو ترقی ہو اور دنیا امن وصلح سے بھر جائے۔ یہی وُہ موقع ہے جہاں (مسیحؑ) کے حکم پر عمل کرنا عین اسلام کی تعلیم ہے۔

لیکن دنیا میں ایسی بھی بدیاں ہیں جو گو ایک شخص خاص کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، لیکن وہ سمندر کی لہریں ہیں، جو ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہوتی ہیں اور دُور تک پانی کی سطح کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ وہ گو ایک ذات واحد کا گناہ ہے، لیکن اپنی وسعت اثر و قوۃ نفوذ کے لحاظ سے تمام مجمع انسانی کا گناہ ہے تو ایک شخص خاص کو کیا حق ہے کہ وہ اس گناہ کو معاف کرے اور اگر کرتا ہے تو وہ خود تمام مجمع انسانی کا گناہ کر رہا ہے۔

مثالیں

زید، خالد کے گھر میں سرقہ کا مرتکب ہوتا ہے، اب خالد کو کوئی حق نہیں کہ وُہ زید کے گناہ کو معاف کرے اور اگر کرتا ہے تو گویا اسے اعادہ جرائم و معاصی کی تعلیم دیتا ہے۔

عمرو، بکر کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے۔ بکر کا باپ اب حق نہیں رکھتا کہ اس کے اس جرم کو معاف کرے، اگر وہ معاف کرتا ہے تو اس کا عفو جرأت آموز جرائم قتل ہے، اس لیے اب عمرو، صرف بکر کے موالی و اعزہ ہی کا گنا ہگار نہیں بلکہ خود مجمع انسانی کا، امن و عدل کا اور حکومت کا گنہ گار ہے۔ اسی نکتے کی طرف کتاب حکیم نے منافع قصاص پر بحث کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۚ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔
(مائدہ ۳۲)

جس نے کسی کو بغیر اس کے کہ وہ مرتکب قتل ہوا ہو یا اس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو، قتل کر دیا، تو اس نے گویا تمام دنیا کو قتل کر دیا، اور جس نے ایک کو زندہ بچایا تو اس نے گویا تمام دنیا کو زندگی بخشی۔

یہ وُہ موقع ہے جہاں اسلام نے موسیٰ کی اس شریعت کا حکم دیا ہے کہ "جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ"۔

قرآن مجید نے ان دونوں مواقع کی تفریق و تمیز سے تورات و انجیل کی شریعت عفو و انتقام کی، جو ناقص تھی، تکمیل کی اور اس طرح وُہ پورا ہوا جو (مسیح) نے کہا تھا کہ "میرے بعد آنے والا میری ادھوری باتوں کو پُورا کر دے گا"۔

مسئلہ عفو و انتقام کی نسبت ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔

اخلاق اور قانون

دنیا میں دو چیزیں ہیں: اخلاق اور قانون، اخلاق کا تعلق انسان کی ذات سے اور قانون کا تعلق حکومت اور مجمع انسانی سے ہے۔ عفو و درگزر اور صفح و مغفرۃ ایک انسان کا بہترین وصف ہے، لیکن اگر اس سے تجاوز کرکے وہ حکومت اور جمعیۃ انسانی تک پہنچ گیا تو وہ قانون کی سرحد میں آ گیا جہاں مغفرت گنا ہ عظیم، اور صفح و عفو جریدۂ کبیرہ ہے یہ جرأت آموز جرائم ہوتا ہے اور برہم زن امن انسانی۔

اسی لیے اس ارحم الراحمین نے فرمایا، جہاں اپنے معجزانہ انداز کلام میں فرمایا کہ:

و لکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب۔
(بقرہ: ۱۹۲)

اے دانشمندو! نوع انسانی کی بقا و حفاظت، قصاص اور بدلے ہی میں ہے۔

گزشتہ آیت کو پھر پڑھو:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۚ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔
(مائدہ ۳۲)

جس نے کسی کو بغیر اس کے کہ وُہ مرتکب قتل ہوا ہو، یا اس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو قتل کر دیا، تو اس نے گویا تمام دنیا کو قتل کیا، اور جس نے ایک کو زندہ بچایا، اس نے گویا تمام دنیا کو زندگی بخشی!

اسلام کی جامعیت

مسیحؑ کی تعلیم صرف اخلاق ہے اور موسیٰؑ کی شریعت صرف قانون ہے لیکن وہ ، جس نے کہا کہ "میں خانۂ نبوت کی آخری اینٹ ہوں[1]" وہ جس طرح ایک معلم اخلاق تھا ، اُسی طرح ایک مقنن آئین و قانون بھی تھا۔ اس نے کہا:

وَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ جَزَاۤءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ أَصْلَحَ فَأَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝ وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ۝

(شوریٰ: ۴۲: ۴۳)

خدا کے پاس کی وہ اجرت جو سراسر خیر اور دائمی ہے ، ان لوگوں کے لیے ہے جو اس سرکشی و بغاوت کا ، جو ان کے ساتھ کی جائے ، انتقام لیتے ہیں کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے البتہ جو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا اجر خدا پر ہے وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا اور جو اپنی مظلومی کے بعد اپنے ظلم کا انتقام لے تو اس پر بھی کوئی الزام نہیں۔ الزام تو انہی پر ہے جو خود لوگوں پر ظلم کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے مگر جو صبر کرے اور دوسروں کی خطا بخش دے تو یہ بڑی ہی عالی حوصلگی کے کام ہیں۔

اسلام اور شرائع سابقہ کا یہ فرق ایک نہایت اہم اور اصولی نکتۂ دقیق ہے اور افسوس کہ اس کی تشریح ضمناً ممکن نہیں ، اور مصیبت یہ ہے کہ ایک موضوع پر لکھتے ہوئے کتنے ہی ضمنی مطالب کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے۔

حاصل بحث

ان تمام آیات میں بار بار اعادہ ہوا ہے کہ شریعت حقہ الٰہیہ نے خوں ریزی کو اکبر الجرائم اور قتل نفس کو معصیتہ کبریٰ قرار دیا ہے تاہم بقائے حفظ و سلام عالم و امنیت انسانی و قیام عدل و نظام کے لیے دو وصف کے لوگوں کا خون بہانا نہ صرف جائز بلکہ ضروری و لازم بھی بتلایا ہے:

۱۔ ایک وہ جس نے کسی مظلوم انسان کا ناحق خون کیا۔ اس سے قصاص لیا جائے گا کہ اس کے عمل بد سے دنیا محفوظ رہے اور اس کا اقدام خونیں متعدی نہ ہو۔

۲۔ دوسرا وہ ، جو زمین کے امن و سلامتی کو برباد اور قوموں کے سکون و راحت کو غارت کرتا ہے ، جو انسانوں کے خون کی عزت نہیں کرتا ، جس کا وجود دنیا کے لیے باعث مصائب و حوادث اور موجب

---

[1] آنحضرت (صلعم) نے ایک تمثیل میں اپنے آپ کو (کہ تکمیل دین کے لیے تشریف لائے تھے) مکان کی آخری اینٹ سے تشبیہ دی ہے جس کے بعد مکان کی عمارت کامل ہو جاتی ہے۔

برہمی صلح وسلام ہے اور جو انسانوں کے قدرتی حقوق اور خدا کی بخشی ہوئی آزادی وخود مختاری کو غارت کرنا چاہتا ہے ۔ وہ بھی قتل کیا جائے کہ فی الحقیقت اس کی موت دنیا کی زندگی ہے :

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (البقرۃ: ۱۷۹) — دانش مندو! قصاص وانتقام کے خون ہی میں تمہاری زندگی کا سرچشمہ ہے۔

اور اسلام کا یہ قانون کس کو معلوم نہیں ؟

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (شوریٰ: ۴۰) — اور بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے جیسی کہ کی گئی۔

مادی قوانین کا اصل الاصول

یہی اصل الاصول دنیا کے مادی قوانین اور عدالت کو بھی قرار دینا پڑا ہے اور سیاستہ اخلاقی بھی اپنی تعلیم رحم و درگزر کو یہاں پہنچ کر یکسر بھلا دیتی ہے ۔ وہی عدالت جو خونریزی کو جرم تبلاتی ہے ، جب خونریزی کی جائے ، تو اس کا انصاف خونریزی ہی سے کرتی ہے اور جس نے تلوار سے خون بہایا ہے اسے عدالت کے جلاد کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے ، یا سولی کے تختے پر کھڑا کیا جاتا ہے[1] ! اخلاق سے بھی اگر فتویٰ طلب کیا جائے تو وہ عدالت کا ساتھ دے گا کیونکہ اس بارے میں اصل الاصول یہ ہے کہ "انسانی زندگی اور اس کے فطری حقوق کی حفاظت کی جائے" ، رحم بھی اسی لیے ہے تاکہ کسی پر سختی کر کے اس کی حیات وحقوق طبیعیہ کو گزند نہ پہنچایا جائے ۔ درگزر اور عفو بھی اسی لیے ہے "تاکہ انسانی زندگی کا احترام اور انسانی حقوق حیات کا اعتراف کیا جائے لیکن اگر اسی عفو و درگزر ، اسی تعلیم حفظ نفس اور عدم قتل وخونریزی سے خود وہی اصل الاصول خطرے میں پڑ جائے ، جس کی بنا پر یہ تمام اصول قائم کیے گئے تھے ، تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ جس طرح انسانی زندگی و حقوق کی حفاظت کے لیے منع قتل کی تعلیم دی جاتی تھی ، ٹھیک ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی اور حقوق کی حفاظت ہی کے لیے قتل وخوں ریزی کی بھی اجازت دی جائے ۔

عفو اور سزادہی کا مقصد

اخلاق کا واعظ کہتا ہے کہ " قتل مت کرو " اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ " قاتل کو پھانسی پر چڑھاؤ " دونوں کا مقصد ایک ہی ہے ، اور ٹھیک ٹھیک ایک ہی درجے میں دونوں انسانی زندگی اور حقوق طبیعی کے محافظ ہیں ۔ پہلا خون کے روکنے کے لیے ایسا کہتا ہے تو دوسرے کا بھی فیصلہ خون ہی کی حفاظت کے لیے ہے ۔

---

[1] یہ سزائے موت کی مختلف مروج صورتوں کے سلسلے میں فرمایا ۔ امریکہ کی بعض ریاستوں میں گیس سے موت کی سزا دی جاتی ہے بعض میں اس غرض کے لیے بجلی استعمال کی جاتی ہے ۔ یہاں صرف سزائے موت مقصود ہے صورت خواہ کوئی مروج ہو نا ہم وحشیانہ نہ ہو ۔

البتہ اس عالم کی ہر راہ پُل صراط ہے اور صراطِ مستقیم عدل و اعتدال کا نام ہے، پس اگر اخلاق کے وعظ نے تفریط کی اور قانون و سیاست نے افراط تو دونوں کی تعلیم، نظام امن و عدل کو درہم برہم کر دے گی۔

(کوہِ سینا) کے اعتکاف نشیں نے مقدس تختیوں پر جو کچھ لکھا اور (گلیل) کی گلیوں میں حسن اخلاق کی منادی کی گئی وہ دونوں نظام و قوام کے دو علیحدہ عنصر ضرور تھے، پر الگ الگ دنیا کے لیے بیکار تھے۔ ایک یکسر قانون تھا، جو بقول یہودی انشا پرداز (پولس) کے "صرف سزا ہی دے سکتا تھا پر بچا نہیں سکتا تھا"۔ دوسرا اخلاق محض تھا، جو حسن و جمال میں تو دلفریب تھا پر عمل و نظام کے لیے بالکل بے کار تھا۔ یہ دونوں عنصر الگ الگ دنیا کے دُکھ کے لیے نہ صرف بیکار ہی تھے، بلکہ اس کی بیماری کو اور زیادہ کرنے والے تھے۔

لیکن جب وُہ دنیا سے گیا "جس کا جانا ہی بہتر تھا تاکہ آنے والے کو جلد بھیجنے کے لیے اپنے آسمانی باپ سے سفارش کرے" اور خداوند نے (طور) اور (زیتون) کے پہاڑوں کی جگہ (فاران) کی چوٹیوں سے اپنی ندا بلند کی، تو وُہ آگیا، جو موسیٰؑ کے قانون اور مسیحؑ کے وعظ کو "پُورا کرنے والا تھا"، اس نے ناقص کو کامل، اور ادھورے کو پُورا کیا اور اُن دونوں عنصروں کو، جو الگ الگ تھے، تسویہ و اعتدال کے ساتھ اس طرح ترکیب دیا کہ قانون کا عدل اور اخلاق کا رحم، دونوں باہم مل گئے، اور امنیت و نظام انسانی کا ایک مرکب صحیح و صالح پیدا ہوگیا۔

اس مرکب میں "جزاء سیئة سیئة مثلها" اور "لمن صبر وغفر، ان ذالك لمن عزم الامور" دونوں عنصر موجود ہیں۔

یہی شریعت حقہ الٰہیہ ہے، یہی ناموس طبیعی و سنّت ربانی ہے، یہی فطرت اللہ، التی فطر الناس علیها ہے، اور اگر ایک لمحے، ایک دقیقے کے لیے بھی اس کی حکومت دنیا سے اُٹھ جائے تو دونوں حالتوں میں دنیا امن و مدنیۃ کی جگہ، قتل و خوں ریزی، نہب و سلب، وحشت و سبعیت اور جرائم و معاصی کا ایک شیطان کدہ بن جائے!

آخری نتیجہ آخری نتیجہ جو ان مواد و ترتیبات کے بعد سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ شریعت الٰہیہ نفس انسانی کی محافظ اور اسی لیے وہ دو صورتوں میں (حسب تصریح بالا) قتل نفس کو فرض و لازم قرار دیتی ہے۔ ان صورتوں میں انسانوں کا قتل، مجرم و عاصی نہیں ہوتا، بلکہ ایک نہایت مقدس فرض انسانیت و عدالت حقہ انجام دینے والا ہوتا ہے وہ ویسا ہی محبت انسانیت اور نوع خواہ و امن پرست ہے، جیسا کہ خود قانون اور عدالت کی قوت۔ اس کا اخلاقی عمل نہایت اقدس و محترم ہے، کیونکہ وہ اس قتل نفس کے ذریعے تمام جمعیۃ انسانی اور عدل و نظام امنیت کی خدمت انجام دیتا ہے۔

دنیا کا قانون اور اخلاق، دونوں شریعت الٰہیہ کے اس اصول و حکم کے قولاً و عملاً دونوں طرح پیرو ہیں، گو بعض اوقات اپنے قول و عمل کو بھول جائیں۔

---

۱ مراد ہے موسوی اور عیسوی تعلیم۔ ۲ مسیح علیہ السلام

پس اسی لیے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر کے بازار میں ایک قبطی پر ہاتھ اٹھایا، اور وُہ مر گیا۔ اس کا قصہ "قصص بنی اسرائیل" کے سلسلے میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے، اور یہ آج کی تمہید طویل اس لیے تھی تاکہ کل اس واقعہ پر ایک غائر نظر ڈال سکیں، اور پہلے ایک اصول قانون و فیصلۂ اخلاق و شریعت ذہن نشین ہو جائے۔

باب ۱۹

اُسوۂ ابراہیمیؑ اور دعوت الی الحق

قرآن مجید نے کیا رہنمائی کی ہے؟

این رہ منزل قدس است بیندیش و بیا
میل ازیں راہ خطا باشد ہیں تا نہ کنی !

سیاروں سے خداشناسی کا سبق بابل کے آثار قدیمہ نے جو ابھی حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں علمائے اثریات (ARCHAELOGIST) کی توجہ کو موجودہ صدی سے ہٹا کر آج سے تیس صدی پیشتر کی جانب پھیر دیا ہے، جب کہ عراق کی ایک گمنام نے سیاروں کے طلوع وغروب سے خداشناسی کا سبق لیا تھا اور ایک سیارہ پرست قوم کو ظلمات کفر سے روشنی میں لانے کی کوشش کی تھی۔

ابتدائی دور دنیا نے اپنے ابتدائی عہد میں ایک زمانہ وہ بھی دیکھا ہے، جب انسانی تمدن کی بدیع المثال ترقی نے قدرت اور بندوں میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رکھی تھی۔ قدرت کے صدہا راز آشکارا ہو چکے اور جس قدر حیرت انگیز قدرتی طاقتیں مخفی تھیں، انسان نے تقریباً سب سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔

آگ، پانی، ہوا، مٹی، کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس پر انسان نے حکومت نہ کی ہو، سیارۂ زمین کی عنان گویا ہاتھ میں تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فضائے محیط کے کروں اور سیاروں کو بھی ایک طرح سے اپنا بنا لیا تھا اور اپنی ضروریات میں ان کی مہیب طاقتوں سے بھی نہایت سرعت و آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

حیرت انگیز تمدن نقولا تسلا (نکولس ٹازلے) کو ہنوز مریخ کی آبادی سے تعلقات پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، لیکن تاریخ کو اس ابتدائی زمانے کی علمی وعملی ترقی پر حیرت ہے کہ زمین والے آسمان تک پہنچ گئے تھے اور آسمانی آبادی سے جو چاہتے تھے کام لیتے تھے! بستیاں بساتے، شہر کے بُرج بناتے تو اس کا قبہ آسمان تک پہنچا دیتے۔ سیرگاہیں اس شان کی ہوتیں کہ مکانات میں عمارتیں ہیں، محل سرائیں ہیں، آبادی ہے اور اوپر نظر اٹھاؤ تو ایک وسیع اور بہت ہی وسیع باغ آویزاں ہے۔ شہر میں آیند و روند کی چہل پہل ہے، سڑکیں ہیں، گاڑیاں ہیں، دکانیں ہیں اور اوپر دیکھیے تو ایک عظیم الشان دریا لہریں مار رہا ہے!!

انسانی سرکشی کی چند مثالیں

یہ عجیب و غریب مدنیت کلدانیوں کی تھی، جو ارضِ عراق کے فرمانروا تھے، جن کی جلالت کا یہ عالم تھا کہ تورات کے پیغمبر بھی انھیں عشر (محصول دہ یک) دیتے تھے اور ان کے قانون سے تابعِ تورات میں مدد لیتے تھے۔ وسائلِ تمدن کی فراہمی و فراوانی ایک عالم کو سرکش بناچکی ہے: ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ۔ (نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے، جب وہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیتا ہے۔ (العلق ۶-۷))

ایک ذراسی ملکی و مالی عظمت، جو انسان کو انسانیت سے گزار دیتی ہے، جو اس قدر مغرور بنا دیتی ہے کہ لندن "ٹائمس" کے صفحات پر زبانِ سیاست کو اس اعلان سے بھی باک نہیں ہوتا کہ "ایک معمولی انگریز سپاہی کے خون کے مقابلے میں تمام ایران آبادی کی کچھ بھی وقعت نہیں"۔ جو ایک بااختیار ملکہ کی حیثیت میں ایک اصب وظالم وخونریز سلطنت کو انسانی قتلِ عام پر مبارکباد دیتی ہے۔ جو ایک فرمانروا سے یہ عصبیت ظاہر کراتی ہے کہ ایک ملک کو چند قومیں پامال کرچکی ہیں اور اب اسے مجبور کرتی ہیں کہ اس پامالی پر قانع ہو جائے۔ جس نے پچیس برس پہلے ایک وزیرِ اعظم کی زبان سے ایک ایسے ملک کا خون چوس لینے کی تلقین کرائی تھی، جو خود اُسی کا محکوم تھا، جس پر اس کی ثروت کی بنیادیں قائم تھیں، جو اس کے تاجِ سلطنت کا درخشندہ گوہر مانا جاتا تھا اور جس کے باشندوں نے اپنا ملک و مال خود اس کے تصرف میں دے کر، اسے مطلق العنان کردیا تھا:

محابا کیا ہے؛ میں ضامن، ادھر دیکھ!
شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا؟

غرض کہ وہی عظمت جو اپنے انتہائی مظاہر میں نمایاں ہو تو انسان میں کہاں تک سرکشی نہ آئے گی؛ مادے کی الوہیت کلدانیوں پر چھا گئی تھی وہ خدا کو بھول گئے تھے اور بندگانِ خدا کے ساتھ اُسی ظلم اور زبردست آزاری کے ساتھ پیش آتے تھے، جو آج موجودہ تمدن کے مخصوصات نمایاں میں سے ہے۔

خداشناس ابراہیمؑ کا ظہور

کلکتہ، بمبئی، برلن اور لندن میں جس طرح عظماء رجال کے جا بجا بُت نصب ہیں، اسی طرح کلدانیوں نے بے شمار مجسمے قایم کر رکھے تھے، اور ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ چونکہ قدرت کو روئے زمین سے تاریکی مٹانی تھی، اس لیے اسی قوم اور اسی ملک سے ایک ایسے نامور اور عظیم الشان خداشناس کو اُٹھایا، جس نے اس طلسم کی حقیقت واضح کردی اور کواکب پرست کلدانیوں پر ملکوت السماوات والارض کے اسرار فاش کردیے!

یہ خداشناس ہستی ابراہیم علیہ السلام ابن آزر (تارخ) کی تھی، جن کو توحید و صداقت کی دعوت و اشاعت میں سخت سے سخت زحمتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ملک کا ملک دشمن تھا، قوم کی قوم تشنۂ خون تھی، حکومت اپنی پوری طاقت سے مقاومت کو آمادہ تھی، ایک زمانے نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس خداپرست

مخلوق کو آگ کے حوالے کر کے رہیں گے، بااین ہمہ ان کے عزم واستقلال کا یہ عالم تھا کہ بقول مسیحی مورخ (مارگری گوری ابوالفرج ملطی)، کے "انھوں نے تن تنہا کلدانیوں کے بت خانے میں آگ لگا دی (مختصر الدول ص ۲۱) اور اتنی بڑی مہم انجام دینے پر بھی کوئی زبردست طاقت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ وہ بقول تورات "عراق سے ترک وطن کر کے صحیح وسلامت اس ملک میں چلے گئے، جہاں خدا نے ان کو برکت دینے اور انھیں ایک بڑی قوم بنانے کا وعدہ کیا تھا" (تکوین: ۱۲: ۱ — ۵)

قرآن کریم کا بیان

یہودیوں کی مقدس کتاب (تلمود) میں یہ واقعات شرح وبسط سے مذکور ہیں، جن کو قرآن کریم نے اور زیادہ پھیلا کر بیان کیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ

حضرت ابراہیم کو ہم نے ابتدائے عمر ہی سے فہم سلیم اور درجۂ رشد وحکمت عطا فرمایا تھا اور ہم اس سے اچھی طرح واقف تھے دعوت الٰہی کے اس مقدس وقت کو یاد کرو، جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ پتھر کی مورتیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو، کیا ہیں؟ انھوں نے کہا: "اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے کہ اپنے بڑوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھتے آئے ہیں"۔ حضرت ابراہیم نے کہا: "پس یقیناً تم اور تمھارے بڑے دونوں صریح گمراہی میں پڑے رہے"۔ اس پر انھوں نے کہا: "یہ جو تم کہہ رہے ہو، کیا واقعی یہ تمھارا کوئی حقیقی خیال ہے، یا محض دل لگی کر رہے ہو"۔ انھوں نے جواب دیا کہ "دل لگی کی اس میں کیا بات ہے؛ یہ تو اصل حقیقت ہے کہ وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، وہی تمھارا بھی پروردگار ہے اور میں اپنی بصیرت اور یقین سے اس پر شہادت دیتا ہوں"۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں بخدا ضرور بالضرور تمھارے ان بتوں سے تمھارے جانے کے بعد ایک چال چلوں گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم لوگوں کے جانے کے بعد بت خانے میں گئے اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ جب

طِقُوْنَ ۞ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْئًا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ۞
اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ
وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۞
قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ
وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ۞
وَ نَجَّیْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا
فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ۞ (الانبیاء: ۵۱ - ۷۱)

لوگ آئے اور یہ حال دیکھا تو لگے آپس میں کہنے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے یہ گستاخی کی؟ جس شخص نے ایسا کیا یقیناً وہ بڑا ظالم تھا؛ اس پر بعضوں نے کہا کہ وہ نوجوان جسے ابراہیم کے نام سے پکارتے ہیں، ان بتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ہو نہ ہو یہ اسی کی کارروائی ہے۔ لوگوں نے شور مچایا کہ اُس کو یہاں سب کے سامنے پکڑ کے حاضر کرو تاکہ جو کچھ سوال و جواب ہو اس کے لوگ گواہ رہیں۔ چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم کو لے کر آئے اور ان سے پوچھا کہ "اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت تُو نے کی؟ انھوں نے الزاماً کہا "نہیں، بلکہ یہ بُت جو سب میں بڑا ہے، اُسی نے کی ہوگی۔ انھیں سے پُوچھ لو۔ اگر وہ جواب دے سکتے ہیں!!" اس دندان شکن جواب کو سُن کر سب کے سب ششدر رہ گئے، اور اپنے دل میں اپنی گمراہی کے قائل ہو کر آپس میں کہنے لگے کہ سچ ہے تم ہی برسرِ ناحق ہو! با ایں ہمہ سرکشی اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ وہ پھر اپنے سروں کے بل اوندھے گمراہی کے گڑھوں میں دھکیل دیے گئے اور حضرت

حضرت ابراہیمؑ کے حق میں آگ کیوں کر برد و سلام (ٹھنڈک اور سلامتی) بن گئی تھی؛ مفسرین نے اس باب میں بہت سی توجیہیں کی ہیں۔ مسلم محمد بن بحر اصبہانی کا قول ہے "قلنا یٰنار کونی برداً و سلاماً، المعنی انہ سبحانہ جعل النار برداً و سلاماً، لا ان ھناك كلاماً، بل ان یقول لہ کن فیکون۔ ای یکونہ۔ (تفسیر کبیر ج ۴- ص ۱۷۵) یعنی قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "ہم نے کہا اے آگ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا" اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے آتش افروز اور فتنہ گر کلدانیوں کی آگ سے حضرت ابراہیمؑ کا کچھ نقصان نہ ہونے دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا نے یہ الفاظ بھی کہے تھے۔ اس کی نظیر "کن فیکون" والی آیت ہے، جس کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ خدا نے پیدا ہونے والے عالم کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ ہو جا، وہ ہو گیا۔ یہاں بھی کچھ لفظوں میں یہ حکم نہیں ملا تھا اور نہ خدا نے واقعی گفتگو کی تھی، مطلب یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی ظہورِ عالم سے متعلق ہوا اور اسی حیثیت کے مطابق موزوں و مناسب طریق پر اس کی تکوین ہونے لگی۔

ابراہیم سے کہنے لگے کہ یہ تم نے کیا کہا؛ تم کو تو معلوم ہے کہ
بُت بولا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا؛ پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ
تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پُوجتے ہو، جو خود ہی مجبور محض ہیں،
نہ کسی کو کچھ نفع پہنچائیں اور نہ نقصان، تف ہے تم پر اور تمھاری
ان چیزوں پر جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو! یہ کیا ہے کہ ایسی
ظاہر اور کھلی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آتی، جب وُہ لوگ
حضرت ابراہیم سے عاجز آگئے تو اور تو کچھ نہ کرسکے۔ غیظ و غضب سے
پاگل ہو کر آپس میں شور مچانے لگے کہ بس اگر کچھ کرنا ہے تو اس کا
یہی جواب ہے کہ اس بے باک شخص کو آگ میں ڈال کر جلا دو اور
اس طرح اپنے معبودوں کی حمایت کرو۔

وُہ جب یہ تدبیریں کر رہے تھے، تو ہم بھی اپنی تدبیروں سے
غافل نہ تھے۔ ہم نے اپنی قدرت کا اعجاز دکھلایا اور کہا کہ اے
آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لیے سلامتی۔ انسانوں نے ہمارے
داعی الی الحق کو نقصان پہنچانا چاہا تھا، پر ہم نے ان کو ناکام و
خاسر کیا۔

حقایق دعوت

یہ بظاہر تو ایک قصّہ ہے اور بدقسمتی سے اب تک اسی حیثیت سے اس پر نظر ڈالی گئی ہے
مگر غور کیجیے تو قرآن حکیم نے اپنے انداز خاص میں ایک دفتر معارف کھول دیا ہے، جس کے
ایک ایک لفظ کے اندر صدہا رموز اخلاق و سیاست اور حقایق و نوامیس اصلاح و دعوت پوشیدہ ہیں۔ مہلت
ملے تو اس واقعے کے ایک ایک ٹکڑے پر ایک ایک مقالہ مستقل طور پر لکھنا چاہیے۔ سردست صرف چند مناسب
وقت اشارات آپ کے سامنے ہیں۔

ظلم و استبداد کی شکست

۱۔ جس ملک میں ظلم عام ہو گیا ہو۔ خدا اور بندوں کے حقوق سر مشق تعدی و
تطاول ہو رہے ہوں۔ شرک جیسے ظلم عظیم کے ارتکاب میں باک نہ ہو۔ اللہ کو
چھوڑ کر دوسری طاقتوں اور انسانی قوتوں کے آگے لوگ سربسجود ہوں، وہاں ہر اس شخص کا، جس میں ایک
ذرہ بھی ایمان و اسلام ہو، یہ ایک مقدس فرض ہے کہ مظالم و مفاسد کے استیصال کے لیے آمادہ
ہو جائے اور بغیر کسی مداہنت و نفاق کے، کامل آزادی سے، نڈر اور بے باک لب و لہجہ میں خدا کے

بندوں کو خدا کی جانب بلائے۔ اسلام کی علانیہ دعوت کرے اور کفر و ضلالت کے مٹانے میں ذرا بھی متامل نہ ہو۔

۲۔ خدا کو استبداد پسند نہیں۔ جو لوگ ارباب اقتدار ہوں، دولت و حکومت رکھتے ہوں، انسانوں پر ان کا تصرف ہو، دنیا کی ہر ایک چیز پر انھیں فرمانروائی کی طاقت دی گئی ہو، پھر اتنی سب نعمتیں ملنے پر بھی خدا کو بھول جائیں، مستبد بن بیٹھیں، قانونِ الٰہی کو توڑنے لگیں، نظامِ اسلام کی توہین کریں، استبداد میں اتنا غلو رکھتے ہوں کہ انسان ہو کر خدا بن بیٹھیں اور اپنے آئین استعباد کے خلاف کسی کی کچھ بھی سماعت نہ کرتے ہوں تو ایسی قوم کو اس کی غلط کاریوں سے علانیہ آگاہ کر دینا چاہیے۔ علمِ حق و معروف لے کر مفاسد و منکرات کے خلاف آمادۂ جہاد ہو جانا چاہیے اور نہایت آزادی و استقلال کے ساتھ اس طرح اس خطرناک و سنگلاخ وادی میں قدم رکھنا چاہیے کہ یہ طلسم فریب ٹوٹ جائے اور دنیا میں پھر خدا کی بادشاہی قایم ہو جائے۔

ازالۂ منکرات کے درجے

۳۔ مسلم کی حدیث مشہور ہے: من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه، و ذلك اضعف الايمان۔

اس حدیث کو تم نے بارہا سنا ہوگا، مگر کبھی اس کی تعلیم کے اصول و حقیقت پر نظر نہ ڈالی ہوگی۔ حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ سے اس کے سمجھنے میں مدد لو۔ یہ حدیث بتلاتی ہے کہ قانونِ الٰہی کے منشاء اور احکام کے خلاف جہاں کوئی ایک برائی بھی نظر آئے، معاً ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے زور بازو سے اس کے مٹانے کی کوشش کرے۔ یہ خصوصیت حقیقی ایمانداروں کی ہوگی، لیکن جس میں اتنی قوت نہ ہو، وہ زبان سے برا کہے اور برائی کے خلاف بہ آواز بلند احتجاج کرتا رہے۔ اس مذاق کے لوگ ایک طرح ناقص الایمان سمجھے جائیں گے۔ جس سے یہ بھی نہ ہو سکے، وہ کم از کم اپنے دل ہی میں اس آگ کو سلگاتا رہے۔ یہ ایمان کا بالکل ہی آخری اور بہت ہی ضعیف و کمزور درجہ ہے، لیکن جو طبیعتیں اتنا احساس بھی نہ رکھتی ہوں ان میں (بہ ظاہر) فرائض کی خواہ کتنی ہی پابندی موجود ہو، مگر یقین کر لینا چاہیے کہ ایمان سے ان کو مطلق سروکار نہیں۔

مگر یاد رہے کہ ازالۂ منکرات و مفاسد کے لیے دل میں کڑھنے اور زبان سے نالہ و فریاد کرنے کی صورتیں اسی وقت تک کے لیے ہیں، جب تک کہ ان سے کشود کار ممکن ہو۔

ایمان کا واحد مظہر

جہاں یہ باتیں بے سود ہوں، وہاں ایمان کا صرف ایک ہی مظہر ہے اور وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو استعمال طاقت کے قابل بنائیں، پھر اس طاقت سے منکرات اور مفاسد و مظالم کو مٹائیں،

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۹ : ۱)

جن مشرکین کے ساتھ تم نے عہد کر رکھا تھا، اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے انھیں صاف جواب ہے۔

وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

اگر اب بھی تم پھرے رہے تو جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے اور کافروں کو عذاب دردناک کی بشارت سنا دو۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِىْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝

(۹ : ۴۴-۴۵)

جو لوگ خدا کا اور روزِ آخرت کا یقین رکھتے ہیں، وہ تو تم سے اس بات کی رخصت مانگتے نہیں کہ اپنی جان و مال سے شریکِ جہاد نہ ہوں، تم سے خواہانِ اجازت تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کا اور روزِ آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور ان کے دل میں شک پڑے ہیں۔ پس وہ اپنے شک کی حالت میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا اُسوہ

حضرت ابراہیمؑ کے واقعات صاف بتاتے ہیں کہ ایسی حالت میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ دنیا میں اس وقت وہی ایک مسلمان تھے، مگر یہ تنہائی انھیں دعوت الی الحق سے مانع ہو سکی اور نہ انھوں نے ردِ مظالم اور تغییرِ منکر کے لیے صرف وظیفۂ قلب و زبان تک ہی کفایت کی، بلکہ جب یہ کوشش سودمند ہوتے نہ دیکھی تو دست و بازو سے بھی طاقت آزمائی کے لیے آمادہ ہو بیٹھے۔ پس ایمانداروں کے لیے ضرور ہے کہ اس کی پیروی کریں۔

۴۔ دعوت الی الحق کی ابتدا اپنے گھر سے چاہیے۔ یہی صورت حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی اور اسی کی تعلیم اظہارِ دعوت کا حکم دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تھی کہ وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے قریب ترین اعزہ کو ڈراؤ) اس منادی میں کامیابی ہو یا ناکامی، تاہم تجربہ و اختیار اور بصیرت کو اس سے مدد ملے گی، پھر دعوتِ عام کے لیے اسکیم مرتب کرنے میں صرف دماغ کی قوتِ متخیلہ ہی پر زور دینا نہ پڑے گا بلکہ تجربہ و عمل کے نتائج سامنے ہوں گے۔

۵۔ دعوت الی الحق کو مداہنت، پاسِ مراتب، لحاظِ عظمت سے کچھ سروکار نہیں۔ کسی بزرگ کی بزرگی یا کسی عزیز کی محبت کا اس پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے۔ اولاد پر والدین سے زیادہ کس کے احسانات ہوں گے، لیکن

دیکھتے نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو کچھ کہنا تھا، سب سے پہلے اپنے باپ ہی سے کہا اور جو کچھ کرنا تھا اس کے سرانجام میں باپ کے حقوق ابوت ذرا بھی مانع نہ ہو سکے۔

۶۔ احیاء صداقت اور اقامت حق و عدل کے لیے مخفی تدابیر بھی کرنی پڑتی ہیں۔ پوشیدہ طور پر تاکید و تدبیر سے بھی کام لینے کی حاجت پڑتی ہے اور اس مدعا کے لیے یہ تمام باتیں جائز و درست بلکہ ضروری و لازم العمل ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے بُت خانے میں کیا کیا تھا؛

۷۔ کفر و شرک و استبداد نے دلوں میں خواہ کیسی تاریکی پھیلا دی ہو، انسان اپنی انسانیت سے کتنا ہی گزر گیا ہو، امتیاز حق و باطل کی طاقتیں مُردہ ہی کیوں نہ ہو جائیں، تاہم حقیقت ایک ایسی چیز ہے کہ اخلاص کے ساتھ موثر انداز میں جب اسے پیش کیا جائے گا تو سخت سے سخت منکروں کے سر بھی اس کے آگے جھک جائیں گے۔ مستبدین کے غرور و جبروت سے مرعوب ہو کر دعوت الی الحق کی تحریک روکی نہیں جاتی اور اگر رُکتی بھی ہے تو اس طرح کہ:

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

دعوت الی الحق کے تقاضے

۸۔ دعوت الی الحق کے لیے شجاعت قلب درکار ہے۔ جرأت لسان کی حاجت ہے۔ زور آور دست و بازو کی ضرورت ہے کہ خواہ کچھ ہی پیش آئے اور خواہ کیسی ہی زحمتیں سنگ راہ ہوں مگر اپنے مشن کو سنبھالے رہے، کام کیے جائے اور کبھی مرعوب نہ ہو۔

۹۔ بڑے کام کے لیے بڑی قربانی کی ضرورت ہے، صرف دفع وقت سے دفع استبداد ممکن نہیں۔ اس قربان گاہ پر سب سے پہلے اپنی جان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے آمادہ ہو جانا چاہیے۔ اس راہ میں سنگلاخ منزلیں طے کرنی پڑیں گی۔ مشکل سے مشکل امتحان دینے ہوں گے، شدائد و نوازل سے ظرف و مقابل ہونا پڑے گا اور ہر قدم پر اس دستور العمل کی پابندی کرنی پڑے گی کہ:

ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر
در طریقِ عشق اول منزل است

حضرت ابراہیمؑ نے کیسی خطرناک جرأت کی تھی؛

۱۰۔ حق و صدق کی مقاومت ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ دستِ ستم اس میں خلل ڈال سکتا ہے، ضرر پہنچا سکتا ہے، پر اسے فنا نہیں کر سکتا۔ عزم و ثبات سے تمام بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ مخالفین ذلیل ہوتے ہیں، استبداد سے نجات ملتی ہے اور انجام کار برکت حاصل ہوتی ہے کہ والعاقبة للمتقین!

دعوۃ الی الحق کی یہ نتیجہ خیز اسکیم خود حضرت الٰہی کی ترتیب دی ہُوئی ہے۔ اب صرف اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ نئی اسکیم بنانے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ شب و روز نئی اسکیموں کا خواب دیکھتے ہیں، ان کو یہ پیام پہنچا دو۔ یہ پاک موضوع اس سے زیادہ تشریح کا طالب تھا، مگر افسوس ؎

کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمستند[۱]

---

[۱] الہلال ۲۔ جولائی ۱۹۱۳ء —

باب ۲

حضرت ابراہیمؑ اور ایک بادشاہ کا مکالمہ

آیت کریمہ "الم تر الی الذی حاجّ ابراھیم" کی تفسیر

—(۱)—

جیسا کہ جناب کو معلوم ہے، میں گزشتہ سال سے ایک سلسلۂ رسائل کی ترتیب میں مشغول ہوں، جس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالب حکیمانہ ایک ایسے نئے اسلوب سے بیان کیے جائیں کہ آج کل کی مذہب سے برگشتہ طبیعتیں اُن سے تشفی حاصل کر سکیں۔ ایک ہمدرد ملت رئیس دکن نے ان کے ترجمے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں کرانے کا بھی انتظام کر دیا ہے اور امید ہے کہ چند ماہ کے اندر ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا..... اس سلسلہ میں قرآن مجید کے متعدد مقامات ہیں جو ایک عرصہ سے میرے سامنے ہیں، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جیسا تشفی بخش ان کا حل ہونا چاہیے اس وقت تک نہیں ہو سکا ہے اور جب تک خود اپنی طبیعت مطمئن نہ ہو جائے، دوسروں کے سامنے قدم اٹھانا دیانت تحریر کے خلاف سمجھتا ہوں۔ یہ عرض کرنا ضروری نہیں کہ قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کا جس قدر بھی خاکسار ذوق پیدا کر سکا ہے، وہ سب جناب ہی کے طفیل ہے اور جناب ہی کی تحریرات کے شغف کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ان مشکلات میں بھی جناب ہی سے دستگیری کی اُمید ہے۔ اگرچہ وہ مقامات ایک سے زیادہ ہیں، مگر سردست میں جرأت نہیں کر سکتا کہ جناب کا زیادہ وقت لوں، صرف ایک مقام کی نسبت اپنا اطمینان چاہتا ہوں، جس کے خاطر خواہ حل نہ ہونے کی وجہ سے خاکسار کی زیر ترتیب کتاب کا کام رُک گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا مناظرہ

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کے مناظرہ کا ذکر ہے، جس کی نسبت ہمارے مفسرین کا بیان ہے کہ وہ نمرود تھا: الم تر الی الذی یحیی و یمیت، قال انا اُحی و اُمیت، قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فأت بھا من المغرب، فبھت الذی کفر، و اللہ لا یھدی القوم الظّٰلمین۔ مضمون اس آیت کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے نمرود نے خدا کے باب میں حجت کی۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔ یعنی زندگی اور موت اسی کے قبضۂ و تصرف میں ہے۔ اگر کوئی دوسری ہستی خدائی کی مدعی ہے، تو اسے چاہیے کہ یہ قوت و تصرف اپنے اندر ثابت کرے۔ نمرود نے اس کے جواب میں کہا۔ اگر یہی وصف خدائی کا ہے تو یہ مجھ میں بھی ہے۔ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا پورب سے سورج نکالتا ہے تو پچھم سے نکال دے

اس پر نمرود مبہوت ہو کر رہ گیا۔

مشکلات تفسیر یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ ہے، جس میں نمرود کی حیثیت خدائی کے مد
کی ہے اور حضرت ابراہیمؑ اس کے زعم باطل کا بطلان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اب اس آیت
تفسیر میں چند در چند مشکلات حائل ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ جب نمرود خدا ہونے کا مدعی تھا، تو ظاہر ہے کہ دلیل پیش کرنا اس کے ذمے تھا، نہ کہ حضرت ابراہیمؑ
ذمے، جن کی حیثیت منکر کی تھی، لیکن یہاں حضرت ابراہیمؑ اس سے کوئی دلیل نہیں مانگتے بلکہ خود اپنے پروردگار
پروردگاری کی دلیل پیش کر دیتے ہیں کہ "الذی یُحیِ ویُمیت" اور وہ اس سے معارضہ کرنے لگتا ہے۔

۲۔ پھر جب انھوں نے ایک ایسی دلیل بیان فرما دی تھی جس سے بڑھ کر واضح اور قاطع دلیل نہیں ہو سکتی، تو چاہیے
کہ نمرود کے جاہلانہ اور طفلانہ معارضے کی قلعی کھول دیتے کیونکہ وہ اپنے جہل و بلادت سے زندگی بخشنے اور موت دی
کا وہ مطلب سمجھ ہی نہ سکا تھا جو موٹی سے موٹی انسانی عقل کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ وُہ بول اٹھا کہ یہ بات تو مجھے بھی
حاصل ہے۔ ضروری تھا کہ حضرت ابراہیمؑ فرماتے، موت اور حیات بخشنے سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح وُہ ان
ذات تمام جانداروں کو نیستی سے ہستی بخشتی ہے، پھر ایک خاص وقت پر فنا کر دیتی ہے۔ اسی طرح تو بھی ایک
چھوٹے سے چھوٹا کیڑا بنا دیکھ۔ لیکن آپ یہ نہیں کہتے، بلکہ فوراً اس دلیل کو چھوڑ کر ایک دوسری دلیل پیش کر دیتے ہیں
یعنی سورج کو اس کی معمولی سمت کی جگہ دوسری سمت سے نکال دینے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس سے لازم آتا ہے
کہ گویا آپ نے اپنی پہلی دلیل کی کمزوری مان لی۔ اور (نعوذ باللہ) نمرود کے معارضے سے لاچار ہو گئے اس
اسے چھوڑ کر نئی دلیل کا سہارا لیا۔ ایک معمولی مناظر کے لیے بھی یہ بات دلیل عجز ہے، چہ جائیکہ ایک جلیل القدر
پیغمبر کے لیے۔

دُوسری دلیل پر شبہات ۳۔ پھر دوسری دلیل جو پیش کی گئی اس پر بھی شبہات وارد ہوتے ہیں۔ قرآن
ناطق ہے کہ پہلی دلیل سے نہیں، مگر دوسری دلیل سے نمرود لاجواب ہو کر رہ گیا
اعتراض ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی شوخ چشمی کا یہ حال تھا کہ موت و حیات کے وصف الٰہی تک کا بیان اسے چُپ
نہ کرا سکا، وہ اس دوسری دلیل سے کس طرح لاجواب ہو گیا؟ اگر کہا جائے، اس لیے کہ وُہ پچھم کی طرف سے
سورج نکالنے پر قادر نہ تھا، تو جواب یہ ہے کہ وہ موت و حیات بخشنے پر بھی تو قادر نہ تھا؟ جس طرح اس بات
ایک غلط مطلب ٹھہرا کر اس نے معارضہ کر دیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ ترک دلیل پر مجبور ہو گئے تھے، اسی طرح
اس کا بھی کر دے سکتا تھا کہ دنیا میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔

دلیل کی حیثیت ۴۔ علاوہ بریں دلیل کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی بات ہوتی ہے کہ اس کے اثبات سے مدعا کا ثبوت

متحقق ہو جاتا ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دلیل ایسی معلوم نہیں ہوتی۔ اُس کا اثبات اس مقدمے کے اثبات پر موقوف ہے کہ "خدا ہی ہوسکتا ہے جو سورج کو جس طرف سے چاہے نکالے"۔ لیکن سورج کا ایک سمت کی جگہ کسی دوسری سمت سے نکلنا کوئی دنیا کا محسوس واقعہ نہ تھا جو لوگوں کے علم میں ہوتا اور حضرت ابراہیمؑ اسے اپنے پروردگار کا فعل قرار دے سکتے۔ نمرود کہہ سکتا تھا کہ اچھا اگر یہی دلیل ہے تو تمھارا پروردگار پورب کی جگہ پچھم سے ایک مرتبہ نکال دکھائے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ کیا جواب دیتے؟ کیا وہ اپنے پروردگار سے چاہتے کہ نظام شمسی کا پورا کارخانہ درہم برہم کر کے سورج دوسری سمت سے نکلتا ہوا دکھا دے؟

پہلی کے مقابلے میں کمزور دلیل

۵۔ علاوہ بریں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی دلیل سے رجوع کر کے دوسری دلیل پیش کی، تو ضرور تھا کہ یہ پہلے سے زیادہ واضح و قطع ہوتی۔ ان کی پہلی دلیل یہ تھی کہ موت و حیات کی باگ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ دوسری یہ کہ اجرام سماوی اسی کے حکم و مشیت سے کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری دلیل پہلی سے زیادہ وزنی نہیں کہی جاسکتی۔ اگر موت و حیات جیسا واضح اور بدیہی معاملہ خصم کو ساکت نہ کر سکا تو اجرام سماوی کا معاملہ کیا مفید اثبات ہوسکتا ہے؟

تفسیر کبیر

میں نے بڑے ہی شوق سے حضرت امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر دیکھی تھی کیونکہ وہ قرآن مجید کے مقامات کو عقلی مباحث سے صاف کرنا چاہتے ہیں مگر میں عرض نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر مایوسی ہوئی! لطف یہ ہے کہ انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ تمام شبہات خود ہی لکھے ہیں، لیکن جواب کا جو کچھ حال ہے، اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ اس کے پڑھنے کے بعد اپنے دل کو اور زیادہ شکوک و شبہات میں مبتلا پاتا ہوں۔

پہلے شبہ پر انھوں نے بالکل توجہ نہیں کی۔ دوسرے شبہ کے دو جواب دیے ہیں: ایک یہ کہ ایک دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل کا اختیار کرنا مستدل کے لیے جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ دوسری دلیل پہلی دلیل سے اوضح ہے۔ اسے عام مفسرین کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دوسرا جواب "محققین" کا جواب قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "یہ ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل کا اختیار کرنا نہ تھا، بلکہ ایک ہی دلیل کی مزید وضاحت کر لی تھی۔ خلاصہ ان کی تقریر کا یہ ہے کہ پہلی دلیل پر نمرود نے جو اعتراض کیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے کہا "خدا کی صفت جلانے اور مارنے کی کیسی ہے؟ وہ بلا واسطہ جلاتا اور مارتا ہے، یا افلاک کی حرکت اور اس کے اثرات کے ذریعے سے؟ اگر پہلی بات ہے تو اس کا اثبات ممکن نہیں اور اگر دوسری بات ہے تو یہ انسان کو بھی حاصل ہے۔ یعنی وسائط کے ذریعے سے موت و حیات وجود میں آسکتی ہے مثلاً مرد اور عورت کے ملنے کے واسطے سے زندہ انسان پیدا ہوسکتا ہے اور قتل کے ذریعے سے اسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دلیل کی مزید وضاحت کی اور فرمایا کہ احیاء اور اماتت اگر افلاک کی حرکات سے ہے تو یہ حرکت بھی تو خدا ہی کے حکم و مشیت سے ہے۔

اس کے سوا کون ہے جو انھیں حرکت میں لا سکے ؛ اور جب اس کے سوا کوئی دوسرا افلاک کو متحرک نہیں کر سکتا، تو ثابت ہو گیا کہ احیاء اور اماتت بھی نہیں کر سکتا۔

تعجب بالائے تعجب میں حیران ہوں کہ اس امام جلیل القدر کی اس تقریر کی نسبت کیا عرض کروں ؛ ان کے جواب سے شبہ دور ہوا ہے یا اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے ؛ اول تو یہ فرض کرنا کہ نمرود کا مطلب اعتراض سے واسطہ اور بغیر واسطہ کا جھگڑا تھا، کہاں سے ثابت ہوتا ہے ؛ قرآن مجید میں تو صرف اتنا ہی ہے کہ " انا احی و امیت پھر یہ کہنا کہ یہ دوسری دلیل پہلی کی مزید توضیح ہے ، نئی دلیل نہیں ، کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ افلاک کی حرکت کو موت وحیات سے کیا تعلق ؛ کیونکر یہ استدلال پہلی دلیل کے ساتھ مربوط ہو سکتا ہے ؛ پہلی دلیل کا تعلق جلانے اور مارنے کی صفت سے تھا۔ دوسری میں سورج کے طلوع و غروب کی جہت سے — اس میں اور موت وحیات کی طاقت و تصرف میں کوئی علاقہ نہیں۔ تعجب ہے کہ کیونکر امام موصوف ایسی کمزور اور بے ربط بات کو محققین کا مذہب قرار دیتے ہیں اور وثوق کے ساتھ قرار دیتے ہیں۔

پھر مفسرین کا یہ عام مذہب بھی کہ دوسری دلیل پہلی سے اوضح ہے ، تشفی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ صاف بات تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ پہلی دلیل ہی زیادہ واضح اور قطعی تھی۔

امام رازی اور جواب شبہ تیسرے شبہ کا جواب امام موصوف نے یہ دیا ہے کہ نمرود دوسری دلیل کا معارضہ نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے ، خدا نے اُس وقت اس کے حواس مختل کر دیے ہوں۔ وہ اس قابل ہی نہ رہا ہو کہ اعتراض کرے۔ سوال یہ ہے کہ اگر معترض اور مشکک کو اسی طرح حواس باختہ کر کے چپ کرا دینا تھا، تو پھر اس مناظرہ کی ضرورت ہی کیا تھی ؛ پہلے ہی سے مخبوط الحواس بنا دیا جاتا کہ وہ اعتراض ہی نہ کر سکتا۔ علاوہ بریں اگر خدا تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو معترضین انبیاء کرام سے معارضہ کرتے ہیں ان کے حواس سلب کیا کرتا ہے ، تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام کے پاس مسکت اور قاطع جواب نہیں ہوتے، اس لیے غریب معترضین مخبوط الحواس کر کے چپ کرا دیے جاتے ہیں۔ کیا ایسے جوابوں سے قرآن مجید کے معارف روشنی میں آسکتے ہیں خصوصاً اس زمانے میں !

کیا یہ محققین کی تفسیر ہے ؟ خود امام صاحب بار بار اس پر زور دیتے ہیں کہ " جب ایک دلیل یا مثال خصم کے مقابلے میں پیش کی جائے اور اس پر وہ نافہمی سے اعتراض کر دے تو مستدل کا فرض ہے کہ اُس کے اعتراض کی خامی ظاہر کر دے اور بغیر اس کے آگے نہ بڑھے اور جب ایک معمولی مناظر کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ ایک نبی اولو العزم کے لیے کیوں ضروری نہ ہو جس کا مناظرہ تمام دنیا کے سامنے بطور ایک بنیادی صداقت کے پیش کیا جا رہا ہے ؟ " تاہم وہ اس قوت کے ساتھ اعتراض وارد کر کے ، اس کا کوئی کمزور

اور جواب بھی نہیں دیتے اور صرف یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ "محققین کی تفسیر پر شبہات وارد نہیں ہو سکتے" حالانکہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ خواہ نئی دلیل بیان کی جائے، خواہ نئی مثال، ضروری ہے کہ انتقال سے پہلے معارض کی خامی واضح کر دی جائے۔ پس جس طرح شبہ عام مفسرین کی تفسیر پر وارد ہوتا ہے اسی طرح اس تفسیر پر بھی وارد ہوتا ہے جسے امام موصوف "محققین" کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔

دوسری تفسیروں کا مطالعہ مجھے جب اس طرف سے مایوسی ہو گئی تو خیال ہوا کہ موجودہ زمانے کے محققین نے اس پر ضرور نئی روشنی ڈالی ہو گی۔ چنانچہ میں نے بمبئی سے استاذ امام شیخ محمد عبدہ مصری کی تفسیر منگوا کر دیکھی، لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی وہی امام رازی والی تفسیر بجنسہٖ پائی۔ ان شبہات کا کوئی جواب نہ ملا۔ تفسیر نیشاپوری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر علامہ ابن مسعود، تفسیر روح المعانی شیخ آلوسی بھی خاکسار کے پیش نظر ہیں، مگر ان سب میں بھی یا تو وہی تفسیر کبیر والا جواب نقل کر دیا ہے یا وہ باتیں لکھ دی ہیں جنھیں امام رازی نے عام مفسرین کا جواب قرار دیا ہے یا پھر سرے سے کسی طرح کی کاوش ہی نہیں کی گئی۔

مولانا سے التماس جب پچھلوں میں حضرت امام رازی جیسے محقق نے اور حال کے محققین میں شیخ محمد عبدہٗ مصری جیسے امام و مفسر نے مجھے صاف جواب دے دیا تو پھر میرے لیے صرف جناب ہی کی چوکھٹ رہ گئی۔ لاریب صرف جناب ہی کی ایک ذات والا صفات ہے جو موجودہ زمانے میں حقائق قرآن کی وہ تمام مشکلات حل کر دے سکتی ہے جن تک دوسروں کی نظر و تحقیق نہیں پہنچ سکی۔ اب خاکسار ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ سے دستگیری کا طالب ہے اور امید قوی رکھتا ہے کہ مایوس نہ ہو گا۔

مجھ سے میرے حیدر آباد کے ایک دوست نے ذکر کیا تھا کہ جمعیت العلماء ہند نے عید کے موقع پر اخبار "الجمعیت" کا ایک خاص نمبر "خلیل نمبر" کے نام سے نکالا ہے اور اس میں صدر جمعیت مولانا کفایت اللہ صاحب نے اس مقام کی نہایت شرح و بسط سے تحریر فرمائی ہے۔ میں نے بڑے ہی شوق سے خلیل نمبر منگوایا اور دیکھا واقعی اس میں مولانا صاحب موصوف کا بیان "مناظرہ خلیل و نمرود" کے عنوان سے تین بڑے صفحوں میں نکلا ہے لیکن مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں تمام تر وہی تفسیر کبیر کی پوری بحث اردو میں منتقل کر دی گئی ہے۔ اس سے زیادہ ایک حرف نہیں۔ (مولوی عبدالحق سکندر آبادی)

اس استفسار کا جواب مولانا نے ۱۱۔ نومبر ۱۹۲۷ء کے "الہلال" سے شروع کیا اور یہ چار نمبروں میں مکمل ہوا۔

تفسیر کا قرآنی طریق ۱۔ قرآن حکیم کے مطالعہ و تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں، وہ اس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہیں ہو جائیں گے۔ یہ موقع تفصیل و اطناب کا نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ صدر اول کے بعد سے قرآن حکیم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہو گئی ہیں: ایک "قرآنی" ہے، دوسری "غیر قرآنی"۔ قرآن کے فہم و تدبر کے لیے غیر قرآنی طریقہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے

اس پر آپ کو تعجب ہو۔ اس میں شک نہیں یہ معاملہ فکر انسانی کے عجائب تصرفات میں سے ہے مگر ایسے تصرفات اس کثرت سے ہو چکے ہیں کہ انھیں عجیب سمجھتے ہوئے بھی ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہیے۔

"قرآنی" طریقے سے مقصود قرآن کے مطالعہ و فہم کا وہ طریقہ ہے جو تمام تر قرآن پر مبنی تھا۔ قرآن سے باہر کے اثرات کو اس میں دخل نہ تھا۔ عربی لغت کے صاف اور معروف معانی، عربی بول چال کے بے تکلف اور سادہ محاورات، صدر اوّل کا بے لاگ ذوق و فہم اور انبیاء کرام کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان، اس طریقہ کی خصوصیت تھیں۔ سلف امت کا طریق تفسیر یہی تھا۔

غیر قرآنی طریقہ

"غیر قرآنی" طریقے سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے۔ یہ علوم وضعیہ کی اشاعت، رومی، ایرانی اور ہندی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقوام کے اختلاط کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن کے مطالب اسی شکل و نوعیت میں دیکھے، جیسی شکل و نوعیت کی فکری حالت ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ قرآن کے الفاظ، تراکیب، اسلوب بیان، دلائل و براہین، مواعظ و حکم، سب نے ایک دوسری ہی طرح کی نوعیت پیدا کر لی۔ قرآن کی تعلیم و بیان کی تمام تر بنیاد فطریت اور فطریت کی سادگی پر تھی۔ علوم و فنون کی تمام تر بنیاد وضعیت اور وضعیت کے تعمق اور کاوش پر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہاک بڑھتا گیا، فطریت کے فہم و ذوق کی استعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا، جب لوگوں کے دماغ وضعیت اور وضعی طریق بحث کے اس درجہ عادی ہو گئے کہ کسی اہم اور عظیم بات کو اس کی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ذہن کی کاوش پسندی جو علوم وضعیہ کے اشتغال کا لازمی نتیجہ ہے، آسان اور سہل مطالب کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہ صورت حال صرف قرآن ہی کو پیش نہیں آئی، بلکہ مختلف صورتوں اور حالتوں میں تمام صحف سماوی کو پیش آچکی ہے اور منجملہ ان اسباب کے ہے جو ہمیشہ کتب و ادیان کی تحریف کا باعث ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داعی قرآن صلعم نے اسے "تعمق" اور "تنطع" سے تعبیر کیا اور فرمایا ہلاکت کی راہوں میں سے ایک راہ یہ بھی ہے، جیسا کہ متعدد مرفوعات میں وارد ہے۔ یہ موقع تشریح کا نہیں۔ اگر آپ وقتِ نظر سے کام لیں گے تو ان چند جملوں کے اندر اصولِ تفسیر کی ایک اصل عظیم آپ کے سامنے آجائے گی یہ اصل عظیم نہ صرف تفسیر قرآن میں، بلکہ علم و نظر کے بے شمار گوشوں میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہے، ذہن انسانی "وضعیت" میں جس قدر کاوش پسند ہوتا گیا ہے، اتنا ہی "فطریت" سے دور ہوتا گیا ہے۔

بہرحال یہ دوسرا "غیر قرآنی" طریقہ ان تمام طریقوں پر مشتمل ہے جو صدرِ اوّل کے بعد پیدا ہوئے۔ متکلمین مفسرین کا طریق تفسیر کم و بیش یہی ہے۔ کوئی اس طریقے میں ایک خاص حد تک گیا ہے، کوئی بہت زیادہ دُور تک۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی راہ کے شہسوار ہیں۔ ان کے بعد اکثر مفسرین نے دانستہ یا نادانستہ اُنہی کا نقش قدم اختیار

لیا۔ قاضی ابن رشد کی کشف الدولہ اور فصل المقال اور شیخ الرئیس کی بعض مختصر تفسیریں امام رازی اور مفسرین متکلمین
نے پہلے لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم معلوم کر لے سکتے ہیں متکلمین اشاعرہ، فلاسفۂ اسلام اور معتزلہ سے کتنا ہی
ر کرتے ہوں، لیکن وہ خود بھی اسی طریقے کی پیداوار تھے، بہتر قسم کی نہیں ناقص اور کمزور قسم کی پیداوار۔

سلف کا طریقہ

ایک سخت بنیادی غلطی جو اس طریقے کی مقبولیت کا باعث ہوئی، متاخرین کا یہ خیال تھا کہ وقت کی علمی ضرورتوں کے لیے سلف کا طریقہ سودمند نہیں۔ یہ بات ضرب المثل کی طرح ان کی زبانوں پر
ی ہوگئی تھی کہ "سلف کا طریقہ ایمان کے لیے بہتر ہے مگر استدلال کے لیے مفید نہیں" حالانکہ اگر ایمان کو جہل سے
نا بلکہ علم و بصیرت سے پیدا ہونا چاہیے، تو جو طریقہ ایمان و یقین کے لیے سودمند ہوگا، وہ استدلال و برہان کیلیے
ں غیر مفید ہو؟ جہاں تک نام نہاد علمی ضروریات کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ متاخرین کے طریقے سے بڑھ کر کمزور
امراد طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ "استدلال" کو فنون وضعیہ کے "منطقی استدلال" سے باہر نہیں دیکھ سکے اور
ان وطبیعت کی حقیقی شہادتوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ آپ نے اپنے استفسار میں جابجا لکھا ہے کہ "امام رازی
اللہ علیہ کا طریقہ موجودہ زمانے میں سودمند نہیں" لیکن میں کہتا ہوں اس تقیید کی کیا ضرورت ہے؟ یہ طریقہ تو کسی
زمانے میں سودمند نہ تھا۔ کیا یہ طریقہ اس زمانے میں سودمند تھا جب امام صاحب نے تفسیر لکھی ہے؟ اس کا حال
نہی سے پوچھ لینا چاہیے۔ اُن سے بہتر ان کی نارسائیوں کے لیے کوئی شاہد نہیں ہو سکتا۔

رازی کا اعتراف

تفسیر اور اساس التقدیس وغیرہ ان کے ابتدائی اور درمیانی عہد کی کوہ کندنیوں میں سے ہیں
آخری عہد کی مصنفات میں سے ایک رسالہ مباحث ذات و صفات میں ہے، اس کے
ریں مشکلات مباحث کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"لقد تاملت الطرق الکلامیہ والمناہج الفلسفیہ، فما رایتہا تشفی غلیلاً، ولا تروی غلیلاً،
ایت اقرب الطرق، طریقۃ القرآن، اقرا فی الاثبات: الرحمٰن علی العرش استوی، واقرا فی النفی
کمثلہ شیئ و من جرب مثل تجربتی، عرف مثل معرفتی"۔

یعنی میں نے علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں پر غور کیا، لیکن معلوم ہوا کہ مشکلات راہ کے لیے کچھ سودمند نہیں۔
سے بہتر طریقہ قرآن ہی کا طریقہ ہے!

من المحبت ما ارق بیانہ
متحیر فیہ امام الرازی

امام صاحب کا یہ اعتراف بعینہٖ وہی اعتراف ہے جو موجودہ اور قدیم عہد کے تمام حکماء کی زبانوں پر بھی طاری
ہے۔ یہ مذہبی مباحث کی راہ سے اس کوچے میں آئے تھے، اس لیے الٰہیات کی اصطلاحوں میں اعتراف عجز

کر رہے ہیں لیکن لامارک، ہیگل اور اسپنسر براہ راست حقائق کائنات کی جستجو میں نکلے تھے اس لیے وہ ان مصطلحا
کی جگہ دوسری طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اعتراف عجز کی ایک ہی طرح کی رُوح دونوں کے اندر بو
رہی ہے۔ لامارک کے اس قول میں کہ "ہمارا سارا علم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ جہل کا اقرار کریں" یا اسپنسر کے ا
اعتراف میں کہ "اصلیت اور حقیقت" کے ان تمام سوالوں کے جواب میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کچھ ن
جانتے اور امام رازی کے اس اعتراف میں کیا فرق ہے کہ،

نهاية اقدام العقول عقال
واكثر سعى العلمين ضلال
ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا
سوى ان جمعنا فيه قيل وقال

باب ۲۱

حضرت ابراہیمؑ اور ایک بادشاہ کا مکالمہ

—(۲)—

بہرحال جب تک قرآن حکیم کی تفسیر خالص قرآنی طریقے پر نہیں کی جائے گی، مشکلاتِ راہ حل نہیں ہو سکتیں۔

قرآن حکیم اور وضعی علوم

۲— ایک اور اہم اور بنیادی کام اس باب میں یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ، تراکیب اور اسلوب بیان کو تمام وضعی اور خارجی عوارض سے پاک کر کے ان کی اصلی صورت و نوعیت میں نمایاں کر دیا جائے۔ جونہی یہ اصلیت نمایاں ہو گئی، تمام اشکال خود بخود دُور ہو جائیں گے۔

قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہُوا۔ اُس کے الفاظ عربی زبان کے الفاظ تھے۔ وُہ اُنہی معانی کے لیے استعمال کیے گئے تھے، جن معانی کے لیے عربی لغت میں مستعمل تھے۔ قرآن نے خود جابجا اپنے عربی زبان میں ہونے، نہایت کھُلے اور دلنشیں ہونے اور مطالب کے سہل اور زود فہم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ مریم میں کہا کہ "فانما یسرناہ بلسانك لتبشربه المتقین" ہم نے قرآن تمہاری زبان میں سہل کر دیا تاکہ متقی طبیعتوں کے لیے اس میں ہدایت کی بشارت ہو، ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ عظیم اور ابتدائی وصف باقی نہیں رہتا، اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کے الفاظ اُن عام اور معروف معانی کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم بھی رکھتے تھے جو عرب جاہلیت کی لغت میں نہیں سمجھے جاتے تھے۔ صدرِ اوّل میں چونکہ مسلمانوں کا ذوق خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوا تھا، اس لیے قرآن کے تمام الفاظ اپنے لغوی معانی میں قائم رہے۔ بلاشبہ اُس عہد میں بھی ہر انسان جو قرآن کا علم رکھتا تھا، الفاظ قرآنی کے مجازات سے واقف تھا، لیکن یہ زبان اور بول چال کے ویسے ہی صاف اور سادہ مجازات تھے، جو دنیا کی ہر زبان میں ہوتے ہیں اور جن کے معلوم کرنے کے لیے کبھی کسی اہل زبان کو کسی فلسفیانہ فنِ بلاغت و بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن کعب جب "بل یداہ مبسوطان" "الیه یصعد الکلم الطیب" پڑھتے تھے، تو بغیر اس کے کہ فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں سے آشنا ہوں اور ید و علو کے نفی و اثبات کی بحثوں میں اُلجھیں، اس کا وہ سیدھا سادھا مطلب سمجھ لیتے تھے، جو ہر غیر متکلف عربی دان سمجھ لے گا۔

لیکن آگے چل کر جب علوم دخیلہ کی (یعنی ان علوم و فنون کی جو باہر سے عربی زبان میں منتقل ہُوے) اشاعت ہوئی اور وضعی علوم کی اصطلاحات اور نظری مباحث کی منطقی تعریفات و حدود کا لوگوں میں مذاق پیدا ہو گیا، تو ایک بڑی جماعت ان لوگوں کی پیدا ہو گئی، جنہوں نے قرآن کو آہستہ آہستہ منطقی و فلسفی جامہ پہنانا شروع کر دیا

اور بتدریج اس کے الفاظ عربی لغت سے ہٹ کر منطقی تعریفات و حدود کی نوعیت اختیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد اُن الفاظ کے لیے وہی معانی سمجھے جانے لگے جو علوم وضعیہ میں ان کے لیے قرار پا چکے تھے

الفاظ و مطالب میں تبدیلی

۳- یہ تبدیلی الفاظ اور مطالب، دونوں میں ہوئی۔ مطالب میں بنیادی چیز قرآن کا اسلوب بیان و استدلال ہے۔ ایک عظیم اور اصولی غلطی متاخرین سے یہ ہوئی کہ وہ قرآن کے فطری اور وجدانی اسلوب بیان کی اہمیت معلوم نہ کر سکے۔ یونانی فلسفہ کے اشتغال نے اُن میں منطقی استدلال کا ذوق پیدا کر دیا تھا انھوں نے کوشش کی کہ جہاں کہیں قرآن حکیم میں استدلال اور اثبات مدعا کی قسم کا کوئی بیان ہے اسے کھینچ تان کر منطقی استدلال کی شکل دے دیں۔ حالانکہ انبیاء کرام کے علوم کی راہ وضعی و منطقی طریق استدلال کی راہ سے بالکل مختلف ہے۔ انبیاء کرام کا خطاب علوم سے نہیں بلکہ قلوب سے ہوتا ہے۔ وہ علماء کے لیے بحث و نظر کا سامان پیدا کرنے نہیں آتے بلکہ عامۃ الناس کے لیے ہدایت و سعادت کی راہیں کھول دینے کے لیے آتے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اشیاء کی حقیقت کا سراغ لگائیں، وہ اس لیے آتے ہیں کہ اعمال اور ان کے نتائج کی حقیقت دنیا پر واضح کر دیں۔ پس وہ اپنی تعلیم و ہدایت میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرتے، جسے کسی طرح کی بھی مشابہت منطقی طریق بحث و استدلال سے ہو۔ ان کا طریقہ سیدھا سادھا فطری طریقہ ہوتا ہے، جس کے لیے نہ تو انسان کے بنائے ہوئے علوم و فنون کی تحصیل ضروری ہوتی ہے، نہ پیچیدہ اور دقیق مقدمات ترتیب دینے پڑتے ہیں اور نہ کسی طرح کی ذہنی کاوش اور نظری سلوک کی قید ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے وجدان کی قدرتی استعداد اور طبیعت بشری کے فطری طلب و داعیہ سے اسے سنتے ہی قبول کر لے سکتا ہے اور ایک فلسفی و حکیم سے لے کر ایک بادیہ نشیں دہقان تک، ہر درجے، ہر طبقے اور ہر زمانے کا انسان یکساں طور پر اس سے یقین و ایمان حاصل کر لیتا ہے!

انبیاء کا فطری طریق تعلیم

انبیاء کرام (علیہم السلام) حکماء کے وضعی طریق استدلال کی جگہ فطری طریق تعلیم کیوں اختیار کرتے ہیں؟ میں اس کی تشریح یہاں نہیں کروں گا، کیوں کہ اولاً تو یہ تحریر تشریح کی متحمل نہیں، ثانیاً آیۂ زیر بحث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی تشریح آگے آئے گی۔ البتہ ترتیب بیان کے لیے مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ:

اولاً انبیاء کرام کی تعلیم کا مقصود بحث و نظر نہیں ہوتا، ایمان و یقین ہوتا ہے۔ ایمان و یقین کے لیے وضعی علوم کا طریق استدلالی کسی حال میں بھی سُود مند نہیں۔ انبیاء کرام کے تمام احکام کا دار و مدار ماوراء محسوسات حقائق پر ہے جسے قرآن حکیم نے عالم "غیب" سے تعبیر کیا ہے۔ عالم "غیب" کے معاملات خلاف عقل نہیں ماوراء عقل ضرور ہیں، اس لیے ان کا علم نظری استدلال کے ذریعے سے نہیں بلکہ صرف وجدانی شہادت کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ وجدانی شہادت جو فطرت انسانی میں ودیعت کر دی گئی ہے اور جس کا اذعان قدرتی طور پر

انسان کے اندر موجود ہے۔ پس انبیاءِ کرام کا طریقِ ارشاد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے وجدان سے خطاب کرتے ہیں، نہ کہ مجرد ذہن و ادراک سے۔

ثانیاً، ایک اصلِ عظیم اس باب میں یہ ہے کہ انبیاءِ کرام کا طریقِ تعلیم "مقدمات" کا طریقہ نہیں ہوتا۔ "براہِ راست" تلقین کا طریقہ ہوتا ہے۔

عام بول چال میں اس کا مطلب یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی بات کے ثابت کرنے اور منوا لینے کے طریقے دو ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے مخاطب سے چند ایسی باتیں منوالی جائیں جو گو اصل مدعا نہیں، لیکن ان کے تسلیم کر لینے کے بعد مدعا کا تسلیم کر لینا ضروری ہو جائے گا۔ یہ طریقہ "مقدمات" کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو بات مخاطب کے دل میں اتارنی ہو، وہ ایسی شکل و نوعیت میں بیان کر دی جائے کہ بغیر کسی دوسری بات کے سہارے کے، خود بخود دلنشیں ہو جائے۔ اُس بات کے سمجھنے، مان لینے اور شک و انکار سے محفوظ ہو جانے کے لیے کسی دوسری بات کو سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ یہ طریقہ "براہِ راست" تلقین کا ہے کیونکہ اس طریقے میں اثباتِ مدعا کے لیے جو کچھ کہا جاتا ہے، مقدمات کا محتاج نہیں ہوتا۔ پہلا طریقہ علوم وضعیہ اور نظّار کا ہے۔ دوسرا طریقہ طریقِ فطری اور انبیاءِ کرام کا ہے۔

زبان نہیں، دل

انبیاءِ کرام اگر اپنی تعلیم میں مقدمات کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ ان کا خطاب عام نوعِ بشر سے نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ بجز چند افراد کے جنھوں نے علوم وضعیہ کے طریقے پر مقدمات کے بحث و نظر کی استعداد پیدا کر لی ہو، عامۃ الناس نہ تو ان کی تعلیم سمجھ سکتے، نہ ایمان کے لیے مکلف ہو سکتے۔ انبیاء کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ ایمان کی براہِ راست دعوت دینے کی جگہ پہلے مدرسوں میں وضعی علوم کی تعلیم دیتے پھرتے۔ پھر تعلیم کے بعد مقدمات ترتیب دے کر اثباتِ مدعا کی شکلیں بناتے۔ پھر ان مقدمات میں سے ایک ایک مقدمہ پر لڑتے جھگڑتے۔ پھر جب مخاطب ان مقدمات کے جال میں اُلجھ جاتا، تو اسے بے بس کر کے اقرار کرا لیتے۔ یہ طریقہ حکماء کی بحث و نظر کا ہے "دعوت" کا نہیں ہے اور انبیاءِ کرام "داعی" ہوتے ہیں، "مناظر" اور "نظّار" نہیں۔

عجز نہیں، یقین

ثالثاً مقدمات کا طریقہ جیسا کچھ بھی ہو، یقین نہیں پیدا کر سکتا، عجز پیدا کر دیتا ہے اور دونوں میں فرق ہے۔ انبیاء اپنے مخالفین میں یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بحث میں عاجز کر کے چپ کرا دینا نہیں چاہتے۔ مقدمات کا طریقہ پیچ در پیچ اور چند در چند نظری مسلّمات پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر مخاطب اس پیچ و خم کا شاطر نہیں، تو بہت جلد لاجواب ہو کر چپ ہو جائے گا، یہ "چپ ہو جانا" نہ کہ "مطمئن ہو جانا" طریقِ مقدمات میں مناظر کی فتح سمجھی جاتی ہے لیکن انبیاءِ کرام زبان نہیں، دل جیتنا چاہتے ہیں اور زبان کے بے بس ہو جانے سے دل میں یقین نہیں پیدا ہو جاتا۔ تم ایک تیز زبان آدمی سے گفتگو میں بازی نہیں لے جا سکتے اس لیے ہار مان لیتے ہو، مگر اس سے دل کا اعتقاد تو نہیں پیدا ہو جائے گا۔

بدلنے والی بنیادیں

رابعاً مقدمات کے طریقے کا تمام تر دار و مدار وضعی علوم کے نظری مسلمات پر ہوتا ہے اور یہ مسلمات نہ تو ہر حال میں حقیقی ہیں، نہ ہر زمانے کی علمی استعداد یکساں طور پر ان کا اعتراف کر سکتی ہے، بہت ممکن ہے کہ کل تک جو بات مسلم طور پر مانی جاتی تھی آج اتنی کمزور ہو جائے کہ لوگ اس کی ہنسی اڑائیں۔ ایمان کی بنیاد ایسی متغیرہ اور متلون بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ہر فرد، ہر جماعت، ہر طبقے اور ہر زمانے کے لیے ایک یکساں حقیقت ہے۔ یہ محل تفصیل کا نہیں، ورنہ مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی۔ ہمارے حکماء اور متکلمین نے حدوثِ عالم اور اثبات صانع کے کتنے ہی استدلال ترتیب دیے تھے، جن کی بنیاد اس وقت کے مذاہب فلسفہ کے نظری مسلمات پر رکھی گئی تھی، لیکن آج ہم کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے انھیں دہرانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

جھگڑے نہیں، رشد و ہدایت

۵۔۔۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ نہیں، بلکہ اس نے واضح طور پر اس طریقے کی مذمت کی ہے، اور اسے بھی انھی طریقوں میں سے قرار دیتا ہے جو اس کے نزدیک "جدل" کے طریقے ہیں اور جو طریق "دعوت" و "ہدایت" کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ طریقہ جھگڑنے اور لفظوں اور باتوں کے پیچ میں مخاطب کو کس دینے کے لیے ضرور مفید ہے، مگر اذعان و یقین کے لیے کہ طریق دعوت و ہدایت کا مقصد وحید ہے، کچھ مفید نہیں۔ بلاشبہ اس طریق کا عامل ایک علمی قسم کا جھگڑالو بن جاتا ہے، لیکن مرشد اور ہادی نہیں بن سکتا۔ اس کی طبیعت کبھی اس طرف نہیں جاتی کہ سچائی اور حق معلوم کرے، وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے کہ اپنے بنائے ہوئے قاعدوں، گڑھے ہوئے مقدموں اور ڈھونڈی ہوئی اصطلاحوں سے کسی نہ کسی طرح مخاطب کو لاجواب کر دے۔ رفتہ رفتہ خود اس کا قلب بھی حقیقت سے ناآشنا اور اسی قسم کی باتوں پر قانع ہو جاتا ہے، جنھیں انگریزی میں "ٹکنیکل" قسم کی باتیں کہتے ہیں (لفظ صناعی اس کا پورا مفہوم ادا کرنے کے لیے کافی نہیں، الا یہ کہ اختیار کر لیا جائے) اگر وہ ایک مخاطب کو جو حق کی جستجو اور یقین کی راہ میں اس سے نزاع کر رہا ہے، صرف ایک لفظ کی غلطی یا کسی اصطلاحی قاعدے کی ناآشنائی یا ترتیبِ مقدمات کے پیچ و خم کے الجھاؤ سے شرمندہ کر دے سکے اور لاجواب بنا دے تو وہ اسے اپنی بڑی سے بڑی فتح مندی سمجھے گا، اور اسے "مناظرہ میں ہرا دینے" سے تعبیر کرے گا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچے گا کہ اس نام نہاد فتح و شکست سے حقیقت اور سچائی کا فیصلہ کیوں کر ہو گیا؟ یہ زیادہ سے زیادہ مناظرے کی جیت ہے، حقیقت کا فیصلہ تو نہیں، اگر وہ اس مناظرانہ کج اندیشی کی مدہوشی سے افاقہ پائے اور خود اپنے دل کی گہرائیوں کا حساب لے تو اسے معلوم ہو جائے کہ جس بات کے منوانے کے لیے وہ ایک عالم کو چپ کراتا پھرتا ہے، خود اسی کے دل کو اس پر قرار نہیں۔ قرآن و سنت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس طرح کے تمام طریقے، نہ صرف حصولِ مقصد کے لیے سود مند نہیں، بلکہ ہدایت و یقین کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں۔

جدل و خصومت کی راہ

قرآن اِن تمام طریقوں کو "خصومت" اور "جدل" یعنی لڑنے جھگڑنے کی راہ قرار دیتا ہے۔ اس نے جا بجا اس نوعیت کے اعتراضات اور تشکیکات نقل کی ہیں۔ پھر بتلاتا ہے کہ یہ حق و ہدایت کی راہ نہیں، خصومت اور جھگڑنے کی روش ہے۔ سورۂ یٰسین میں منکرین کا یہ استفہام تشکیکی نقل کرنے کے بعد کہ "و یقولون متیٰ ھٰذا الوعد ان کنتم صٰدقین"، فرمایا: "ما ینظرون الا صیحۃ واحدۃ تاخذھم وھم یخصمون[1]!" "خصومت" کا لفظ یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ زخرف میں منکرین کا یہ انداز سخن نقل کیا ہے کہ "ولما ضرب ابن مریم مثلاً، اذا قومک منہ یصدون۔ وقالوا: ءالھتنا خیر ام ھو[2]؟" اس کے بعد کہا "ما ضربوہ لک الا جدلا، بل ھم قوم خصمون[3]!" یعنی منکروں کی یہ فکری حالت کہ وہ بات کی حقیقت پر غور کرنے کی جگہ فرضی اور تخمینی صورتیں پیدا کر کے کج بحثی کرنا چاہتے ہیں۔ راستی و حق پرستی کا طریقہ نہیں، "جدل" کا ڈھنگ ہے۔

دعوت الی الحق کا قرآنی طریقہ

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے دعوت الی الحق کا طریقہ واضح کرتے ہوئے کہا: ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ، وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل: ۱۲۶) اس آیت میں بالترتیب تین طریقوں کا ذکر کیا ہے: حکمت، موعظۂ حسنہ اور جدل۔ لیکن جدل کو "بالتی ھی احسن" کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ یعنی ایسا جدل جو اچھے طریق پر کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک "جدل" حکمت و موعظت کی طرح محمود و مطلوب نہیں، اِلّا یہ کہ "بالتی ھی احسن" ہو۔

جس آیت کی نسبت آپ نے استفسار کیا ہے، دراصل وہ اس حقیقت کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ واضح کرتی ہے کہ انبیاء کا طریق دعوت و ہدایت کا ہے، جدل کا نہیں اور تشریح اس کی آگے آئے گی۔

متکلمین کا منطقی ذوق

۶ —— لیکن افسوس ہے کہ متکلمین کا منطقی ذوق طریق قرآنی کی اہمیت و حقیقت معلوم نہ کر سکا، انھوں نے قرآن کو بھی وہی منطقی جامہ پہنا دینا چاہا، جو خود انھوں نے علم و نظر کے ہر گوشے میں پہن لیا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ قرآن کے لیے ایک مصنوعی طریقہ تھا اس لیے قدم قدم پر طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں۔ لغت ساتھ نہیں دیتی تھی، عربی اسلوب بیان قطعاً مخالف تھا، سیاق و سباق کا مقتضا کچھ اور ہی کہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کا عام نظم بیان اس طریق کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔ تاہم وہ اپنی موشگافیوں اور کاوکاویوں میں برابر بڑھتے ہی گئے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر ایک نیا کارخانۂ استدلال گڑھ کر کھڑا کر دیا۔ اب دنیا کہتی ہے کہ قرآن کی

---

[1] یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکا ہے، جو یکایک انھیں عین اس حالت میں آ پکڑے گا کہ وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔ [2] جب ابن مریم کی مثال پیش کی جاتی ہے تو تیری قوم چلا اٹھتی ہے اور کہتی ہے کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ [3] تمہارے سامنے یہ مثال وہ کج بحثی کی غرض سے لائے ہیں۔ دراصل وہ ہیں ہی جھگڑالو۔ [4] اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو۔ اچھے طریق پر پند و نصیحت کرو۔ ان مخالفوں سے بحث و نزاع بھی حسن و خوبی کے طریقے پر کرو۔

مشکلات حل نہیں ہوتیں لیکن کوئی نہیں جو اس حقیقت پر سے پردہ اٹھائے کہ مشکلیں قرآن کی مشکلیں نہیں، مفسرین کی پیدا کی ہوئی مشکلیں ہیں۔ اگر ایک بات کو اس کی زبان، اس کے اسلوب اور اس کے قدرتی معانی سے ہٹا کر ایک دوسری طرح کی شکل دے دی جائے گی، تو یقیناً وہ صاف نہیں رہے گی، مشکلات کا ایک معما ہی بن جائے گی!

قرآن کا اپنا دعویٰ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے ساتھ ہم دو ہی طرح کا سلوک کر سکتے ہیں: یا تو اس کی سچائی تسلیم کریں یا انکار کر دیں۔ اگر ہم اس کی سچائی تسلیم کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ تمام اوصاف بھی تسلیم کر لیں جو اس نے اپنی نسبت بار بار بیان کیے ہیں۔ اِن اوصاف میں سب سے پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے سہل ہے، کسی اعتبار سے بھی مشکل نہیں۔ پس قرآن سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر مشکل اور پیچیدہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی تفسیر، کوئی تاویل، کوئی ایسی بات جس سے اس کی کوئی ایسی سورت، کوئی ایک رکوع، کوئی ایک آیت بلکہ اس کا کوئی ایک لفظ بھی مشکل اور مقدمات طلب بن جائے، قرآن کے لیے سچی تفسیر اور سچی بات نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ سچی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ قرآن جسے سچ ہونا چاہیے، بار بار کہتا ہے: و لقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر (القمر: ۱۷) فانما یسرنٰہ بلسانک لعلھم یتذکرون (الدخان: ۵۸) ھو الذی ینزل علی عبدہ ایٰت بیّنٰت لیخرجکم من الظلمٰت الی النور (الحدید: ۹) قرآناً عربیاً غیر ذی عوج (الزمر: ۲۸) فانما یسرنٰہ بلسانک لتبشر بہ المتقین (مریم: ۹۷) و انہٗ لتنزیل رب العٰلمین۔ نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین! (الشعراء: ۱۹۵) لقولٌ فصلٌ وما ھو بالھزل (الطارق: ۱۴) یعنی قرآن صاف اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس کی تعلیم بالکل کھلی ہوئی اور اس کا طریق بیان تمام تر سہل اور دل میں اُتر جانے والا ہے سچائی اس میں گھول دی گئی ہے۔ حقیقت کے لیے اس میں کوئی نقاب نہیں۔ اُس کا بیان یک قلم سیدھا سادہ ہے، کسی طرح کی ٹیڑھ اور پیچیدگی اُس میں راہ نہیں پا سکتی۔ اس کے سمجھنے بوجھنے کے لیے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ دل لگنے والا اور کان سننے والا ہو۔ اُسے صرف سُن لینا ہی اُسے پا لینا ہے اور اسے دیکھ لینے سے انکار نہ کرنا اس کی شیفتگی اور عشق کا اقرار ہے!

علاوہ بریں قرآن نے جا بجا اپنے نام گنائے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں "موعظۃ" ہوں۔ "ذی الذکر" ہوں، "تبیاناً لکل شئ" ہوں، "تذکرہ" ہوں، "ھدًی و رحمۃ" ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات وعظ ہو، تذکرہ ہو، نصیحت ہو، ہدایت ہو، روح و دل کے روگوں کی شفا ہو، وہ منطقی شکلوں کا الجھاؤ اور مقدمات و مقدمات طلسموں کا کارخانہ نہیں ہو سکتی!

ایک مثال ضرورت ہے کہ مختصراً اس معاملہ کی توضیح کے لیے ایک دو مثالیں بھی دے دی جائیں: متکلمین نے جو طریقہ الٰہیات میں اثبات مدعا کا اختیار کیا تھا، اُس میں سب سے زیادہ ان کا

اعتماد حدوث عالم کے اثبات پر تھا۔ یعنی عالم قدیم (مصطلحۂ فلسفہ) نہیں، پیدا شدہ ہے۔ حدوث عالم کے لیے سب سے زیادہ قوی استدلال حرکت اور تغیر کا استدلال سمجھا جاتا تھا۔ بچپنے میں ہم نے یہ شکل رٹی تھی: "العالم متغیر، وکل متغیر حادث، فالعالم حادث" (عالم متغیر ہے اور ہر چیز جو متغیر ہے، حادث ہے، پس عالم حادث ہے) چونکہ متکلمین کے دفاع میں اثبات مدعا کی یہی شکلیں لبسی ہوئی تھیں اس لیے انھوں نے قرآن کے استدلالات کو بھی کھینچ تان کر یہی جامہ پہنا دینا چاہا۔ قرآن حکیم نے جس طرح آیت زیر تدبر میں حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ایک "حجت" کا ذکر کیا ہے، اُسی طرح سورۂ انعام میں ایک دوسری "حجۃ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ وتلك حجتنا آتینٰھا ابراھیم علیٰ قومه، نرفع درجٰت من نشاء، ان ربك حکیم علیم[1] (انعام: ۸۳) یہ "حجت" کیا تھی؟ یہ "حجت" وہ تھی جس میں حضرت ابراہیم کے مشاہدۂ "ملکوت السمٰوٰت والارض" کے واردات کا ذکر ہے، فلما جن علیه اللیل، رای کوکب، قال ھذا ربی، فلما افل، قال احب الاٰفلین[2] (انعام: ۷۶) یعنی حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ، چاند اور سورج دیکھا اور جب ان میں سے ہر کوکب ڈوب گیا تو فرمایا: "انی لا احب الاٰفلین" چونکہ اس معاملے کو قرآن نے "حجت" کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، متکلین نے "حجۃ" مستعملہ قرآن کو وہی حجت قرار دے لیا تھا جو ان کی مصطلحۂ منطق "حجۃ" تھی، اس لیے انھوں نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اپنے منطقی استدلال کی شکل یہاں بھی چپکا دی، مطلب یہ قرار دیا تھا کہ حضرت ابراہیم نے حدوث عالم پر حرکت و تغیر سے استدلال کیا ہے۔ یعنی ان کی حجۃ بھی یہی تھی کہ "العالم متغیر وکل متغیر حادث" انھوں نے کواکب کے صانع عالم نہ ہونے پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اُن میں حرکت ہے۔ حرکت تغیر کو کہتے ہیں اور جس میں تغیر ہو وہ محدث ہے اور جو محدث ہے، وُہ قدیم نہیں اور جو قدیم نہیں، وہ صانع عالم نہیں ہو سکتا۔ اس تفسیر پر ہمارے متکلمین کو اس درجہ وثوق بلکہ فخر ہے کہ حضرت امام رازی تغیر سے استدلال حدوث کو "طریق ابراہیمی" قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"پہلا حکیم ربانی جس نے اس حکمت سے مخلوق کو آشنا کیا، وہ حضرت ابراہیم خلیلؑ ہیں۔"

افول کے معنی

ابھی اس سے قطع نظر کیجیے کہ اس استدلال کی کمزوریوں کا کیا حال ہے، اور اس کا صغریٰ اور کبریٰ ہی کون سا قطعی اور مسلّم ہے کہ نتیجہ قطعی الثبوت ہو۔ اس پر بھی بحث نہ کیجیے کہ اس طرح کا استدلال انبیاء کرام کی طرف منسوب کرنا طریق دعوت نبوت سے کس درجہ ناآشنائی اور حقیقت فراموشی ہے۔ صرف اس بات پر

---

[1] یہ ہماری حجت تھی، جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی۔ ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اس علم و دلیل کا عرفان دے کر) بلند کر دیتے ہیں۔ [2] پھر دیکھو جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی اندھیری چھا گئی تو اس نے آسمان پر ایک ستارہ چمکتا ہوا دیکھا۔ اس نے کہا یہ میرا پروردگار ہے (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں)، لیکن جب ڈوب گیا تو کہا نہیں میں انھیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔

غور کیجیے کہ لغت و عربیت کے لحاظ سے اس تفسیر کا کیا حال ہے؟ آیت کریمہ میں کوکب، چاند اور سورج کا ذکر ہے، اور تینوں کے لیے "افل" کا لفظ آیا ہے۔ متکلمین کی یہ تفسیر "افول" کے معنی حرکت و تغیر قرار دیتی ہے اور جب تک یہ معنی قرار نہ دیے جائیں، ان کے گڑھے ہوئے استدلال کی دیوار کھڑی نہیں ہو سکتی، لیکن جزم و قطع کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عربی لغت میں کسی ایسے "افول" کا وجود ہی نہیں جو حرکت و تغیر کے معنی میں بولا جاتا ہو۔ جو "افول" عربی زبان میں مستعمل ہے، اس کے معنی تو کسی چیز کے چھپ جانے اور غائب ہو جانے کے ہیں۔ قد أفلت الشمس تأفل و تأفل افولا۔ ای غابت و احتجبت۔ اس کے سوا کوئی معنی اس لفظ کے مفہوم میں داخل نہیں۔ آیت کا صاف مطلب ہے کہ جب چاند ڈوب گیا، سورج غروب ہو گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا "انی لا احب الآفلین" میں چھپ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، یہاں حرکت و تغیر کی مصیبت کہاں سے آ گئی؟

لغت اور قرآن پر اتہام

پھر قیامت پر قیامت یہ ہے کہ "حرکت" سے بھی ان کا مقصود حرکتِ لغوی نہیں بلکہ حرکت مصطلحہ فلسفہ ہے یعنی وہ حرکت جو ایک حالت سے دوسری حالت میں انتقال کو کہتے ہیں، خواہ مکان میں ہو یا زمان میں اور کم میں ہو یا کیف میں، مثلاً درخت کا نمو بھی حرکت ہے اور یہ حرکت فی الکم ہے اور کسی رنگ کا تغیر بھی حرکت ہے اور یہ حرکت فی الکیف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر "افول" کے مفہوم میں کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر حرکت کی دلالت پیدا بھی کر لی جائے تو لغت اور قرآن پر یہ کیسا صریح اتہام ہوگا کہ حرکت کا یہ فلسفیانہ مفہوم اُن کے سر تھوپا جائے؛

قوم ابراہیم کا عقیدہ

علاوہ بریں متکلمین اپنے ذوق تفلسف میں یہ حقیقت بھی بھول گئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خطاب جن لوگوں سے تھا، وہ کواکب کو صانع کائنات نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے لیے اس مزعومہ استدلال کی ضرورت ہوتی۔ ان لوگوں کا اعتقاد اجرام سماویہ خصوصاً چاند سورج کی نسبت وہی تھا، جو دنیا کی تمام مشرک عقول کا اپنے اپنے دیوتاؤں کی نسبت رہ چکا ہے اور اب ہے۔ یعنی یہ ایسی روحانی اور ملکوتی ہستیاں جنھیں دنیا کی تدبیر و تصرف میں دخل ہے اور اس لیے ان کی پرستش ضروری ہے۔ پس جب وہ کواکب کو صانع کائنات سمجھتے ہی نہ تھے تو ان کے محدث و مخلوق ہونے کے دلائل پر حضرت ابراہیم کیوں زور دیتے اور کیوں قرآن اسے "تلك حجتنا اتینها ابراهیم علیٰ قومه" سے تعبیر کرتا؛ ان کے علم میں تو کوئی ایسی بات آتی تھی جس سے کواکب کے تدبیر و تصرف عالم میں دخیل ہونے کا بطلان ثابت ہوتا، کیونکہ ان کے ہم وطنوں کی اصلی گمراہی یہی تھی۔

متکلمین کی خام خیالیاں

یہ محل مزید تشریح و اطناب کا متحمل نہیں، ورنہ یہی ایک تفسیر اس حقیقت کی توضیح کے لیے کافی تھی کہ متکلمین کے طریقے نے قرآن حکیم کے معارف و حقائق پر کیسے

توبرتو پردے ڈال دیے ہیں اور اُن کی ذہنیت معارف قرآنیہ کی رُوح سے کس درجہ مختلف بلکہ متضاد ہے۔ فی الحقیقت قرآن حکیم کا یہ مقام من جملہ اہم ترین دلائل قرآنیہ کے ہے، لیکن متکلمین نے ایک دور از کار اور تقریباً بے معنی منطقی استدلال کا جامہ پہنا کر اُس کی ساری دلآویزی اور خوبی غارت کر دی ہے، جو کسی طرح بھی اس پر راست نہیں آتا۔ لطف یہ ہے کہ یہ استدلال حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس جوش و سرگرمی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، گویا ان کے لیے ابراہیم خلیل کی جگہ امام الحرمین یا امام رازی بن جانا کوئی بڑی ہی فضیلت کی بات ہے۔

میں نے یہاں ارسطو کی جگہ امام الحرمین اور امام رازی اس لیے کہا کہ جو بات حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کی گئی ہے، وہ اتنا وزن بھی نہیں رکھتی، جس قدر عامۂ حکما کی عقلیات کا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے سچ کہا ہے کہ "متکلمین نے طریق قرآنی اس لیے ترک کیا کہ فلاسفہ و عقلیین کے ساتھ چل سکیں، مگر افسوس کہ یہ بھی نہ کر سکے۔ ان کی خام خیالیوں سے تو پھر حکما کی باتیں غنیمت ہیں"۔

"احد" اور "واحد"

یا مثلاً، قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے صفات کا ذکر کرتے ہُوئے "احد" اور "واحد" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "احد" اور "واحد" کے معنی اُس زبان میں جس میں قرآن نازل ہوا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ صفت، تعدد کی نفی کرتی ہے۔ یعنی وُہ ایک ہے، اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، کوئی عرب یا عربی دان انسان "احد" کا لفظ سن کر اس سے زاید کسی مفہوم کا تخیل ہی نہیں کر سکتا، لیکن متکلمین نے اس کے لیے فلسفیانہ معانی اور التزامات پیدا کر لیے اور بلا تکلف انہی معانی میں استعمال کرنے لگے۔ مثلاً وُہ کہتے ہیں، خدا نے اپنا وصف "احد" قرار دیا ہے۔ "احد" وہ ہے جو منقسم نہ ہو سکے۔ پس معلوم ہُوا کہ وُہ جسم نہیں کیونکہ اجسام قابلِ انقسام ہیں۔ ہمیں بھی اس کا شوق نہیں کہ خدا کی جسمیت ثابت کی جائے، لیکن یہ غلطی ہے کہ قرآن نے عربی کا لفظ "احد" اس مصطلحۂ متکلمین مفہوم میں استعمال نہیں کیا اور نہ اس انقسام و عدم انقسام کی دقیقہ سنجیوں سے اسے کوئی تعلق ہے۔

مثل الامثول

یا مثلاً، عربی کا ایک لفظ "مثل" ہے۔ "مثول" کے اصلی معنی کسی چیز کے نصب ہونے کے تھے۔ مصور صورت بنا دیتا ہے، اس لیے اُسے مثل کہنے لگے۔ مثل الشی۔ ای انتصب و تصور۔ سورہ مریم میں ہے: "فتمثل لها بشراً سویا" یعنی آدمی کی شکل میں نمایاں ہُوا، پھر اسی نسبت سے اس کا استعمال مشابہت کے معنوں میں بھی ہونے لگا۔ فلاں چیز فلاں چیز کے مثل ہے، یعنی اس جیسی ہے۔ "تاج محل کے مثل کوئی عمارت نہیں" یعنی اس جیسی کوئی عمارت نہیں۔ قرآن نے بھی جا بجا مثل کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

لیکن جب فلسفیانہ مصطلحات رائج ہو گئیں، تو "تمثیل" کا استعمال ایک خاص تعریف و حدود کے ساتھ ہونے لگا مثلاً مماثلت کے مفہوم میں منطقی اطلاق پیدا کر کے اسے مماثلۃ فی الجوہر، مماثلت فی الکیفیت، مماثلۃ فی الکمیۃ، مماثلۃ فی القدر و المساحۃ وغیرہ میں بے سگئے اور اس کے بعد "مثل" "مستعملۂ قرآن" سے بھی وہی استدلال کرنے لگے۔ مثلاً

"لیس کمثلہ شیٔ" میں "مثل" کو وہی "مثل" مصطلحہ قرار دیتے ہیں اور اس پر اپنی تمام فلسفہ آرائیوں کی عمارت اُستوار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: تمام اجسام متماثل ہیں اور جسم وہ ہے جو جواہر فرد سے مرکب ہو یا جس کی طرف اشارہ کیا جا اور جس کی مقدار ہو۔ پس جب خدا نے فرمایا "لیس کمثلہ شیٔ" تو اس سے ان تمام جسمی (مصطلحہ فلسفہ) مماثلتوں کی نفی ہو گئی جو جواہر ہیں یا اعراض ہیں ہو سکتی ہیں۔ فلو کان جسماً لکان له مثل، و اذا لم یکن جسماً، لزم نفی ملزو الجسم۔ یقیناً خدا کے مثل کوئی شے نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ "لیس کمثلہ شیٔ" میں قرآن نے عربی کا جو لفظ استعمال ک اور اس کا جو مطلب دو سو برس تک تمام عرب مخاطبین سمجھتے رہے، وہ کیا تھا؟ کیا وہ یہی مثلیت مصطلحۂ فلسفہ تھی؟ حاشا و ک عربی میں مثل کا لفظ ٹھیک انہی سیدھے سادھے معنوں میں بولا جاتا ہے، جن معنوں میں ہم آجکل اردو میں بولا کرتے ہیں مثلاً ایک شخص کہتا ہے "تاج محل آگرہ کے مثل کوئی عمارت موجود نہیں" تو اس سے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ مماثلت فی الجوہر یا مماثلۃ فی الکمیۃ، یا مماثلت فی الکیفیۃ، یا مماثلۃ فی القدر والمساحۃ، یا مماثلۃ فی ای معنی اصطلاحی فلسفی کی نفی کر رہا ہے، بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایسی خوشنمائی رکھنے والی کوئی دوسری عمارت موجود نہیں۔ قرآن نے بھی ٹھیک ٹھیک اسی سادہ اور لغوی معنی میں "مثل" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ فلسفیانہ دقیقہ سنجیاں یہاں کہاں سے آ گئیں؟

خلد اور خلود

یا مثلاً، عربی کا ایک لفظ "خلد" اور "خلود" ہے جس کے معنی لغت اور زبان میں طول عہد کے ہیں اور اسی نسبت سے وہ ہمیشگی کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشگی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے بول چال میں ہم کہتے ہیں "یہ آدمی ہمیشہ کلکتہ ہی میں رہے گا" اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ ابد تک رہے گا اور مستقبل میں کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جب وہ کلکتہ میں موجود نہ ہو، بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ یہیں ٹھہرا ہوا ہے اور عرصے تک یہیں ٹھہرے گا۔ قرآن نے بھی جا بجا اسی معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے، لیکن بعد کو جب فلسفیانہ بحثیں پیدا ہو گئیں تو "خلود" کے معنی ایسی ہمیشگی کے ہو گئے جس کی کوئی نہایت نہ ہو۔

قدیم

یا مثلاً، عربی میں لفظ "قدیم" کے وہی معنی ہیں، جو اردو میں "پرانے" کے ہیں۔ "یہ مکان بہت قدیم ہے" یعنی بہت مدت سے ہے لیکن متکلمین کے فلسفیانہ مباحث میں "قدم" و "حدوث" کی خاص منطقی تعریف بنالی گئی۔ اب کتاب وسنت کا مستعملہ "قدیم" بھی اسی معنی میں لیا جانے لگا!

افسوس ہے، محل اس کا متحمل نہیں کہ مثالوں کے بیان میں اطناب سے کام لیا جائے ورنہ آپ دیکھتے کہ تفسیر قرآن کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جو اس غیر قرآنی طریق تفسیر سے متاثر نہ ہو چکا ہو اور اصلیت پر بے شمار پردے پڑ گئے ہوں۔ اگر آپ صرف امام راغب اصفہانی کی مفردات ہی اٹھا کر دیکھ لیں جو آج کل کے نئے محققین قرآن میں سے اکثر کا توشۂ علم تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نہ صرف قرآن کے مطالب و دلائل کی صورت بدل دی گئی ہے، بلکہ اس کے تمام الفاظ کے لیے بھی ایک نیا فلسفیانہ قاموس ترتیب دے دیا گیا ہے اور وہ چیز جسے اپنے "عربی مبین" ہونے پر ناز تھا

اب ایک مشکل ترین علمی چیستاں بن کے رہ گئی ہے!

اب جب کہ یہ تمہیدی مطالب ایک حد تک واضح ہو گئے ہیں، آیۂ زیرِ تدبر کی تفسیر نہایت سہل ہے۔ چند سطروں کے اندر تمام مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ البتہ تفسیر سے پہلے چند مبادیات کی مختصراً تشریح اب بھی ضروری ہے۔

امام رازی کا طریقہ

۱۔ اس آیت میں قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عہد کے ایک انسان کا مکالمہ نقل کیا ہے۔ سب سے پہلی اور بنیادی غلطی جس کی وجہ سے تمام مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں، یہ ہے کہ مکالمہ کی نوعیت ہی غلط سمجھ لی گئی ہے۔ آیت میں "حاج" کا لفظ آیا ہے، الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ، یعنی کیا تمھیں اس آدمی کا حال معلوم نہیں جس نے ابراہیم سے پروردگارِ عالم کے بارے میں حجت کی تھی؟ چونکہ مفسرین متکلمین کے دماغ میں منطقی طریقِ مناظرہ و حجت بسا ہوا تھا اور انبیاء کرام کے حجج و براہین فطریہ کو بھی وہی جامہ پہنانا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اس مکالمہ کو "مناظرہ" مصطلحۂ منطق قرار دے دیا۔ پھر لگے فنِ مناظرہ کے تمام اصول و آداب اس پر منطبق کرنے اور جب منطبق نہ ہو سکے تو لایعنی اور دُور از کار توجیہیں کرنے لگے۔ حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں سب سے پہلی بات جو کہتے ہیں، یہی ہے کہ "والقصہ الاولیٰ مناظرۃ ابراھیم صلی اللہ علیہ وسلم مع ملک زمانہ" (جلد ۲ : ۱۷۳) جونہی انھوں نے اس معاملہ کو "مناظرۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا، حقیقت سے الگ ہو گئے اور پہلا قدم ہی اُلٹا پڑ گیا۔ اب جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں، حقیقت سے زیادہ دُور ہوتے جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اُلجھاؤ پر الجھاؤ پڑتے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق "المسئلۃ الاولیٰ" اور "المسئلۃ الثانیہ" اور "الاشکال الاول" اور "الاشکال الثانی" کا سلسلہ یہاں بھی پُوری قوت اور وضاحت کے ساتھ جاری رکھا ہے، لیکن جب جواب کا موقع آیا ہے، تو پانچ پانچ اور چھ چھ وجوہ اشکال بیان کرنے کے بعد ایک شافی جواب بھی نہیں دے سکتے اور ایک ایسے طریقے سے جو پڑھنے والے کو حیرت و ارتیاب میں غرق کر دیتا ہے، رخصت ہو جاتے ہیں!

حافظ ابن کثیر

امام رازی کے بعد جس قدر مفسرین پیدا ہوئے، سب نے اس مکالمے پر اسی حیثیت سے نظر ڈالی البتہ حافظ عماد الدین ابن کثیر جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلامذہ میں سے ہیں، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ سلف کے طریقِ تفسیر سے آشنا ہو چکے تھے، اس لیے ان موشگافیوں میں نہیں پڑے۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا "وھذا التنزیل علی ھذا المعنی احسن لما ذکرہ کثیر من المنطقیین" (حاشیہ فتح البیان جلد ۲ : ۱۵۶) یعنی یہ مطلب اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو بہت سے منطقیوں نے قرار دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ منطقیوں کے طریقے سے الگ رہ کر بھی وہ پُوری طرح ان کی لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکے، یعنی اس الجھاؤ سے وہ بھی نہ نکل سکے جو حضرت ابراہیم کے ایک دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار کرنے کے معاملے میں پڑ گیا تھا۔

یہ بات معلوم کرنے کے لیے کہ متاخرین کی پیدا کی ہوئی مشکلات سے متقدمین کس طرح محفوظ تھے، امام ابن جریر طبری کی تفسیر پر نظر ڈالیے جو محدثین کے صاف اور سادہ طریق پر روایات جمع کر دیتے ہیں۔ انھوں نے سرے سے یہ فتنہ انگیز لفظ "مناظرہ" استعمال ہی نہیں کیا۔ وہ "حاج ابراھیم فی ربہ" کا ترجمہ "الذی خاصم ابراھیم فی ربہٖ" کرتے ہیں جو فی الحقیقت اس محل کے لیے خود قرآن کا تلایا ہوا لفظ ہے، پھر سیدھا سادھا مطلب بیان کر کے خاموش ہو جاتے ہیں

حضرت ابراہیمؑ اور ایک بادشاہ کا مکالمہ

(۳)

ئے اختلاف

یہ واضح رہے کہ ہمیں یہاں مناظرہ کے لغوی اطلاق سے اختلاف نہیں، بلکہ اصطلاحی اور وضعی اطلاق سے اختلاف ہے۔ وضعی علوم کی اصطلاح میں "مناظرہ" ایک خاص فن ہے جس میں مباحثے کے ل و آداب وضع کیے گئے ہیں اور اس کا مقصود اسکات خصم ہے، یعنی جھگڑنے والوں کو چپ کرا دینا، نہ یہ کہ اس کے وک دُور کر دینا۔ نہ صرف یہ کہ انبیائے کرام کا طریق بیان یہ نہیں ہوتا، بلکہ قرآن بتلاتا ہے کہ کسی طالبِ حق کا بھی طریقہ یہ ں ہونا چاہیے کیونکہ یہ طلبِ حق اور علم حقیقت کی راہ نہیں، "جدل" اور "خصومت" کی راہ ہے۔ اب غور کیجیے یہ کیسی یبت ہے کہ جس طریق بحث و کلام کو قرآن مذموم ٹھہراتا ہے، اسی کو ہمارے مفسرین متفلسفین محمود و مطلوب قرار تے ہیں اور قرآن کے تمام دلائل اور انبیاء کرام کے تمام مکالمات و مخاطبات کو اُسی شکل و صورت میں آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ ر ذہن کی اس کجی اور فکر کے اس مرض کو علم و معرفت کی ایک ایسی عظمت سمجھتے ہیں، جسے ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سے نکلوا دینا، ان کی بزرگی کی بڑی ہی دلیل اور اُن کے مرتبۂ نبوت و خلت کی بڑی ہی خوبروئی ہے!

رآن کے بالکل برعکس

اس سے بھی بڑھ کر اعجب العجائب معاملہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس مقام پر جس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے، وہ یہی ہے کہ انبیائے کرام کا طریق دعوت "ہدایت" کا طریقہ ہوتا ہے، ل" و "خصومت" کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت خلیلؑ نے باوجود اس کے کہ ایک الدّ الخصام کج بحثی کرنے لگا تھا، سر رشتۂ یت ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مجادلانہ نزاع کی جگہ طریق ہدایت سے اسے اعتراف حق پر مجبور کر دیا۔ لیکن متکلمین ہیں کہ عین ی مقام کو مجادلانہ انداز استدلال کی شکل دے رہے ہیں اور بڑی کوہ کندنیوں اور کاہ برآوردنیوں کے بعد ثابت دینا چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت یہ نہیں، بالکل اس سے الٹی ہے، یعنی طریق، طریق جدل و مناظرہ ہے، نہ کہ شاد الی الحق اور ہدایت الی المقصود!

افسوسناک طریق فکر و نظر

تفسیر کبیر کا یہ پُورا مقام پڑھ جائیے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت خلیلؑ اور نمرود کا مکالمہ مناظرہ دن کی ایک اچھی خاصی مجلس مناظرہ ہے۔ ایک طرف نمرود بیٹھا ہے جو یک پختہ کار فلسفی کی طرح شفا اور اشارات کے تمام مباحث رٹ چکا ہے۔ دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں اور امام ازی اور قاضی عضد کے علم کلام کا ایک ایک لفظ نوکِ زبان رکھتے ہیں۔ نمرود ایک سوال کرتا ہے۔ یہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ وہ ان کے جواب کا توڑ کرتا ہے اور نئے مقدموں میں اُلجھانا چاہتا ہے۔ یہ ایک شاطر مناظر کی طرح فوراً پیترا بدلتے ہیں

اور اُنھی مقدمات کے داؤ سے اُسے گرا دینا چاہتے ہیں۔ وُہ سبب اور واسطہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔ یہ حرکت افلاک کو پیچ کس دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ نبوت نہ ہُوئی، میر زاہد اور سیالکوٹی کا مباحثہ ہو گیا۔ حاشا و کلا کہ انبیاے کرام جو نذارت اور تعلیم کتاب و حکمت کے لیے آتے ہیں۔ یہ مجادلانہ اندازِ سخن اور مخاصمانہ طریق مخاطبت رکھتے ہوں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریق تفسیر تسلیم کر لیا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرلینا پڑے گا کہ دنیا کے سارے نبیوں اور رسولوں کی سب سے بڑی بڑائی یہ تھی کہ وہ منطقی اور متکلم ہوں، لیکن اگر یہی معیارِ نبوت ہے، تو دنیا کا سب سے بڑا نبی ارسطو تھا، جس نے سب سے پہلے منطق کے اصول و قواعد سے دنیا کو آشنا کیا، نہ کہ ابراہیم خلیل اور محمد بن عبداللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام، جن کا لکھنے پڑھنے کے طریقے سے آشنا ہونا بھی ثابت نہیں!

فساد کی جڑ

۲ — اب غور کیجیے۔ اس مکالمہ کو "مناظرہ" قرار دے کر کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو مشکلات کے حوالے کر دیا ہے؟ اگر یہ "مناظرہ" ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی بڑی فضیلت یہی ہے کہ مناظرین کی طرح مخاطب کو سخن پروری میں ہرا دیں تو ضروری ہے کہ مناظرہ کے جو اصول و آداب وضع کیے گئے ہیں، انھیں کسی نہ کسی طرح اس مکالمے پر منطبق کیا جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ منطبق نہیں ہوتے کیونکہ سرے سے یہ مناظرہ مصطلحہ قوم تھا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشکلات کا کوئی تشفی بخش حل نظر نہیں آتا۔ فن مناظرۂ دنعیہ کے لحاظ سے پہلی چیز فریقین کی حیثیت کا تعین ہے، یعنی ان میں کون مدعی ہے، کون منکر — کون مثبت ہے، کون منفی — پھر استدلال کے واجبات ہیں اور مجیب کے فرائض ہیں۔ جو مدعی ہو، اسے دلیل پیش کرنی چاہیے۔ جو منکر ہو اسے توڑ کرنا چاہیے۔ چونکہ مقصود اس تمام کارخانے سے اسکاتِ خصم ہے یعنی مخاطب کو چُپ کرا دینا، اس لیے تمام اصول و آداب اسی محور کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ امام رازی نے جب اسے مناظرہ قرار دیا تو ضروری ہُوا کہ پُوری بات اُسی سانچے میں ڈھال کر دکھا دی جائے۔ بات اس سانچے میں ڈھلتی نہیں۔ بس ساری مشکلیں اسی سے پیدا ہو گئی ہیں۔

آپ خود اپنے استفسار میں لکھتے ہیں:

"یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ ہے، جس میں نمرود کی حیثیت خدائی کے مدعی کی ہے اور حضرت ابراہیم اس کے زعم باطل کا بطلان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ جو آپ نے "دراصل مناظرہ ہے" کہہ دیا، بس یہی تمام فساد کی جڑ ہے۔ "مناظرہ ہے، تو حضرت ابراہیمؑ کی حیثیت ایک مناظر کی ہے۔" اگر وہ مناظر ہیں، تو چاہیے کہ اُن قواعد کلام سے سرمو تجاوز نہ کریں جو فن مناظرہ کے ساختہ پرداختہ ہیں یا مثلاً رشیدیہ میں درج ہیں۔ اور چاہیے کہ بدبخت نمرود بھی انھی مقدمات اور مبادیات کے مطابق سرگرم ضلالت و شقاوت ہو، جو ہم شرح مواقف وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں!"

متکلمین کی بوالعجبیاں

امام رازی اور متکلمین کے اصول تفسیر یہی ہیں، اور آپ بھی انھی کے قدم بقدم چلنا چاہتے

ل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ "مناظر" مصطلحۂ قوم کیوں ہوں؟ اور اگر وہ مناظر ہوں تو کیوں ان تمام گڑھے ہوئے قاعدوں کے پابند ہوں جو علوم وضعیہ کی تدوین کے بعد ہم نے اپنے اوپر لازم کر رکھے ہیں؟ کون سی عقل کی قطعیت اور وحی کی تنزیل دیتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بھی اُن قواعد کلام کی پابندی کرنی چاہیے جو مناظرہ رشیدیہ میں ہم رٹ چکے ہیں یا جنھیں بحر العلوم نے حواشی میں لکھا ہے؟ "مناظر کے لیے یہ جائز نہیں" اور "مستدل کے لیے یہ ضروری ہے" سوال یہ ہے کہ کیوں جائز ، کیوں ضروری ہے؟ اور کیوں ان کے اصول موضوعہ اور قواعد مصنوعہ "ما انزل اللہ بہا من سلطان" کے انبیاء و رسل ہوں؟ کیوں ان کے لیے جائز نہ ہو کہ سرمو ان سے تجاوز کریں؟ کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی زبان میں اُترتا ہے تمام قریش اس کی فصاحت کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں، لیکن چار سو برس کے بعد ہمارے مفسرین بحث کرتے ہیں بویہ اور کسائی کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ چار ہزار برس پہلے ایک داعی الی الحق الٰہی اور وجدان انسانی کے مطابق رشد و ہدایت کا دروازہ کھولتا ہے اور ایک منکر حق کو شک و انکار کی جگہ یقین و کی راہ دکھلا دیتا ہے، لیکن پانچویں صدی ہجری میں امام رازی آکر بحث کرتے ہیں کہ منطقی طریق مناظرہ کے مطابق یہ صحیح ہے یا نہیں؟ پھر چودھویں صدی میں آپ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مشکلات حل نہیں ہوتیں۔ مشکلات حل ہوں تو ہوں؟ جب صدیوں سے مشکلات ہی کو بلاوا دے دے کر سمیٹا گیا ہے اور اصلیت کی سادگی وضعیت اور صناعت کی اندیشیوں اور پیچیدگیوں کے اندر گم ہو گئی ہے؟

سری بنیادی غلطی

۳— ایک دوسری بنیادی غلطی جو یہاں الجھاؤ پیدا کر رہی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے مخاطب کی اعتقادی حیثیت ہے۔ مفسرین سے ایک سخت تسامح قرآن حکیم کے اُن مقامات کی یں ہوا ہے جہاں بابل کے اس پادشاہ کا (جسے نمرود کہتے ہیں) اور مصر کے فرعون کا (جو کچھ بھی اس کا نام ہو) ذکر کیا گیا ہے۔ حکیم نے اُن کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خدا کے اقرار سے منکر تھے، جس کی دعوت ت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے ان کے سامنے پیش کی تھی اور خود اپنی خداوندی اور خداوندی کی طاقتوں کا رکھتے تھے۔ چونکہ مفسرین کے پیش نظر صحیح تاریخی معلومات نہ تھیں، اس لیے وہ صحت کے ساتھ اس انکار اور ادعا کی بت متعین نہ کرسکے۔ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ دونوں پادشاہ اپنی خدائی کے اس معنی میں مدعی تھے کہ وہی صانع کائنات ہیں دونوں مقامات کے تمام مکالمات و مخاطبات میں فریق ثانی کی یہی اعتقادی حیثیت قرار دی گئی ہے اور اسی لیے ت ابراہیم اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) کے تمام دلائل و ارشادات اسی پہلو سے دیکھے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بات ت حال کے خلاف ہے، اس لیے اس کی وجہ سے طرح طرح کے نئے الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف کی تاریخی معلومات کی بنا پر، بلکہ خود قرآن حکیم کی تصریحات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں آج تک کسی بھی انسان نے ں معنی میں خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہی صانع کائنات ہے۔ ایسا دعویٰ کرنا، بلکہ ایسے ادعا کا تخیل کرنا فطرت

انسانی کے اس درجہ خلاف ہے کہ کوئی انسانی ہستی اس کی جرأت ہی نہیں کر سکتی۔

تحریر اندازہ سے زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے، اس لیے اس مقام کے دلائل و مباحث درج نہیں کیے جا سکتے حقیقت حال سمجھنے کے لیے حسب ذیل اشارات کافی ہوں گے:

خدائی کے دعوے کی حیثیت

اولاً، نوع انسانی نے خدا کی صفات کے تصور میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں من جملہ اُن کے ایک عالمگیر گمراہی، شاہی و الوہیت کا تشابہ ہے یعنی شاہی کے اختیارات نے بھی مافوق الفطرت اختیارات کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جب کبھی کوئی انسان اپنی غیر معمولی جسمانی قوتوں سے مخالفوں کو زیر کر کے پادشاہ بن جاتا، لوگ خیال کرتے، وہ دیوتاؤں کا انسانی مظہر ہے، بلکہ خود بھی دیوتا ہے۔ پھر جب شاہیت نے نسل و خاندان کے سلسلے کی صورت اختیار کر لی، تو کسی انسان کا شاہی نسل سے ہونا، اس کے دیوتائی رشتوں کی دلیل سمجھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس خیال نے پوری طرح ایک عام عقیدہ کی نوعیت پیدا کر لی کہ بادشاہ انسان نہیں انسانیت سے بلند تر ہستی ہے۔ اُس کی طاقت بھی الٰہی طاقت، اور اُس کا حکم بھی حکم خداوندی ہے۔

قرآن حکیم نے بابل اور مصر کے جن دو پادشاہوں کا حال بیان کیا ہے، اُن کی اور ان کی قوم کی گمراہی یہی تھی۔ وہ اپنی قوم میں ایک دیوتا کی طرح مانے جاتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان دو انسانوں نے خصوصیت سے اس کا دعویٰ کیا تھا، اس لیے کہ وہ پادشاہ تھے اور پادشاہ کے لیے ایسا ہی اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔

ثانیاً، اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مفسرین کا یہ سمجھنا کہ فرعون اور نمرود نامی دو انسان خدائی کے مدعی تھے، صحیح نہیں۔ جس طرح کی خدائی کے یہ مدعی تھے، اُسی طرح کی خدائی کا اعتقاد اُس عہد کے بے شمار پادشاہوں اور پادشاہی کے سلسلوں کے لیے رہ چکا ہے۔ ہندوستان میں بھی پادشاہ کے لیے ایسا ہی اعتقاد موجود تھا۔ حتیٰ کہ ان کا سلسلۂ نسب چاند سورج سے ملا دیا گیا تھا۔ تاتاریوں کی ابتدائی تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ بنو اسرائیل نے جب فلسطین اور شام پر قبضہ کیا تو جو قومیں وہاں آباد تھیں، ان کا بھی اپنے پادشاہوں کی نسبت ایسا ہی خیال تھا۔ خود قرآن اور تورات نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصری زندگی کے جو واقعات بیان کیے ہیں، اُن کا تعلق بھی ایک پادشاہ سے نہیں، دو پادشاہوں سے ہے جو یکے بعد دیگرے تخت نشیں ہوئے تھے۔ ایک فرعون وہ ہے جس کے محل میں حضرت موسیٰ پیدا ہوئے، دوسرا وہ ہے جو اُن کا تعاقب کرتا ہوا خلیج سویز میں غرق ہوا۔

گمراہی کے کامل نمونے

اگر فرعون کے ادعاء الوہیت سے مقصود یہ ہوتا کہ وہ کسی ایک انسان کا شخصی ادعا تھا تو ظاہر ہے، بغیر کسی امتیاز کے دونوں کی نسبت ایک ہی طرح کی ادعائی ذہنیت قرآن کیوں ظاہر کرتا؟ دراصل قرآن نے اسی لیے ان کے ناموں کی جگہ اُن کا لقب "فرعون" استعمال کیا، کیونکہ کسی ایک پادشاہ کا تمرد و طغیان دکھلانا مقصود نہیں تھا، تمام فراعنہ کا طغیان دکھلانا مقصود تھا۔

بہرحال قرآن حکیم نے ان دونوں پادشاہوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ انسانی گمراہی کی ایک خاص حالت کا نمونہ دکھلا دے۔ اس نوع کی گمراہی کے لیے یہ کامل قسم کے نمونے تھے۔ اس لیے انھی کو بطور مثال کے چُن لیا گیا۔

باقی رہے فرعونوں کے وہ متکبرانہ اور مدعیانہ اقوال جو قرآن حکیم نے نقل کیے ہیں، تو ان میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو خدا یعنی صانع کائنات سمجھتے تھے۔ چونکہ مفسرین نے یہی مطلب ٹھہرا لیا تھا، اس لیے ان کی نظر آیات کے صاف صاف مطلب کی طرف نہیں گئی۔ دوسری وادیوں میں پہنچ گئے، لیکن یہ محل تفصیل کا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا معاصر پادشاہ

ثالثاً، آیت زیرِ تدبر میں جس پادشاہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی شخصیت بھی صحیح طور پر متعین نہیں کی گئی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ نمرود تھا، لیکن بابل اور نینوی کے آثار قدیمہ سے جس قدر معلومات فراہم ہو چکی ہیں، اُن سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔ "نمرود" سے مقصود وہ پادشاہ ہے، جس کے خاندان نے سب سے پہلے بابل پر حکمرانی کی تھی۔ اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور شخص "آور" پنجم تھا جس کے سوانح حیات کی منقش اینٹیں جرمن وفد کی کوششوں سے ۱۹۰۴ء میں برآمد ہوئی ہیں۔ ان اینٹوں کی عبارت سے جو خط مسماری میں کندہ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ نمرود اور اُس کے خاندان کا زمانہ دو ہزار سات سو برس قبل مسیح تھا، اگر تورات کے سنین تسلیم کر لیے جائیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ دو ہزار تین سو برس قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے حضرت ابراہیمؑ کا ظہور نمرود سے کئی سو برس بعد ہوا ہے۔ ان کے زمانے میں نہ صرف نمرود کی، بلکہ اس کے خاندان کی بھی حکومت باقی نہیں رہی تھی۔

خاندان نمرود کے دو سو برس بعد بابل میں ایک نیا سلسلۂ شاہی قائم ہوا جسے "ایلامی" خاندان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خاندان کا ایک پادشاہ دو ہزار تین سو برس قبل مسیح بابل میں حکمران تھا جس کا نام "کا دولا اومر" تھا۔ غالباً یہی پادشاہ حضرت ابراہیمؑ کا معاصر تھا، اور اسی سے ان کا یہ مکالمہ ہوا ہے۔ بابل کے آثار میں اس پادشاہ کی تصویریں اور بعض فرامین کی اینٹیں بھی ملی ہیں۔ ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت خودسر اور جبار تھا۔ اس کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ آسمانی دیوتاؤں کا قہر و جبروت اس کے اندر مجسم ہو گیا ہے۔ یہ اوصاف ٹھیک اس متکبرانہ انداز سخن کے مطابق ہیں جو اس مکالمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عربوں میں شاہان روم، قیصر، شاہان ایران کسریٰ، اور شاہان مصر فرعون کہے جاتے تھے، اسی طرح بابل کے پادشاہوں کے لیے "نمرود" کا لفظ بطور لقب کے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ لقب بے اصل بھی نہ تھا، کیونکہ جس طرح روم میں سیزر اور ایران میں خسرو پادشاہوں کا نام رہ چکا تھا، اسی طرح بابل کے پہلے فرمانروا کا نام نمرود تھا۔ پس ابتدا میں جب لوگوں نے یہ کہا ہو گا کہ مکالمہ نمرود سے ہوا، تو اُن کا مقصد یہ ہو گا کہ بابل کے ایک پادشاہ سے ہوا۔ یہ مطلب نہ ہو گا کہ نمرود نامی انسان سے ہوا تھا۔

اہلِ بابل کا عقیدہ

رابعاً: یونانی مورخوں کے بیانات اور علم الآثار کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بابل کواکب پرست تھے۔ اسی کواکب پرستی نے انھیں علم ہیئت کے علمی مبادیات سے آشنا کیا تھا۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ اجرام سماویہ کائنات کی ایسی ملکوتی ہستیاں ہیں، جنھیں تدبیر و تصرف عالم کی تمام قوتیں حاصل ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انھی کے عمل و تصرف سے ہوتا ہے۔ ان میں سات ستارے بڑے دیوتا ہیں اور سورج ان سب میں بڑا ہے۔ آج کل علم نجوم کے نام سے جو خرافات دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ ہندوستان اور بابل ہی کی کواکب پرستی کا بقایا ہیں۔ اپنے پادشاہوں کی نسبت ان کا بھی وہی اعتقاد تھا، جو اُس عہد کی تمام قوموں کا رہ چکا ہے۔ یعنی وُہ سُورج دیوتا کے زندہ مظہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تقدیس بھی اسی طرح کی جاتی تھی، جیسی تمام دیوتاؤں کی کی جاتی تھی۔

بادشاہ کا مبہوت ہوجانا

۴۔۔۔ مکالمہ کے آخر میں ہے: " فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ " یعنی جب حضرت ابراہیمؑ نے دُوسری دلیل پیش کی تو مجادل کچھ نہ کہہ سکا، ہکا بکا ہوکر رہ گیا۔ مفسرین نے اس مکالمے کو منطقی مناظرہ بنا دیا تھا۔ مناظرہ اور جدل کا ماحصل یہ ہے کہ مخاطب کو لاجواب کر دیا جائے، اس لیے انھوں نے " فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ " کا مطلب یہ قرار دیا کہ حضرت ابراہیم کی دوسری دلیل کے جواب میں وُہ کوئی بات نہ بنا سکا۔ اس لیے مبہوت ہوکر رہ گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابراہیم کی بات کا وُہ کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا اور شوخ چشمی اور کج بحثی کی جگہ اس پر حیرانگی کی حالت طاری ہو گئی تھی، لیکن یہ حیرانی محض اس بات کا نتیجہ نہ تھی کہ وہ سخن پروری میں لاجواب ہو گیا تھا۔ کیونکہ ابھی تفصیل کے ساتھ آپ سن چکے ہیں کہ انبیاء کرام کی مخاطبت بات میں لاجواب کر دینے کے لیے نہیں ہوتی۔ یقین و ایمان کے لیے ہوتی ہے۔ پس اس کے مبہوت ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ حضرت ابراہیم کی دوسری بات اُس کے دل میں اُتر گئی۔ پہلی بات پر تو اس نے مجادلانہ کج بحثی کر کے جواب دے دیا تھا کیونکہ اپنے جہل و ضلالت کی وجہ سے اس کی حقیقت سمجھ نہ سکا تھا، لیکن دوسری بات اس کی فکری اور اعتقادی استعداد کے مطابق کچھ ایسی دل کو لگتی ہوئی تھی کہ سُنتے ہی متاثر ہو گیا اور تیر نشانہ پر لگ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ یعنی وُہ سچائی جسے اپنی کورچشمی کی وجہ سے اب تک نہیں دیکھ سکا تھا، اب یکایک اس کے سامنے چمک اُٹھی اور باوجود تمرد اور ضلالت کے اُس میں جھٹلانے اور شوخ چشمی سے کج بحثی کرنے کی جُرأت باقی نہ رہی!

آیت کی تفسیر

اب آیت زیرِ تدبر پر غور کیجیے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا	اے پیغمبر! کیا تمھیں اس شخص کا حال نہیں معلوم جس نے محض اس وجہ سے کہ خدا نے اسے پادشاہت دے رکھی تھی، جہل و غرور میں سرشار ہو کر ابراہیم سے اس کے پروردگار کے

اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ۔ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ : فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ! فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ! (بقرہ: ۲۵۸)

بارے میں حجت کی، جب ابراہیم نے کہا : میرا پروردگار وُہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تو اس نے کہا : یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ میں جسے چاہوں زندگی بخش دوں۔ اس پر ابراہیم نے کہا : اچھا، اگر ایسا ہی ہے تو خدا ہمیشہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دکھاؤ۔ یہ سُن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر ہدایت کی راہ کبھی نہیں کھلتی !

اصل اُلجھاؤ | اس سب سے بڑا الجھاؤ جو اس آیت کی تفسیر میں پڑ گیا ہے، وُہ حضرت ابراہیم کا اندازِ سخن ہے۔ جب مخاطب نے ایک ایسی بات کے جواب میں جو اثبات مدعا کے لیے قطعی اور نہایت درجہ واضح تھی، جہل و غرور سے ایک نہایت لغو بات کہہ دی، تو حضرت ابراہیمؑ نے نہ تو اپنی بات کی مزید تشریح کی، نہ مخاطب کو اس کے جہل و نافہمی پر متنبہ کیا، بلکہ فوراً پہلی بات چھوڑ کر ایک دوسری بات کہہ دی: " فان اللہ یاتی بالشمس الخ" مفسرین نے طرح طرح کی توجیہیں کی ہیں، مگر سر رشتۂ تفسیر میں کچھ ایسی گرہ پڑ گئی ہے کہ کوئی ناخنِ تاویل بھی اسے نہیں کھول سکتا۔ بڑی تحقیق کی بات حضرت امام رازی نے ڈھونڈھ نکالی ہے، یہ ہے کہ یہ دو مختلف دلیلیں نہیں تھیں، ایک ہی دلیل کی مختلف مثالیں تھیں لیکن اوّل تو دونوں دلیلوں میں ربط و مناسبت پیدا کرنے کے لیے سبب و واسطہ اور حرکت افلاک کی بحثیں پیدا کی گئی ہیں اور اس قدر دور از کار اور بے معنی ہیں کہ انھیں تسلیم کرلینا قرآن کو قرآن کی جگہ کوئی دوسری چیز بنا دینا ہے۔ ثانیاً خود امام صاحب چار سطر پہلے معترض کی زبانی ہمیں سُنا چکے ہیں کہ رجوع خواہ دلیل سے کیا جائے خواہ مثال سے، لیکن مستدل کے لیے ضروری ہے معارض کے جواب کی غلطی ظاہر کردے، ورنہ اس کا عجز ثابت ہوجائے گا۔ پس اگر دلیل کو مثال بنانے کی یہ ساری مصیبت گوارا بھی کرلی جائے۔ جب بھی بات نہیں بنتی۔ اعتراض جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔

مناظر کا فرض | اصل یہ ہے کہ ساری مصیبت اسی لیے پیش آئی ہے کہ اس مکالمہ کو منطقی "مناظرہ" قرار دے دیا گیا ہے۔ مناظرہ کا مقصود انکشاف حق نہیں ہوتا۔ اسکاتِ خصم ہوتا ہے۔ اس لیے مناظر کا فرض ہوتا ہے ایک بات پیش کرکے اس پر اس طرح جم جائے کہ خواہ زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل جائیں، لیکن وُہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ اگر مخاطب کی سمجھ ساتھ نہیں دیتی تو ہزار مرتبہ نہ دے۔ اس کی بلا سے۔ وُہ اس کا جہل ثابت کردے گا اور مخاطب کا جہل ثابت کرکے اسے ذلیل اور لاجواب بنا دینا ہی اس کی بڑی سے بڑی جیت ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ جو بات مخاطب کے ذہن نشین کرنی تھی، وُہ اس کے دل میں اُتر سکی یا نہیں؟ تو مناظر کو نہ تو اس کی پرواہ ہوتی ہے، نہ فن مناظرہ کا یہ مقصود ہے۔ مناظر صرف یہ چاہتا ہے کہ مخاطب کو میدان سخن میں ہرا دے۔ یہ مقصود جس طرح بھی حاصل ہوجائے، اُس کی جیت ہے۔

ہمارے متکلمین کی نظر میں چونکہ انبیاء کرام کی بھی سب سے بڑی فضیلت یہی تھی کہ وہ مناظر اور منطقی ہوں، اس لیے اسی اعتبار سے اس مکالمہ پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور قدرتی طور پر چاہتے ہیں کہ ایک شاطر مناظر کی طرح حضرت ابراہیمؑ بھی اپنی بات پر اڑ جاتے اور خواہ ان کا مخاطب سمجھ سکتا یا نہ سمجھ سکتا، یہ اُسی پر لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اگر اس نے جہل و غرور سے ایک لغویات کہہ دی تھی، تو چاہیے تھا کہ اس کی لغویت اور جہالت پر ایک لمبی چوڑی تقریر فرماتے۔ پھر اگر وہ اس کے جواب میں بھی کوئی بکواس کر دیتا تو یہ اس کے جواب الجواب میں آستین چڑھا لیتے۔ یہاں تک کہ صرف اپنی دلیل کی شرح توضیح اور رد و جواب ہی میں تمام کر دیتے!

حضرت ابراہیمؑ کا مقام

لیکن ہمارے مفسرین بھول گئے۔ انھیں یاد نہیں رہا کہ ابراہیمؑ خلیل، داعی حق تھے۔ مناظر مجادل نہ تھے اور اسی ایک بنیادی فرق نے ان کی راہ مناظرہ و مجادلہ کی ساری راہوں سے الگ کر دی تھی۔ ان کا کام یہ نہ تھا کہ کسی خاص دلیل پر اڑ جائیں، یا مخاطب کے اظہار جہل و عجز کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں۔ اُن کا کام یہ تھا کہ برگشتہ دلوں کو سچائی کی راہ دکھلا دیں۔ وہ دلیلوں کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ حق اور ایمان کی حفاظت کے لیے لڑتے تھے۔ اس مکالمہ میں تو حضرت ابراہیمؑ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ایک بات چھوڑ کر دوسری بات کہہ دی، اور اسی پر ہمارے مفسرین چراغ پا ہو رہے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم نہیں، انبیاء کرام کا طریق دعوت تو یہ ہے کہ اگر نو سو ننانوے باتیں کہہ کر چھوڑ دینی پڑیں، اور ہزارویں بات سے مخاطب کے اندر فہم و بصیرت پیدا ہو سکے، تو انھیں ایسا کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔ وہ ایک کے بعد ایک، سیکڑوں باتیں چھوڑتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھل جائے اور حقیقت اور سچائی کی جھلک دیکھ لے!

طبیب اور داعی

افسوس، قرآن کہاں لے جانا چاہتا ہے، اور دنیا نے اسے سر پر رکھ کر کدھر کا رُخ کیا! ہمارے مفسرین متکلمین ارسطو کی منطق اور یونانیوں کی دانش فروشیوں میں ایسے گم ہو گئے کہ انھیں دوسری راہوں کی خبر ہی نہ رہی۔ حالانکہ دنیا میں صرف مناظر اور منطقی ہی نہیں ہوتے۔ طبیب اور معالج بھی ہوتے ہیں۔ طبیب کا فرض کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ ہوتا ہے کہ مریض سے اُس کی جہالت اور نادانی کی ایک ایک بات پر لڑے اور مناظرہ کرے؟ نہیں، ہزار بار نہیں۔ اگر طبیب، طبیب صادق ہے، تو اس کی ساری قابلیت صرف اسی ایک نقطہ میں مرکوز رہے گی کہ کسی طرح مریض کو شفا حاصل ہو جائے، اور کسی طرح موت کی جگہ زندگی کا دروازہ اُس پر کھل جائے۔ بسا اوقات ہوگا کہ وہ مریض کے لیے ایک غذا تجویز کرے گا۔ اصول طب کے لحاظ سے غذا بہترین غذا ہوگی۔ لیکن طبیب بہتر نسخہ، بہتر غذا تجویز کر سکتا ہے، بہتر معدہ خلق نہیں کر دے سکتا۔ بہت ممکن ہے، مریض کا معدہ اتنا قوی نہ ہو کہ اس درجہ کی غذا کا متحمل ہو سکے۔ جونہی طبیب کو معلوم ہوگا کہ میری تجویز کی ہوئی غذا اسے پچ نہیں سکتی، وہ فوراً اُسے ترک کر دے گا، اور دوسری غذا تجویز کر دے گا۔ اگر یہ غذا بھی مریض ہضم نہ کر سکا، تو عجب نہیں کہ تیسری، بلکہ ہو سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں تک نوبت پہنچے۔

مریض غذا ہضم نہ ہو سکنے کی شکایت کرتا رہے گا۔ طبیب غذا بدلتا رہے گا۔ وُہ کبھی یہ نہیں کرے گا کہ ایک ہی غذا تجویز کرکے اس پر اڑ جائے اور خواہ بدبخت مریض ہضم کرسکے یا نہ کرسکے، یہ وہی لقمے اس کے حلق میں ٹھونستا رہے۔ اگر ایسا کرے گا تو یقیناً وُہ طبیب نہ ہوگا، نوعِ انسانی کا سب سے زیادہ جاہل فرد اور سب سے بڑا قاتل ہوگا!

انبیاء کرام کے اعمالِ دعوت کے لیے اگر انسانوں کے کسی عمل سے مشابہت پیدا کی جاسکتی ہے تو وُہ حکماء کی حکمت اور مناظرین کا مناظرہ نہیں، اطباء کا معالجہ ہے۔ طبیب جسم کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ انبیاء روح و دل کے روگ دور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا سلوک بھی اپنے مریضوں کے ساتھ ہمیشہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ایک طبیب کا ہونا چاہیے۔ وہ مریض سے مناظرہ کرنا نہیں چاہتے وہ بسا اوقات علم و یقین کی ایک دماغی غذا مریض کے سامنے رکھتے ہیں۔ غذا ہر طرح مفید اور بہتر سے بہتر ہوتی ہے۔ لیکن انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ جہل و ضلالت نے مریض کی فکری حالت اس درجہ خراب کر دی ہے کہ یہ غذا اس کا دماغ ہضم نہیں کرسکتا۔ یعنی اس کی سمجھ کی کجی اور دل کی گمراہی ساتھ نہیں دیتی۔ جونہی انھیں اس حالت کا احساس ہوتا ہے، ایک طبیب حاذق کی طرح فوراً غذا بدل دیتے ہیں، اور کوئی دوسری غذا جو اس کا معدۂ فکر ہضم کرسکے، سامنے رکھ دیتے ہیں۔ انھیں اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ پہلی غذا کیوں بدلنی پڑی! اس لیے کہ مقصود کسی خاص غذا کا کھلا دینا نہیں ہے، بلکہ ایسی غذا کا کھلانا ہے جو مریض ٹھیک طور پر ہضم کرسکے۔ ہضم کی استعداد کے لحاظ سے ہر مریض کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک مریض کے لیے دودھ سے زیادہ زود ہضم غذا کوئی نہ ہوگی لیکن یہی دودھ دوسرے مریض کے لیے ناقابل ہضم ہوگا۔ جو حال جسم کے لیے معدہ کا ہے وہی حال دماغ کے لیے فکر کا ہے۔ ذہن و فکر کا ایک بیمار ایسا ہوگا جو ایک خاص طرح کی دانائی قبول کرسکتا ہے، لیکن ایک دوسرے بیمار دل کے لیے وہی بات ناقابلِ فہم و تاثر ہوگی۔ انبیاء کرام علم و یقین کی بہتر سے بہتر دانائی رکھتے ہیں، لیکن دماغ و فکر پیدا نہیں کر دے سکتے۔ دُودھ کے بہتر غذا ہونے پر کون حرف لا سکتا ہے! لیکن اس کا کیا علاج کہ بدنصیب مریض نے اپنا معدہ کھو دیا ہے اور وہ دُودھ جیسی عمدہ اور زود ہضم غذا بھی ہضم نہیں کرسکتا؛ یہی معنی ہیں اس آیت کریمہ کے کہ، انك لا تهدى من احببت ولكن الله يهدى من يشاء الى صراطٍ مستقيم!(القصص: ۵۶) حالانکہ انبیاء کرام کے ہادی ہونے پر خود قرآن بار بار شہادتیں دے چکا ہے کہ، و انك لتهدى الى صراط مستقيم! (الشوریٰ: ۵۲) تو مطلب یہی ہے کہ پہلی قسم کی آیات میں استعداد اور قابلیت خلق کرنے کی نفی ہے، اور دوسری میں استعداد رکھنے والوں پر سچائی کی راہ کھول دینے کا اثبات ہے۔

بابل کا طبیبِ حق

کئی ہزار برس گزرے، اس بیمارستانِ ہستی میں ایک طبیب حق ابراہیم خلیل بھی تھے۔ ان کا سابقہ بابل کے ایک مریض سے پڑا۔ یہ پادشاہی کے گھمنڈ کا روگی اور جہل و طغیان کی بیماریوں سے بدحال تھا۔ انھوں نے اُس کے سامنے علم و بصیرت کی یہ غذا رکھی: "ربی الذی یحیی و یمیت" میرا تو اس پروردگار پر ایمان ہے جس کے قبضہ و تصرف میں ہماری موت و حیات ہے۔ یہ بہتر سے بہتر غذا تھی جو تسک

اور انکار کے کسی مریض کے لیے ہوسکتی ہے۔ لیکن مریض اپنے معدہ کی صلاحیت بالکل کھو چکا تھا۔ وہ اتنی ہلکی اور سادہ غذا بھی ہضم نہ کرسکا۔ جہل وطغیان کے ہیجان میں بول اٹھا: "انا احی و امیت" اگر تمھارے پروردگار کی یہی صفت ہے تو یہ بات تو مجھے بھی حاصل ہے۔ لاکھوں انسانوں کی جان میرے قبضۂ اختیار میں ہے۔ جسے چاہوں ہلاک کرڈالوں۔ جسے چاہوں زندگی بخش دوں۔ یہ جواب سن کر حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوگیا کہ غذا گو بہتر تھی، لیکن مریض کے معدے میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ اسے ہضم کرسکے۔ انھوں نے فوراً پہلی قاب ہٹالی اور ایک دوسری غذا پیش کردی: "فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق، فأت بها من المغرب!" اچھا، اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو، یہ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا ہے۔ یہ ہر روز پورب سے نکلتا ہے اور پچھم کی طرف ڈوب جاتا ہے۔ تم اسے ایک مرتبہ پچھم سے نکال دکھاؤ! یہ غذا ٹھیک اس کے معدہ کی استعداد کے مطابق تھی۔ حلق سے اُتری اور ہضم ہوگئی: "فبهت الذی کفر" اب اس میں کج بحثی کا دم خم نہ رہا۔ دم بخود ہوکر رہ گیا!

حقیقتِ حال

خدارا غور کیجیے۔ بات کتنی صاف اور دلآویز تھی، اور مفسرین نے اسے کس طرح مشکلوں اور پیچیدگیوں کا گورکھ دھندا بنادیا ہے؟ اگر حضرت ابراہیم کا طریق بیان مجادلانہ ہوتا۔ ہدایت کا نہ ہوتا تو وہ اپنی پہلی بات ہی پر مخاصم سے اُلجھ پڑتے۔ وہ کہتے، میرا مطلب جلانے مارنے سے یہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ اصل مدعا کی جگہ ایک خاص دلیل اور اس کے مفہوم کی بحث چھڑ جاتی اور مخاصم کے لیے حقیقت کے فہم و بصیرت کا موقع ہی نہیں آتا۔ لیکن ان کی راہ ہدایت و دعوت کی راہ تھی۔ انھوں نے ایک دقیقہ کے لیے بھی اپنی نظر اصل مدعا سے نہیں ہٹائی۔ جونہی معلوم ہوا کہ پہلی بات اپنے جہل وغرور کی وجہ سے وہ نہیں سمجھ سکا ہے تو بغیر کسی تامل کے اُسے چھوڑ دیا، ایک دوسری بات پیش کردی۔ یہ بات اس کی فکری استعداد کے ٹھیک مطابق تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تیر نشانہ پر لگ گیا۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کو ایک بات چھوڑنے کی جگہ ایک ہزار باتیں چھوڑنی پڑتیں، جب بھی انھیں اس میں تامل نہ ہوتا!

مکالمہ کی تفسیر

۳۔ میں نے سب سے پہلے مکالمہ کے اسی پہلو پر نظر ڈالی، کیونکہ بغیر اس کے اس کی حقیقی نوعیت واضح نہیں ہوسکتی تھی۔ اب آیات کی ترتیب بیان کے مطابق پورے مکالمہ کی تفسیر سمجھ لیجیے:

"ان اتٰه اللہ الملک" کی تفسیر اور اس کی ضمیر کے مرجع کے تعین میں مفسرین نے بیکار دماغ سوزی کی ہے۔ حالانکہ مطلب بالکل صاف تھا۔ یہ قرآن حکیم کا معجزانہ ایجاز بلاغت ہے کہ صرف ایک جملہ کہہ کر پوری نوعیت آشکارا کردی۔ جس انسان نے حضرت ابراہیم سے اُن کے رب کے بارے میں کج بحثی کی تھی، قرآن واضح کردینا چاہتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کون سی چیز تھی جس نے اس کے اندر گمراہی کا ایسا طغیان اور سرکشی کا ایسا ہیجان پیدا کردیا کہ پروردگارِ عالم کا نام سن کر بھی اپنے تکبر اور خود پرستی کے دعووں سے باز نہیں آیا؟ "ان اتاہ اللہ الملک" یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ بادشاہ تھا۔ یعنی یہ تاج و تخت کی بڑائی اور حکومت کے فانی اختیارات کا گھمنڈ تھا، جس نے اسے اس درجہ مغرور اور

پر خود غلط بنا دیا تھا۔ اس تصریح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن حکیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شخص شخصاً خدائی کا مدعی تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کیوں کہا جاتا کہ "ان اتاہ اللہ الملک" پس معلوم ہوا، یہ بادشاہت کا گھمنڈ تھا، اور بادشاہت کے گھمنڈ سے گمراہی کی ایسی ہی فکری حالت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

حجت ابراہیمیؑ

"حاج ابراھیم فی ربہ" سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے جب اس بادشاہ کو ظلم و استبداد اور فساد و طغیان پر سرزنش کی اور پروردگار عالم کے احکام سے سرکشی کرنے کے نتائج سے ڈرایا، تو وہ حضرت ابراہیمؑ سے کج بحثی کرنے لگا، یعنی اس خدا کے بارے میں کج بحثی کرنے لگا جس کی مدد و نصرت کے بھروسے پر وہ تن تنہا ایک جابر و قاہر بادشاہ کا مقابلہ کر رہے تھے اور ڈرنے کی جگہ ڈرا رہے تھے۔ چونکہ وہ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرنے کے سوا اور کسی طریق عبادت سے آشنا نہ تھا، اس لیے اس نے کہا: وہ تمہارا خدا کون ہے اور کہاں ہے جس کی مدد کے بھروسے پر میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہو اور مجھ جیسے طاقتور بادشاہ کو بے باکانہ سرزنش کرنے کی جرأت کرتے ہو؛ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں کہا: "ربی الذی یحیی و یمیت" تمہارے دیوتاؤں کی طرح میرا کوئی خاص دیوتا نہیں ہے۔ میرا ایمان تو اس پروردگار عالم پر ہے جس کے قبضہ و تصرف میں تمام مخلوقات کی موت و حیات ہے۔

حضرت ابراہیم کا یہ ارشاد کوئی فلسفیانہ استدلال نہ تھا۔ انھوں نے ایک ایسی سیدھی سادی بات کہہ دی تھی، جس کا فطری طور پر ہر انسان کے دماغ میں اذعان موجود ہے۔ بشرطیکہ اس نے اپنی خلقی بصیرت بالکل ضائع نہ کر دی ہو۔ ہر انسان وجدانی طور پر محسوس کرتا ہے کہ موت و حیات ایک ایسی چیز ہے جس کا اختیار صرف اسی ذات کے ہاتھ میں ہے جو اس تمام کارخانۂ ہستی کی خالق ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جو زندگی کا بخشنے والا اور پھر زندگی پر موت طاری کر دینے والا ہو۔ بات بالکل صاف اور واضح تھی۔ لیکن بابل کا متکبر بادشاہ جو اپنی پادشاہی کی طاقتوں کے نشہ میں چور تھا، حضرت ابراہیم کو زک دینے کے لیے اور ان کی دعوت ایمانی کی تحقیر کے لیے بول اٹھا: "انا احیی و امیت" واہ، یہ تمہارے خدا کی کون سی بڑی طاقت ہوئی کہ مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ یہ بات تو مجھے بھی حاصل ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی جان میرے قبضہ و تصرف میں ہے، میں بادشاہ ہوں، جسے چاہوں قتل کر ڈالوں، جسے چاہوں بخش دوں۔

سورج والی دلیل

بلاشبہ یہ جواب انتہا درجہ جہل و ضلالت کا جواب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کیا بات کہی تھی اور اس مغرور نے اس کا مطلب کیا سمجھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابراہیم کا طریق مخاطبت "ہدایت" کا طریقہ تھا۔ "جدل" کا نہ تھا، اس لیے اس کی جاہلانہ بات پر بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ وہ سمجھ گئے۔ غذا اگرچہ نہایت عمدہ غذا تھی، لیکن اس بیمار کا معدہ ہضم نہ کر سکا۔ اسے دوسری غذا دینی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً دوسری بات فرما دی، "فان اللہ یاتی بالشمس الخ" یہ بات سن کر اس متمرد کی کج بحثی ختم ہو گئی اور اچانک حقیقت کی جھلک سامنے آ گئی۔ موت اور حیات والی بات اگرچہ ایک حق پسند انسان کے لیے نہایت واضح بات تھی، لیکن اس مغرور و جاہل کی فکری

حالت شدت طغیان وغفلت سے اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ کج بحثی کی ایک راہ نکال ہی لی، لیکن یہ دوسری بات اُس کی فطری حالت کے مطابق اس درجہ اوقع فی النفس تھی، کہ حقیقت کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا اور وہ ہر روز کی طرح آج بھی مشرق ہی سے نکلتا ہوا دکھائی دیا تھا اور مغرب ہی کی طرف غروب ہونے کے لیے ڈھل رہا تھا۔ صدیوں سے، ہزاروں برس سے، ہمیشہ سے، ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس کی مقررہ رفتار میں طلوع و غروب کی جہتوں میں فرق پڑا ہو۔ پھر کیا دنیا کا کوئی حکمراں، دنیا کا کوئی شہنشاہ، دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ایسی ہے جو ایک دن کے لیے اُس کا رُخ بدل دے؟ ایک دن کے لیے نہیں، ایک گھنٹہ کے لیے، ایک دقیقہ کے لیے، اس کی رفتار میں اپنی مرضی سے فرق ڈال دے؟ یہ حقیقت تھی جو اُس جاہل و مغرور کے سامنے نمایاں ہو گئی۔ اگرچہ اس کی غفلت و شقاوت اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ وہ اب بھی سر جھکانے کے لیے طیار نہیں تھا، لیکن حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد شوخ چشمی سے کج بحثی کرنے کا دم خم بھی نہیں رہا تھا "فبهت الذی کفر" اور چونکہ باوجود حقیقت کے نمایاں ہو جانے کے وہ اعتراف حق پر آمادہ نہیں ہوا، اس لیے فرمایا: "والله لا یهدی القوم الظلمین" خدا کا قانونِ ہدایت یہی ہے کہ جن لوگوں نے ظلم و طغیان کی راہ اختیار کر لی ہے، ان پر ہدایت و سعادت کی راہ نہیں کھلتی!

منطقی شبہات

۴ — ہمارے مفسرین کو صرف اسی کی فکر نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو منطقی اور مناظر ثابت کر دکھائیں، بلکہ وہ نمرود کے لیے بھی بہت متفکر ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ اُس کی کوئی بات بھی فلسفیانہ دقیقہ سنجی سے خالی نہ جائے۔ چنانچہ اس کے اس قول کی توجیہ میں کہ "انا احی و امیت" حضرت امام رازی نے بڑی بڑی کاوشیں کی ہیں۔ لیکن اب آپ سمجھ گئے ہوں کہ یہ تمام کاوشیں قطعاً دور از کار اور بے معنی ہیں۔ قرآن حکیم اس جاہل متمرد کا جہل و غرور دکھا رہا ہے۔ ہمارے متکلمین کی طرح اُسے فیلسوف ثابت کرنا نہیں چاہتا۔ یہ تمام توجیہیں بھی کہ اس نے ایک واجب القتل قیدی کو چھوڑ دیا تھا اور ایک کو قتل کر دیا تھا، قطعاً غیر ضروری اور مکالمہ کی حقیقت سے دُور لے جانے والی ہیں۔ "انا احی و امیت" کا صاف مطلب وہی ہے جو ایک مغرور اور برخود غلط بادشاہ کا ہمیشہ ایسے متکبرانہ دعووں سے ہُوا کرتا ہے۔

"بُہت" کا مطلب

اب آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ جس قدر شبہات پیدا ہُوئے تھے، فی الحقیقت ان میں سے کسی شبہ کی یہاں گنجایش نہیں۔ بڑے شبہات امام صاحب اور آپ کے پیدا کیے ہُوئے یہ تھے کہ نمرود اگر مدعی تھا تو دلیل اسے پیش کرنی تھی نہ کہ حضرت خلیل کو اور جب حضرت خلیل نے ایک دلیل پیش کر دی تو اس سے رجوع کیوں کیا؟ لیکن یہ تمام شبہات غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ جب واضح ہو جاتا ہے کہ نہ تو یہ مناظرہ مصطلح فن تھا، نہ مخاصم کی حیثیت مدعی کی تھی، اور نہ انبیاء کرام مناظرانہ طریقہ سے رد و کد کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ شبہ کہ جب

تم نے پہلی بات کے جواب میں ایک جاہلانہ دعویٰ کر دیا تھا، تو دوسری بات کے جواب میں بھی کوئی نہ کوئی بات کہہ سکتا تھا، تو اس شبہ کی بھی اب کوئی گنجایش نہیں رہی۔ یہ شبہ اس لیے پیدا ہوا تھا کہ "فبہت الذی کفر" کے مناظرہ میں لاجواب ہوجانے کے سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب واضح ہوگیا کہ "بہت" سے یہاں مقصود بات بنانے لاجواب ہوجانا نہیں بلکہ ایک سچی بات سے متاثر ہوکر ہکا بکا رہ جانا ہے، تو ظاہر ہے، یہ شبہ کیوں وارد ہو؟ ایک حقیقت جس کے جھٹلانے اور نہ دیکھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا، اس کے سامنے بے نقاب ہوگئی، تو اس میں شیخی کا دم خم باقی نہ رہا۔ لاچار اور دم بخود ہوکر رہ گیا۔

باب ۲۴

حضرت ابراہیمؑ کی بُت شکنی

اصل واقعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا واقعہ سورۂ انبیاء کی آیت ۵۱ سے آیت ۶۷ تک بیان کیا گیا ہے۔ مفسروں نے عام طور پر یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین موقعوں پر ایسی بات کہی جس پر بظاہر جھوٹ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اس میں سے ایک موقع یہ ہے جب اُن سے پوچھا گیا: ءَ انت فعلت هذا؟ کیا تُو نے بتوں کو توڑا ہے؟ تو انھوں نے کہا: "بل فعله کبیرهم هذا" بلکہ اس بڑے بُت نے ایسا کیا۔ فی الحقیقت فعل خود انہی کا تھا۔

اس بارے میں استدلال صحاح کی روایت سے کیا جاتا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں خود اسی مقام پر تدبر کرنا چاہیے کہ کیا فی الحقیقت یہاں کوئی ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا ثابت ہوتا ہو، خواہ وہ جھُوٹ کسی درجہ اور کسی نوعیت کا ہو۔

ناقابل توجیہ بوالعجبی

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ تفسیر قرآن کی بوالعجبیوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ناقابل توجیہ بوالعجبی نہیں۔ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں، جس سے اس اصدق الصادقین کا جھُوٹ بولنا نکلتا ہو۔ لیکن بہ تکلف ایک آیت کو توڑ مروڑ کر ایسا بنایا جارہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جھُوٹ بولنے کی بات بن جائے اور اثباتِ کذب کی یہ مبارک کوشش کیوں کی جارہی ہے؟ صرف اس لیے کہ ایک مزعومہ حدیث موجود ہے پس کہیں یہ قیامت نہ ٹوٹ پڑے کہ اس کے غیر معصوم راویوں کی روایت کمزور مان لینی پڑے۔ گویا اصل اس باب میں غیر معصوم راویوں کا تحفظ ہے، نہ کہ معصوم رسولوں کا اور اگر قرآن میں اور کسی روایت میں اختلاف واقع ہوجائے تو قرآن کو روایت کے مطابق بننا پڑے گا۔ راوی کی شہادت اپنی جگہ سے کبھی نہیں ٹل سکتی!

اب غور کرو یہاں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ خود قرآن کے صاف صاف لفظوں میں کیا ہے؛

شہر "اور" کی بُت پرستی

سرزمین دجلہ و فرات میں نینوی اور بابل سے پہلے جو شہر آباد ہُوئے، ان میں ایک شہر اُوْر تھا۔ یہ جنوبی عراق میں فرات کے کنارے آباد تھا اور محل وقوع وُہ مقام ہے جو آج کل "تل العبید" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کی تنقیب و تحقیق کا سلسلہ ابھی جاری ہے، لیکن جس قدر آثار و کتبات روشنی میں آچکے ہیں، ان سے باشندگان شہر کے عقاید و اعمال کے بہت سے گوشے واضح ہوچکے ہیں۔ یہاں بُت پرستی کی وہ ساری بنیادیں استوار ہوچکی تھیں جو آگے چل کر نینوی اور بابل میں زیادہ وسیع اور منظم شکل اختیار کرگئیں۔ پرستش کا مبدء کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت "شمس" کا تھا، یعنی سورج کا۔ اس کے نیچے بہت

بت مختلف طاقتوں یا مختلف قبیلوں اور آبادیوں کے تھے۔ خود شہر اُر کا محافظ خدا "نانغار" تھا یعنی چاند۔ "تل العبید" کے ٹیلے میں جس مندر کے آثار ہیں، یقین کیا جاتا ہے کہ وہ "نانغار" کا مندر تھا۔

مندر کے خاص پجاریوں اور محافظوں کا ممتاز گروہ بھی پیدا ہو چکا تھا اور انھیں دینی ریاست پیشگی (PRIEST HOOD) کی نوعیت حاصل ہو گئی تھی۔

آزر نام نہیں لقب تھا

حضرت ابراہیمؑ کا ظہور اسی شہر میں ہُوا۔ ان کے والد تارخ کا بچپنے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ چچا نے پرورش کی تھی اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا، اس لیے "آوار" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ "آوار" قدیم کالڈی زبان میں بڑے پجاری یا محافظ معبد کو کہا کرتے تھے۔ یہی "آوار" ہے جس نے بعد کی عربی میں "آزر" کی شکل اختیار کر لی اور اسی لیے قرآن نے اس کا ذکر "آزر" کے نام سے کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا گھرانا

حضرت ابراہیمؑ نے جب آنکھ کھولی تو خود اپنے گھر میں بت پرستی پائی، لیکن اللہ نے سچائی کی حجتوں اور دلیلوں کی وحی سے ان کا قلب سلیم اس طرح معمور کر دیا تھا کہ نہ تو قوم و وطن کی جہالت و گمراہی اسے چھو سکی، نہ خود اپنے عزیزوں اور بزرگوں کا اعتقادِ راسخ اُسے متاثر کر سکا۔ انھوں نے اپنے گھرانے میں تبلیغ کی، پھر تمام قوم کو پیامِ حق پہنچایا۔

دعوت و تبلیغ حق

انھوں نے پہلے شرک و بُت پرستی کے خلاف عقلِ سلیم کی حجتیں اور وجدانِ صادق کی شہادتیں پیش کیں: وتلك حُجّتنا اتینٰها ابراهیم علٰی قومه نرفع درجٰت من نشاء، ان ربّك حکیمٌ علیم (انعام: ۸۳)[۱] لیکن پھر دیکھا کہ آبا و اجداد کی تقلید کی ظلمت اس طرح دلوں پر چھا گئی ہے کہ عقل و بینش کی کوئی روشنی بھی انھیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہر حجت و آیت کا جواب ان کی زبانوں سے یہی نکلتا ہے کہ وجدنا اٰباءنا لها عابدین (الانبیاء: ۵۳)[۲] نیز انھوں نے دیکھا، ایک عرصے کے تعامل و توارث نے لوگوں کی عقلیں یکسر مفلوج کر دی ہیں۔ بتوں کے روحانی اقتدار و تصرف کا عقیدہ ان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ الوہیت و قدوسیت کی یہ متخیل روحانیتیں جو طرح طرح کے روایتی معجزوں اور الہامی اچنبھوں کا سرچشمہ چلی آتی ہیں، محض بے اختیار مورتیاں ہو جائیں اور جو حقیقت ہمارے آباؤ اجداد اور ان کے آباؤ اجداد نہ پا سکے، وہ کل کا ایک نوجوان لڑکا پالے۔ چنانچہ وہ ان کی دعوت و تبلیغ کا تمسخر اُڑاتے اور کہتے: اجئتنا بالحق، ام انت من اللّٰعبین؟

---

[۱] یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اسے علم و دلیل کا عرفان دے کر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت دینے والا، علم عطا کرنے والا ہے۔ [۲] ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا انھیں کی پُوجا کرتے تھے۔

(الانبیاء: ۵۵) یعنی فی الحقیقت تمھارا ایسا ہی عقیدہ ہے یا ہم سے ہنسی تمسخر کر رہے ہو؟ یعنی بتوں کی عظمت اور ان کے روحانی اقتدار و تصرف کی ہیبت دلوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے خلاف کسی کا بے دھڑک زبان کھولنا ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سنتے تو متعجب ہو کر کہتے: تمھارے ہوش و حواس کہاں گئے؟ تم سنجیدگی سے ایک بات کہہ رہے ہو یا ہم سے مزاح کر رہے ہو؟

جہل و کوری کی انتہا

جب ابنائے قوم کے جہل و کوری کی یہ حالت دکھائی دی تو حضرت ابراہیمؑ نے محسوس کیا کہ حجتوں اور دلیلوں کی روشنی ایسے لوگوں کے لیے بالکل بیکار ہے۔ ان کے دلوں میں بتوں کے اقتدار و تصرف کا وہم اعتقاد بن کر جم گیا ہے۔ جب تک اس پر چوٹ نہیں لگے گی، ان کی آنکھیں کھلنے والی نہیں۔ پس ضرور دلیلوں اور موعظتوں کی روشنی سے نہیں بلکہ خود اپنی اندھی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ صدیوں کی گڑھی ہوئی عظمتیں او نسلوں کی مانی ہوئی معبودیتیں بے اختیار مورتیوں اور بے جان پتھروں سے زیادہ کچھ نہیں اور انسانوں کی کسی بڑی تعداد کا کسی بڑی مدت تک ایک بات مان لینا اور کیے جانا سچائی کا ثبوت نہیں۔ سچائی کا ثبوت صرف عقل سلیم کی حجت ہے

قیام حجت کا عملی طریقہ

یہ طریقہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ انھوں نے تمام لوگوں کو کھلا کھلا چیلنج دے دیا تاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین (الانبیاء: ۵۷) یعنی اگر عقل کی کوئی بھی دلیل تمھارے لیے سود مند نہیں۔ تم اپنے اس وہم باطل پر جمے ہوئے ہو کہ یہ مورتیاں طاقت و تصرف رکھتی ہیں تو اچھا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ جونہی تم آج اپنے بڑے میلے میں گئے، میں تمھارے ان بتوں کے ساتھ ایک داؤ کھیلوں گا۔ اگر فی الحقیقت ان میں طاقت و تصرف ہے تو وہ کوئی معجزہ دکھا کر اپنے کو بچالیں یا میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیں۔

جب ایک جماعت تقلید و وہم پرستی میں اس درجہ ڈوب جائے کہ عقل و بصیرت کی کوئی بھی بات اس کے دل میں نہ اتر سکے تو پھر اقناع فکر کی صرف یہی ایک راہ رہ جاتی ہے کہ ان کی عقل کی جگہ ان کے حواس کو مخاطب کیا جائے اور کوئی ایسی بات کر کے دکھادی جائے جس سے ان کی ساری وہم پرستیوں کا بطلان ہو جائے۔ مثلاً ایک بچہ چڑیا کو دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ تم ہزار اسے سمجھاؤ کہ چڑیا کاٹتی نہیں، لیکن وہ ماننے والا نہیں۔ اب ایک دانشمند آدمی کیا کرے گا؟ یہ کرے گا کہ دلیلوں کی جگہ مشاہدہ سے کام لے گا۔ وہ اپنی انگلی چڑیا کی چونچ میں ڈال دے گا۔ پھر نکال کر بچہ کو دکھا دے گا کہ دیکھو اس نے کاٹا ہے یا نہیں۔ یہ ایک مشاہدہ بچے کے اندر جس درجہ یقین پیدا کر دے گا، وہ ایک سو آدمیوں کی ایک سو دلیلوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی حال عقول ذا ۔ ند کا ہے۔ تم ان کی عقل و فکر سے کچھ نہیں پا سکتے، لیکن تم انھیں کے مشاہدے کے ذریعے سے عاجز کر دے سکتے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے بالآخر یہی طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کہا، جس حقیقت کو تم عقل و فکر سے نہیں پا سکے، میں تمھارے مشاہدے میں لا کر خود تمھاری زبانوں سے اُگلواؤں گا۔ تمھا

دل میں یہ بات جمی ہُوئی ہے کہ ان میں طاقت و تصرف ہے۔ اچھا میں ان پر ہاتھ اٹھاتا ہُوں۔ اب اگر سچ مچ کو ان میں اختیار و تصرف ہے تو یہ اپنے سارے معجزے لے کر نمودار ہو جائیں اور مجھے اس سے روک دیں یا مجھ پر کوئی آسمانی عذاب اتار دیں۔

لوگوں نے ان کا یہ اعلان سُنا، لیکن چونکہ دلوں میں بتوں کی عظمت و تقدیس رچی ہُوئی تھی، اس لیے قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ وُہ سمجھے، یہ ایک مجنونانہ بڑ ہے۔ بھلا کون ہے جو ان قادر و توانا معبودوں کی جناب میں ایسی جُرأت کر سکتا ہے؟ اور اگر کرے تو اُسے اس کی مہلت ہی کب ملے گی؟ نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے؟

پھر چیلنج، پھر عمل لیکن حضرت ابراہیمؑ اپنے فیصلے کا اعلان کر چکے تھے اور اسے کر کے دکھا دینا تھا۔ جُونہی معبد خالی ہُوا، انھوں نے ایک ایک کر کے تمام بُت توڑ دیے۔ صرف بڑے بُت یعنی "شمس" کو چھوڑ دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ "لعلھم الیہ یرجعون" اگر یہ باقی رہے گا تو شاید اس کی طرف لوگ رجوع کریں۔ یعنی یہ سوال اٹھایا جا سکے کہ اس کے سامنے بتوں پر آفت آئی اور خود یہ بھی کہ رب الارباب تھا، کچھ نہ کر سکا۔ اب اس سے بتوں کی کہانی سُن لی جائے!

پجاریوں کی حیرانی اور تجاہل جب لوگ (میلے سے) واپس آئے اور انھوں نے دیکھا، جو بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی تھی۔ وہ وقوع میں آ گئی اور سچ مچ کو ابراہیمؑ نے سارے بُت پاش پاش کر دیے تو غور کرو، ان کے دل و دماغ کا کیا حال ہُوا ہوگا؟ اور ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیے؟ پہلے حیرت چھائی ہوگی کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا؟ کیا یہ مقدس مُورتیاں اس طرح توڑ پھوڑ ڈالی جا سکتی تھیں؟ پھر حضرت ابراہیمؑ کی ساری باتیں سامنے آ گئی ہوں گی۔ صاف نظر آ گیا ہوگا کہ اس بارے میں سچا وہی نکلا، ہم جھُوٹے ثابت ہوئے۔ پھر اپنی شکست کے خیال نے غم و غصہ کی شکل اختیار کر لی ہوگی۔ فتح مند آدمی اتنا غضبناک نہیں ہوتا، جتنا شکست خوردہ ہو جاتا ہے، خصوصاً جبکہ یہ شکست سخت ذلت و ندامت کی شکست ہو۔ اب پجاریوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ معاملے کی شناعت عامۃ الناس سے پوشیدہ رکھی جائے۔ اگر انھیں معلوم ہو گیا کہ ابراہیمؑ نے پہلے چیلنج دے دیا تھا، پھر کر کے دکھا دیا تو اُن کے عقیدے فوراً متزلزل ہو جائیں گے۔ پس دکھاوے کے لیے پجاریوں نے ایسا انداز اختیار کر لیا، گویا ابراہیمؑ والی بات کی اُنھیں خبر ہی نہیں۔ آپس میں پُوچھنے لگے، یہ شرارت کس نے کی ہے؟ جس کسی نے کی ہے، وُہ بڑا مجرم ہے۔ وُہ دیوتاؤں کے سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس پر بعض دکھاوے کے لیے بول اُٹھے: سمعنا فتی یذکرھم، یقال لہ ابراھیم (الانبیاء: ۶۰) ہمارے سننے میں آیا ہے، ایک نوجوان ان مورتیوں کے بارے میں کچھ باتیں کہتا تھا۔ غالباً اسی نے کیا ہو۔ اُسے ابراہیمؑ کہہ کر پکارتے ہیں۔ غور کرو، کہنے والا اب بھی یہ نہیں کہتا کہ اس نے مورتیوں کے خلاف ایک داؤ کھیلنے کی دھمکی دی تھی بلکہ صرف یذکرھم کہہ کے چُپ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوشش

یہ ہے کہ اصل معاملہ عوام سے چھپایا جائے ، جو اس حادثۂ عظیم کی خبر سُن کر وہاں جمع ہو گئے تھے اور جس کا پتا فاتوا به
علی اعین الناس (الانبیاء : ٦١) سے لگتا ہے۔ یعنی پجاریوں نے کہا، ابراہیمؑ کو یہاں لوگوں کے سامنے لاؤ۔ پھر جا
حضرت ابراہیمؑ بلائے گئے۔ وہ اب تمام مجمع کے سامنے کھڑے ہیں۔ مجمع میں پجاری اور عوام دونوں ہیں۔ پجاریوں کو سب
کچھ معلوم ہے، عوام کو تفصیلات معلوم نہیں۔

پجاریوں سے مکالمہ

اب وقت آگیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے انکشافِ حقیقت کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اُس کا نتیجہ آشکارا ہو جائے اور جس حقیقت کے اعتراف سے لوگوں کو انکار تھا، وہ خود اُنہی کے حلقوں سے اگلوائی جائے اور دیکھو کیسے صاف اور قدرتی طریقے سے حضرت ابراہیمؑ اپنی اس عملی اور قولی حجت کی سلطا کا اعتراف کرتے ہیں؟ پجاریوں نے دکھاوے کے لیے بے خبر بن کر پوچھا: ءانت فعلت هٰذا بالٰهتنا یا ابراهیم! (الانبیاء) کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ تُو نے یہ حرکت کی ہے؟ اب اگر حضرت ابراہیمؑ ان کے جواب میں کہتے: میں تمھیں پہلے کہہ چکا تھا کہ ایسا کروں گا۔ اس میں پوچھنے کی بات کیا ہے؟ تو انھیں رد و کد کرنے کا موقع مل جاتا۔ مثلاً عوام کے سامنے انکار کر دیتے کہ تم نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا اور اس طرح اصل مسئلے کی جگہ ایک دوسری بات میں سوال و جواب ہونے لگتا۔ پس انھوں نے جواب میں حجت الزامی کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ رد و کد کے سارے دروازے بند ہو گئے اور حقیقت آشکارا ہو گئی: بل فعله کبیرهم هٰذا ، فاسئلوهم ان کانوا ینطقون (الانبیاء : ٦٣) بلکہ اس سب سے بڑے بُت "شمس" نے سب کچھ کیا ہے جس کے آگے تم ہمیشہ اپنے سوالات پیش کرتے رہتے ہو، پھر کہتے ہو کہ اس کی پُراسرار صدائیں تمھیں (یعنی تم پجاریوں کو) سُنائی دیتی ہیں: "یہ ابھی زندہ و سلامت موجود ہے۔ اگر فی الحقیقت مورتیاں سوالوں کا جواب دیا کرتی ہیں تو اسی مورتی سے پوچھ لو۔ مجھ سے کیوں سوال کرتے ہو؟

اعتراف کی مجبوری

یہ جواب سُنتے ہی سب پر سناٹا چھا گیا۔ کیونکہ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نہ تو یہ کہہ سکتے تھے کہ مُورتی سے امید جواب نہیں، نہ مورتی سے سوال ہی کر سکتے تھے۔ ادھر عوام نتیجے کے منتظر تھے۔ فرجعُوا الی انفسهم - "انفسهم" یعنی پجاریوں کی جماعت عوام سے الگ ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگی اور چونکہ اب حضرت ابراہیمؑ کا تیر ٹھیک نشانے پر لگ چکا تھا، اس لیے انھیں اقرار کرنا پڑا: فقالوا انکم انتم الظٰلمون (الانبیاء : ٦٤) بلاشبہ حق سے نافرمانی کرنے والے ہم ہی ہیں۔ ٹھیک بات تو وہی ہے جو ابراہیمؑ کہہ رہا ہے بالآخر مجبور ہوئے کہ جو بات حضرت ابراہیمؑ ان سے کہلوانی چاہتے تھے، وہ سر جھکا کر دبی زبان سے کہہ دیں: لقد علمت ما هٰؤلاء ینطقون (الانبیاء : ٦٥) "لقد علمت" یعنی یہ حقیقت تو تجھے معلوم ہی ہو چکی ہے کہ مورتیوں کی صدائیں اور مندر کے ہاتف غیبی کے جوابوں کا معاملہ وہ نہیں ہے، جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مورتیاں بولا نہیں کرتیں۔ پھر تیرا یہ کہنا کہ بڑے بُت سے پوچھ کر فیصلہ کرو، کیا معنی رکھتا ہے؟ تب حضرت ابراہیمؑ نے تمام مجمع سے مخاطب ہو کر

ے حق بلند کردی : اتعبدون من دون الله مالا ینفعکم شیئًا وّلا یضرّکم ؛ اُفٍّ لکم ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون ؟ (الانبیاء : ۶۶) جب ان مورتیوں کے نطق والہام کے سارے قصّے من گڑھت ہیں اور ان کے ز و درماندگی کا یہ حال ہے، جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، تو پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش پر لگ گئے ہو؟ کیا اتنی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے ؟

ان کانوا ینطقون

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کالڈیا میں پجاریوں کی خاص جماعت پیدا ہو چکی تھی اور بُت پرستی کی تاریخ میں اصل کارفرما جماعت ہمیشہ یہی رہی ہے۔ یہ لوگ عوام ے الگ ہو جاتے تھے۔ پھر عوام کو اپنے قبضہ و اقتدار میں رکھنے کے لیے مندروں کی معجزانہ قوتیں برابر بڑھاتے رہتے تھے۔ نہ مختلف طریقے کام میں لاکر لوگوں کو یقین دلاتے کہ مورتیاں بولتی ہیں۔ سوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ نذرانے قبول کرتی ہیں۔ ہر طرح کے عجائب و خوارق شب و روز ان سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا اصل خطاب انھی پجاریوں سے تھا۔ وُہ گھر کے بھیدی تھے، کیونکہ خود ان کا چچا مندر کے پجاریوں میں سے تھا اور اس طرح وہاں کے تمام حالات سے باخبر ہونے کا پُورا موقع اُنھیں حاصل ہوگیا تھا۔ اُنھوں نے چاہا، عوام کے سامنے حقیقت حال کا اعتراف پجاریوں سے کرائیں اور انھوں نے اعتراف کراکے چھوڑا۔ پس ان کے اس قول کا کہ "ان کانوا ینطقون" یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ اگر مورتیوں کی پُراسرار نداؤں کی وُہ بات ٹھیک ہے، جس کا تم عوام کو یقین دلاتے رہتے ہو تو اس بڑے بت سے ندائے حق کا مطالبہ کرو۔ اگر یہ ہمیشہ تمھارے سوالوں کا جواب دیتا ہے تو آج کیوں نہ دے؟ اور ایسے موقع پر کیوں نہ دے جب تمام مندر تہ و بالا ہوگیا ہے؟ یعنی یہ مطلب نہیں کہ اگر بُت عام طور پر نطق و کلام کرتے ہیں تو ان سے بات کرالو۔ کیونکہ بتوں کا آدمیوں کی طرح بات نہ کرنا تو عام طور پر مسلّم تھا۔ کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا تھا کہ یہ ہماری طرح بولتے چالتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات عوام کے دلوں میں قطعاً اُتر گئی ہوگی۔ ہر شخص بول اٹھا ہوگا کہ بات ٹھیک کہہ رہا ہے کسی مورتی سے اس حادثہ میں کیوں نہ رجُوع کیا جائے؟

لیکن حضرت ابراہیمؑ نے مجمع عام میں بُت پرستی کے خلاف وعظ شروع کر دیا تو پجاری ڈرے اور انھوں نے چاہا، عوام کے بُت پرستانہ جذبات بھڑکا کر اپنا کام نکال لیں۔ اُنھوں نے کہا: احرقوہ وانصروا اٰلهتکم ان کنتم فٰعلین (الانبیاء: ۶۸)[*] اُسے زندہ آگ میں جلا دو کیونکہ تمام قدیم قوموں میں دستور تھا کہ مذہبی اور سیاسی

---

* اس آیت میں مزے کا ٹکڑا ہے وانصروا اٰلهتکم یعنی اپنے معبودوں کی مدد کرو، یعنی جو معبود اپنے پجاریوں کی امداد کے بغیر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے، اور کسی کا کیا بنا اور بگاڑ سکتے ہیں؟

مجرموں کو زندہ جلا دینے کی سزا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کالڈیا میں آخری زمانے تک یہی دستور رہا۔ کتاب دانیال سے معلوم ہوتا ہے کہ کالڈیوں نے ان یہودیوں کو زندہ جلا دینا چاہا تھا، جنھوں نے بادشاہ کی معبودیت سے انکار کیا

فرض الباطل مع الخصم کذب نہیں

اب غور کرو اس تمام سرگزشت میں کون سی ایسی بات ہے جس سے ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو؟ بتوں کو انھوں نے کچھ چوری چھپے نہیں توڑا تھا کہ خلاف واقعہ بات کہہ کے اسے چھپانا چاہتے۔ تمام پجاریوں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا تھا اعلان بھی اس تاکید کے ساتھ کہ "تا اللہ لاکیدن اصنامکم" خدا کی قسم! میں ضرور تمھارے بتوں کو اپنے داؤں کا نشانہ بناؤں گا۔ پھر جو بات اس طرح صاف صاف کہہ دی گئی ہو اور علانیہ کی گئی ہو، اُس میں جھوٹ بولنے کی بات کہاں نکل آئی؟ باقی رہا اُن کا یہ کہنا کہ بل فعلہ کبیرھم ھٰذا تو ظاہر ہے کہ ایک لمحے کے لیے اس سے مقصود انکار نہیں ہو سکتا، کیونکہ فعل کا تو وہ پہلے سے اعلان کر چکے تھے اور خود پوچھنے والوں میں ایک ایک فرد جانتا تھا کہ انھی کا کیا دھرا ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ محض حجت الزامی تھی اور حجت الزامی کا وہ طریقہ جسے ہمارے مناظر فرض الباطل مع الخصم حتی تلزمہ الحجۃ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صدق و کذب کا سوال یہاں کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟

اثبات کذب کے لیے ایک غلط توجیہہ

چونکہ ہمارے مفسروں کے سامنے ایک روایت موجود تھی اس کی تعمیل میں ضروری سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح کذب کی بات بن جائے۔ اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ جو بات قرآن میں نہیں، وہ محذوف بنا کر بڑھا دی جائے۔ چنانچہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے قول تا اللہ لاکیدن اصنامکم کو سلسلہ بیان سے الگ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بات اُنھوں نے مخاطبوں سے نہیں کہی تھی، اپنے جی میں کہی تھی۔ یعنی اُن کا اعلان نہ تھا۔ جی ہی جی میں ایک بات سوچی تھی، لیکن یہ محض رائے سے قرآن کے مطالب میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جی میں کہا تھا۔ وہ (قرآن) تو صاف صاف کہہ رہا ہے کہ موقع مخاطبے اور مکالمے کا تھا اور جب پجاریوں نے بات کہی کہ اجئتنا بالحق ام انت من اللّٰعبین؟ تو اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اعلان کیا۔ علاوہ اس کے اس طرح کے محذوفات جبھی تسلیم کیے جا سکتے ہیں، جبکہ کوئی قطعی قرینہ موجود ہو۔ یہاں بجز اس ضرورت کے کہ حضرت ابراہیمؑ کو کذب گو بنایا جائے اور کون سی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ یہ محذوف گڑھ لیا گیا؟

روایتِ صحیحین

باقی رہی صحیحین کی روایت کہ لم یکذب ابراھیم فی شیئ قط الاثلاث کلھن فی اللہ تو اگرچہ اس کی توجیہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھول لی ہیں مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے بھی دُہرایا ہے، یعنی ہمارے لیے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی، بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ

پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کریں! اگر ایک راوی کی جگہ سیکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے تو بہر حال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی، لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کر لیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہو گئی!

صحت اور عصمت

بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے، لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی بھی مسلمان نے راویانِ حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا، نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کیلیے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے، وہ اس کی "صحت" ہے "عصمت" نہیں اور "صحت" سے مقصود صحتِ مصطلحۂ فن ہے، نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحت قرآن۔ پس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں لیکن بہر حال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے مفید حجت ہو سکتا ہے، مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی تو یقینات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

نبوت اور سچائی

نبی کا جو سب سے بڑا وصف قرآن نے تبلایا ہے، وہ اس کی سچائی ہے اور احتیاج تفصیل نہیں۔ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا، مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ کسی شکل میں اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی اگر نہیں تو نبوت بھی نہیں۔ پس انبیائے کرام کی سچائی اور عصمت یقینیات دینیہ و نقلیہ میں سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لیے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ قول اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

صحیحین کے باب میں افراط و تفریط

اصل یہ ہے کہ ہر گوشے کی طرح اس گوشے میں بھی متاخرین افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں اور اس کی وجہ سے عجیب عجیب الجھاؤ پیش آ رہے ہیں۔ ایک طرف فقہاء حنفیہ ہیں جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ صحیح بخاری و مسلم کی مرویات کی زد ان کے مذہب پر پڑ رہی ہے، اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ ان دونوں کتابوں کی صحت کی قوت کسی نہ کسی طرح کمزور کی جائے۔ چنانچہ ابن ہمام وغیرہ نے اس طرح کے اصول بنانے شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں بلکہ محض ان کی شروط کی وجہ سے ہے۔ پس اگر کسی دوسری کتاب کی روایت بھی اُن شرطوں پر اُتر آئے تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی۔ حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں بلکہ "شہرت" اور "قبول"

کی بنا پر ہے اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو چکا ہے۔ دوسری طرف عامۂ اصحابِ حدیث ہیں جنھوں نے اس باب میں ٹھیک تقلید کی وہی چادر اوڑھ لی ہے جو فقہاے مقلدین کے سروں پر انھوں نے دیکھی تھی اور اسے پارہ پارہ کر دینا چاہا تھا۔ ان کے سامنے جونہی بخاری و مسلم کا نام آجاتا ہے تو بالکل درماندہ ہو کر رہ جاتے ہیں پھر کوئی دلیل و حجت بھی انھیں اس پر طیار نہیں کر سکتی کہ اس کی کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں!

صحیحین کی حقیقی حیثیت

یہ محل تفصیل کا نہیں لیکن چونکہ ایک اہم اور اصولی سوال ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ مختصراً اشارات کر دیے جائیں۔ پس اس باب میں تحقیق کی راہ یہ سمجھنی چاہیے کہ

ا۔ قرآن کے بعد دین کی اُن تمام کتابوں میں جو انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں، سب سے زیادہ صحیح کتاب جامع بخاری اور جامع مسلم ہے اور ان کی ترجیح محض ان کی شروط ہی کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے "شہرت" یہ کہ ایک کتاب علم و نظر کے تمام عہدوں اور طبقوں میں عالمگیر طور پر مشہور رہی ہو اور اہل علم نسلاً نسل اس کی صحت و فضیلت پر مُہریں لگاتے رہے ہوں۔ "قبول" یہ کہ وہ تمام اُمت کی نظر و بحث کا مرکز بن گئی ہر عہد اور ہر طبقے میں بے شمار ناقدوں اور محققوں نے اس کی ایک ایک روایت، ایک ایک راوی، ایک ایک متن، ایک ایک لفظ پر ہر طرح کی بحثیں کی ہوں، ہر طریقے سے جانچا ہو، ہر طرح کی نگاہیں رد و قبول کی ڈالی ہوں زیادہ سے زیادہ موافق و مخالف شرحیں لکھی ہوں، زیادہ سے زیادہ درس و تدریس میں مانجھتے رہے ہوں، پھر بھی اس کی مقبولیت یک قلم بے داغ رہی ہو، چونکہ یہ دو باتیں تاریخِ اسلام میں صرف انہی دو کتابوں کے حصے میں آئی ہیں: و لیس لھما ثالث، اس لیے ان کی ہستی بجائے خود ایک دلیل صحت ہو گئی ہے اور بلاشبہ جب کبھی اختلاف ہوگا تو صحیحین کی روایت محض اس لیے بھی قوی تر سمجھی جائے گی کہ وہ صحیحین کی روایت دوسرے مجامیع کی روایات کتنی ہی شروط بخاری و مسلم پر نکال کر دکھا دی جائیں، لیکن وہ اس کی قوت کا نہیں ہو سکتیں۔

ب۔ لیکن جو کچھ ہے، ان کی صحت کا اعتقاد ہے۔ یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجہ کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں اور اس لیے اگر کوئی روایتِ شاذ یقینیاتِ قطعیۂ قرآنیہ معارض ہو جائے گی تو ہم ایک لمحے کے لیے بھی اس کی تضعیف میں تامل نہیں کریں گے، کیونکہ اصل ہر حال میں قرآن ہے، جس کا تواتر یقینی اور جس کی قطعیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر انسانی شہادت اسی پر کسی جائے گی، وہ کسی غیر معصوم شہادت اور رائے پر کسا نہیں جا سکتا کہ:

غرض اندر میان سلامت اوست!

پھر ہم دیکھ رہے ہیں کہ محققین حدیث نے اس باب میں کبھی ارباب جمود و تقلید کا شیوۂ اعمیٰ اختیار نہیں کیا۔
ی کی "روایت اسریٰ" شریک بن عبد اللہ بن ابی نمر والی ہے، جس کی نسبت تمام محققین نے بے تامل تصریح
کہ شریک کو غلط فہمی ہوئی اور صحیح بات وہی ہے جو مسلم کی روایت انس بن مالک میں ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم
یث خلق اللہ التوبۃ یوم السبت کی نسبت تمام محققین نے اتفاق کیا، اس کا رفع ثابت نہیں اور اسرائیلیات
خوذ ہے۔ پھر اگر اسی طرح صحیحین کی یہ روایت بھی رد کر دی گئی کہ ابراہیم خلیلؑ کی صداقت رد نہ کرنی پڑے تو کونسی
ٹوٹ پڑے گی؟

دو باتیں

اس روایت میں حضرت ابراہیمؑ کی تین باتوں کو "کذب" سے تعبیر کیا ہے۔ ایک تو یہی بات،
دوسری وہ جو سورۂ صٰفٰت میں ہے: فقال انی سقیم (۳۷ : ۸۹) تیسری یہ کہ انھوں نے
مصر کے آگے اپنی بیوی سارہ کو بہن کہا تھا۔ آخری بات قرآن میں کہیں نہیں، تورات میں ہے اور ہم اس کے
ہ نسخے کی صحت کے ذمہ دار نہیں۔ باقی رہا "انی سقیم" والا قول تو اس کی شرح صٰفٰت میں ملے گی۔ یہاں اس
ر دینا کافی ہے کہ اس کا کوئی بھی مطلب ٹھہرا لیا جائے لیکن اس میں جھوٹ کا پہلو کہاں سے نکل آیا؛ ایک
نے کہا: میں سقیم ہوں۔ پھر کیوں اسے جھوٹ پر محمول کیا جائے!

ہم نے یہاں اصل حقیقت واضح کر دی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ روایت مشہورہ کے متن و اسناد پر نظر
ئے۔ اس کے لیے "البیان" کا انتظار کرنا چاہیے۔

باب ۲۴

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت سے استشہاد

آیت ۴۸ (الانبیاء) سے سلسلۂ بیان اس طرف متوجہ ہوگیا ہے کہ متذکرۂ صدر مقاصد پر گزشتہ دعوتوں اور ان کی سرگزشتوں سے استشہاد کیا جائے۔ چنانچہ پہلے حضرت موسیٰ کی طرف اشارہ کیا جن کی کتابِ وحی کا حال عام طور پر معلوم و مسلّم تھا۔ فرمایا: اسی طرح قرآن کا بھی نزول ہوا ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منکر ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام سلسلۂ وحی و تنزیل سے منکر ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا وہ ابتدائی واقعہ بیان کیا ہے جو ان کے وطن "اور" میں پیش آیا تھا جہاں سے ہجرت کر کے وہ کنعان آئے اور وہیں بقیہ عمر کے لیے بس گئے۔

دعوتِ ابراہیمی کی تجدید

(سورۃ ابراہیم کے) آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دعوتِ قرآن دراصل دعوتِ ابراہیمی کی تجدید ہے اور اسی عہد الٰہی کا ظہور ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا۔

ایک خاص بات یہ بھی نمایاں ہے کہ خطاب کا رُخ زیادہ تر رؤسائے قریش کی طرف ہے جن کے ہاتھوں میں ملک کی سیاست و پیشوائی کی باگ تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی سارہ تھی، ایک ہاجرہ۔ ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے، لیکن سارہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہوگئی۔ پھر مایوسی کے بعد یہ بشارت ملی اور حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔

سدوم کی ہلاکت کی خبر

تورات میں ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور حاران کے بیٹے تھے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ شہر "اور" سے آئے اور سدوم میں مقیم ہوگئے جو دریائے یردن کی ترائی میں واقع تھا۔ چونکہ سدوم کی ہلاکت کی خبر پہلے حضرت ابراہیمؑ کو دی گئی تھی، اس لیے سرگزشت کی ابتداء انھی کے ذکر سے ہوئی۔

فرشتوں نے دو باتوں کی خبر دی۔ ایک یہ کہ قوم لوط کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے، دوسری یہ کہ سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش ہوگی اور ان سے حضرت یعقوبؑ پیدا ہوں گے۔[1]

---

[1] یہاں اشارہ ہے سورۃ ہود کی آیت ۷۱ کی طرف جہاں قوم لوط کی ہلاکت کی خبر اور اسحٰقؑ و یعقوبؑ کی بشارت دی گئی

ان دونوں باتوں میں بظاہر کوئی علاقہ نظر نہیں آتا اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کیوں دونوں کی خبر بہ یک وقت دی گئی؟
دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا؛ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں۔ دونوں باتیں ایک دوسری کے ساتھ مربوط ہیں۔

۔۔ت کی تشریح حضرت ابراہیم اور حضرت لوط (علیہما السلام) جب کسدیوں کے ملک سے آکر فلسطین میں مقیم ہوئے تو یہ ان کے لیے اجنبیوں کا ملک تھا لیکن مشیت الٰہی کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ ایک دن ۔۔ین پر ان کی نسل حکمرانی کرے گی۔ اس نسل کا ظہور کس سے ہوا؟ اسرائیل سے یعنی حضرت یعقوب سے۔ وہ کس کے ۔۔؟ حضرت اسحٰق کے۔ پس فرشتوں نے بہ یک وقت دو باتوں کی خبر دی۔ ایک میں ایمان و نیک عملی کی کامرانیوں کا ۔۔تھا۔ دوسری میں انکار و بدعملی کی ہلاکتوں کا۔ یعنی جس دن اس بات کی خبر دی گئی کہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ بدعملیوں کی ۔۔میں ہلاک ہونے والا ہے، اسی دن اس کی بھی بشارت دے دی گئی کہ نیک عملی کے نتائج ایک نئی نسل طیار ۔۔ہیں اور وہ عنقریب اس تمام ملک پر حکمرانی کرنے والی ہے!

۔۔اور پہلو پھر معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ سدوم اور عمورہ کا علاقہ فلسطین کا سب سے زیادہ شاداب علاقہ تھا اور معلوم ہے کہ سارہ تمام عمر اولاد کی تمنائیں کرتے کرتے بالآخر مایوس ہو چکی تھیں۔ پس قدرت الٰہی ۔۔ وقت دونوں کرشمے دکھلا دیئے۔ جو زمین سب سے زیادہ شاداب ہے، وہ بدعملیوں کی پاداش میں ایسی ۔۔ی کہ پھر کبھی سرسبز و شاداب نہ ہو سکے گی، جو شجر اُمید بالکل سوکھ چکا ہے، وہ اچانک اس طرح سرسبز ہو جائے گا کہ ۔۔ اس کی شاخیں بارآور رہیں گی!

۔۔انچہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ آتش فشاں مادے کے انفجار سے ایسا بنجر ہوا کہ آج تک بنجر ہے اور بشارت پر پورا سال ۔۔گزرا تھا کہ حضرت اسحٰق کی پیدائش ظہور میں آگئی۔ پھر ان کی نسل روز بروز بڑھتی اور پھیلتی گئی۔

۔۔ت لوطؑ کی پریشانی حضرت لوطؑ کو مہمانوں کے آنے سے اس لیے پریشانی ہوئی کہ وہ جانتے تھے شہر کے باشندے ضرور حملہ آور ہوں گے کیونکہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی اجنبی مسافر آپہنچتا تو ۔۔ر کر دیتے اور سمجھتے ہمارے حبشیانہ افعال کے لیے ایک شکار ہاتھ آگیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۔۔عراف میں حضرت لوطؑ کے وعظ و نصیحت اور قوم کی سرکشی کا حال گزر چکا ہے (اعراف: ۸۰[۱]) یہاں اس میں ۔۔ی (یعنی سورہ ھود میں) کہ عذاب کا ظہور کن حالات میں ہوا تھا۔ بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ قوم ہلاک ہوئی۔ حضرت لوطؑ اور ۔۔ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آئی۔

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ۔	تم ایسی بے حیائی کا کام کرنا پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی انسان نے کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی رحمت و شفقت

تورات میں ہے (پیدائش ۱۹: ۲۳) حضرت ابراہیمؑ نے بار بار التجا کی کہ (سدوم سے) عذاب ٹل جائے کیونکہ ہوسکتا ہے سدوم میں چند آدمی ہی نیک کردار باقی رہ گئے ہوں۔ لیکن اللہ نے فرمایا، وہاں دس آدمی بھی ایسے نہ ہوئے جو نیک کردار ہوں۔

شاید سورۃ ہود کی آیت ۷۴ میں یجادلنا سے مقصود یہی بات ہو یا اسی طرح کی کوئی بات بہرحال اللہ نے ان کی اس سعی کی مدح کی کہ یہ ان کے حلم اور رحم و شفقت کا نتیجہ تھی، پھر واضح کر دیا کہ بات ٹلنے والی نہیں تھی۔ وقت آ پہنچا تھا۔

ہدایت سے مایوس نہ ہونا

یہ واضح رہے کہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات[۵] اُن کے مناقب و فضائل میں شمار کی اور جابجا بطور نمونے کے پیش کی ہے کیونکہ کتنے ہی ناموافق حالات ہوں، مگر ہدایت سے مایوس نہ ہونا اور اپنے ماں باپ کے لیے ہر حال میں خیر طلب رہنا جن کی محبت و شفقت انسان کی پرورش کا ذریعہ ہوتی ہے، ایمان و راستی کے بہترین اعمال میں سے ہے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں جہاں ان کی وُہ مقبول دعائیں نقل کی ہیں جو امت مُسلمہ کے ظہور اور خانہ کعبہ کی آبادی کے لیے کی تھیں، وہاں یہ دُعا بھی نقل کی ہے: ربنا اغفرلی و لوالدی وللمؤمنین (۱۴: ۴۱) خدایا! مجھے بخش دے اور میرے باپ کو بھی اور ان سب کو جو ایمان لائے۔

عذاب کی نوعیت

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بھتیجے تھے اور بحر میت کے کنارے سدوم میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ معاملہ (حضرت لوطؑ کی دعوت اور قوم کی بدبختی کا معاملہ) وہیں پیش آیا۔

تورات میں ہے کہ سدوم اور عمورہ پر آگ اور گندھک کی بارش ہوئی تھی۔ قرآن میں ہے کہ پتھر گرے تھے۔ دونوں بیانوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت پیش آئی ہوگی جیسی آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے واقع ہوتی ہے۔

---

[۱] فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ (ہود: ۷۴) — پھر جب ابراہیم کے دل سے اندیشہ دُور ہو گیا اور اسے خوشخبری (ولادت اسحٰق کی) تو قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگا یعنی ہمارے فرستادوں سے بار بار سوال و جواب کرنے لگا کہ آنے والی بلا ٹل جائے۔

[۵] یعنی طلبگار بخشش ہونا۔ چنانچہ قوم لوطؑ کی تباہی کی جب آپ کو بشارت ہوئی تو آپ نے ان کی بخشش کے لیے دُعا فرمائی۔

حضرت یوسفؑ

باب ۲۵

حضرت یوسف علیہ السّلام

—(۱)—

مولانا نے ترجمان القرآن (جلد دوم) میں سورۂ یوسف کے تشریحی ترجمے کے آخر میں اس پوری سرگزشت کی عبرتیں اور موعظتیں اختصار سے واضح فرمائی ہیں جو ذیل میں درج ہیں؛

مصری تمدّن کا عروج

حضرت مسیح (علیہ السلام) سے تقریباً دو ہزار سال پہلے دنیا کے نقشے کا یہ حال تھا کہ سرزمین مصر وقت کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکی تھی لیکن اس کے اطراف و جانب کی قومیں ابھی تمدن و حضارۃ سے آشنا نہیں ہوئی تھیں اور صحرانشینی و بدویت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مصر سے ایک قریب تر علاقہ وہ تھا جو آگے چل کر فلسطین کے نام سے مشہور ہوا اور جسے خاکنائے سینا نے سرزمین افریقہ سے ملا دیا ہے۔ اس علاقے کی تمام پچھلی آبادیاں مٹ چکی تھیں۔ اب محض ایک صحرائی علاقہ تھا مویشی کے لیے چراگاہوں کا کام دیتا تھا اور مختلف بدوی قبائل وہاں بود و باش رکھتے تھے۔ انھی قبائل میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کا بھی تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کا قبیلہ اور عہد الٰہی

حضرت ابراہیمؑ کا ظہور تمدن قدیم کے ایک دوسرے مرکز یعنی سرزمین دجلہ و فرات میں ہوا تھا۔ انھوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان میں مقیم ہو گئے۔ کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت[1] کے مغربی جانب واقع ہے اور دریائے اردن سے سیراب ہوتا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ انھوں نے یہ علاقہ وحی الٰہی سے منتخب کیا تھا اور اللہ نے فرمایا تھا "تو جس جگہ کھڑا ہے اس کے چاروں طرف دیکھ۔ یہ تمام ملک میں تجھے اور تیری نسل کو دوں گا اور تیری نسل کو میں خاک کے ذرّوں کی مانند بنا دوں گا۔ اگر کوئی خاک کے ذروں کو گن سکتا ہے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔" پیدایش (۱۳: ۱۵)۔ قرآن نے جابجا اس بشارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ یہاں مقیم ہو گئے تو وقتاً فوقتاً انھیں اور بشارتیں بھی ملتی رہیں۔ ان تمام بشارتوں کا ماحصل یہ تھا کہ اللہ نے انھیں امتوں کا پیشوا، نسلوں کا مورث اور پادشاہوں کا جد

---

[1] بحیرۂ لوط یا بحیرۂ مردار (فلسطین میں)

بنایا ہے اور ان کی نسل کو اپنی برکتوں کے لیے چُن لیا ہے۔ جب تک ان کی نسل ظلم وضلالت سے آلودہ نہ ہوگی، وعدے کی برکتوں کی مستحق رہے گی۔ یہ بشارتیں اس خاندان میں اللہ کا عہد سمجھی جاتی تھیں یعنی اللہ کا وعدہ جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ خاندان کا ہر بزرگ اسے محفوظ رکھتا اور پھر اپنے وارث کو اس کی وصیت کرتا۔ یہ عہد دو باتوں پر مشتمل تھا، ایک یہ کہ نسل ابراہیمی اللہ کے دین پر قایم رہے گی اور اس کی دعوت دے گی۔ دُوسری یہ کہ اللہ اسے برکت دے گا اور اس کی دعوت کامیاب ہوگی۔ قرآن نے ان تمام بشارتوں کا جابجا ذکر کیا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۲۴)[1] اور ہود کی آیت (۷۱)[2] میں دو بشارتیں گزر چکی ہیں۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک موقع پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک خاص واقعے کی خبر دی گئی تھی یعنی یہ کہ "تیری اولاد ایک ایسے ملک میں جائے گی جو ان کا ملک نہ ہوگا۔ وہاں لوگ اسے غلام بنالیں گے اور وہ چار سو برس تک وہاں رہے گی" (پیدایش ۱۵: ۱۳)

حضرت ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیلؑ حجاز میں بس گئے اور حضرت اسحاقؑ کنعان میں خاندان کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحاقؑ سے یعقوب پیدا ہوئے۔ یہ پہلے حاران گئے تاکہ اپنی خالہ زاد بہن سے نکاح کریں پھر بیس برس کے بعد کنعان واپس آئے اور وہیں مقیم ہوگئے تورات میں ہے کہ اللہ نے نسل ابراہیمی کا "عہد" ان سے تازہ کیا تھا اور قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے

فلسطین کے تمام علاقے کی طرح حضرت یعقوبؑ کے خاندان کی زندگی بھی بالکل بدویانہ زندگی تھی۔ مویشی چراتے تھے اور ان کے گوشت، اون اور دُودھ پر گزران کرتے تھے۔

مصریوں کا غرورِ تمدّن

لیکن اس علاقے سے تھوڑے سے فاصلے پر مصر کی سرزمین تمدن وحضارت میں شہرۂ آفاق رہی تھی اور ایک بڑی مملکت کی پایگاہ تھی۔ اس کا دارالحکومت اُنہیں علوم وصنائع کا مرکز تھا اور وہاں کے باشندوں میں شہریت وامارت کی خصوصیتیں نشو ونما پاچکی تھیں جیسا کہ قاعدہ ہے، مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے اور اطراف وجوانب کے بدویوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے خصوصاً کنعانی اور عبرانی ان کی نگاہوں میں بڑے ہی ذلیل تھے۔ انھیں "چرواہا" کہہ کر پکارتے اور اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں جگہ دیں۔ یہ بات بھی ان میں عام تھی کہ کوئی مصری کنعانی کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہ کھاتا (پیدایش ۴۳: ۳۲) اور مصر کے دیہاتی بھی انھیں اس درجہ بُرا سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں ان کا بسنا گوارا نہ کرتے۔ (پیدایش ۴۶: ۳۴)

---

[1] قال انی جاعلك للناس اماما (فرمایا: میں تجھے انسانوں کے لیے امام بنانے والا ہوں) [2] یعنی اسحاق ویعقوب کی بشارت والی آیت

قدرت الٰہی کی کرشمہ سازی

لیکن قدرت الٰہی سے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ کنعان کے اس بدوی قبیلے کا ایک کم سن لڑکا بغیر اپنی خواہش اور مرضی کے مصر پہنچ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھا کہ اس عظیم الشان مملکت کی حکومت کی باگ اسی کنعانی کے ہاتھوں میں ہے اور پادشاہ سے لے کر مصر کی ادنیٰ رعایا تک سب اس کی عظمت وفضیلت کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ گویا وقت کی سب سے بڑی پُرشوکت، سب سے بڑی مغرور مملکت کے تخت حکمرانی پر اچانک کون پہنچ گیا؟ اسی بدوی قبیلہ کا ایک چرواہا، جسے اس متمدن آبادی کا ہر فرد نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

پھر یہ عجیب وغریب معاملہ کن حالات میں ظہور پذیر ہوا؟ ایسے حالات میں جو اصل معاملے سے بھی کہیں زیادہ عجیب وغریب تھے۔

اسے سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنویں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا اور شاہراہ سے الگ، اس لیے انھیں یقین تھا کہ کوئی انسان وہاں نہیں پہنچ سکے گا لیکن اتفاق سے ایک قافلہ راہ بھول کر وہاں آنکلتا ہے اور پانی کے لیے ڈول ڈالتا ہے۔ لڑکا سمجھتا ہے میرے بھائیوں کو رحم آگیا۔ اب مجھے نکالنے کے لیے ڈول ڈال رہے ہیں۔ وہ اس میں بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح اس کی رہائی کا سامان ہو جاتا ہے۔

کنعانی غلام

لیکن یہ کیسی رہائی تھی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے جو تھوڑی دیر کی تھی نجات مل گئی لیکن دُوسری ہلاکت جو عمر بھر جاری رہنے والی ہلاکت تھی نمودار ہوگئی یعنی بھائیوں نے اسے اپنا بھاگا ہوا غلام ظاہر کرکے قافلے والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ وہ اسے کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ بیچنے کے لیے مصر لے آئے۔

اس طرح مصر میں اس کا داخلہ، ایک غلام کا داخلہ تھا اور غلام بھی ایسا جو کم سے کم قیمت میں خریدا گیا اور اب کم سے کم قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ نہ تو بیچنے والے اس کی قدر وقیمت بڑھانے کے خواہشمند تھے نہ اب بازارِ مصر میں اس جنس کی گرانی کا کوئی سامان ہے۔

لے جایئے دکھلانے اسے مصر کا بازار   خواہاں نہیں پر کوئی وہاں جنسِ گراں کا

غلامی کا خواجگی وآقائی ہو جانا

بہرحال ایک خریدار کی نظر پڑ جاتی ہے۔ یہ اس کے گھر میں ایک زرخرید غلام کی حیثیت میں داخل ہوتا ہے مگر اپنے حسنِ عمل سے خواجگی وآقائی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب وغریب تھا لیکن اس سے بھی عجیب تر معاملہ وہ تھا، جب اس زرخرید غلام کے سامنے بیک وقت دو باتیں پیش کی گئیں کہ دونوں میں سے جسے چاہے اپنے لیے پسند کر لے؛ ولئن لم یفعل ما امرہٗ لیسجنن ویکونا من

الصاغرین[1] (۳۲) نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت وکامرانی اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی ونامرادی۔ پہلی میں نفس کی عشرت مگر حق کی معصیت تھی دوسری میں نفس کی محرومی مگر حق کی اطاعت تھی۔ وہ پہلی سے بھاگتا ہے اور دوسری کے لیے آرزوئیں کرتا ہے۔ پہلی سے اس طرح بھاگتا ہے گویا اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں، دوسری کے لیے اس طرح التجائیں کرتا ہے، گویا اس سے بھی بڑھ کر کوئی محبوب شے نہیں۔ رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ[2] ۔(۳۳)۔

تمنت سلیمیٰ ان نموت بحبھا　　　واھون شی عندنا، ما تمنت[3]

مصر میں کسی انسان کی ذلت ونامرادی کے جتنے سامان ہوسکتے تھے، اب وہ سب جمع ہو گئے۔ اوّل تو عبرانی قبیلے کا ایک فرد۔ پھر کیسا فرد؟ زرخرید غلام۔ کیسا غلام؟ جسے اس کے آقا نے ایک بڑے جُرم کا مرتکب پایا اور سزا کا مستحق تصور کیا۔ کیسی سزا؟ قیدخانے میں ڈالے جانے کی سزا جو ذلت وخواری اور تعذیب وعقوبت کی بڑی سے بڑی سزا سمجھی جاتی تھی۔ اب وُہ مصریوں کی نگاہ میں قابل نفرت عبرانی بھی ہے۔ غلام بھی ہے، مجرم بھی ہے اور قیدی بھی۔

قیدخانہ اور تختِ مصر

لیکن پھر غور کرو۔ دنیا کی کون سی بات اس سے زیادہ عجیب ہو سکتی ہے کہ اسی قیدی کے لیے اچانک قیدخانے کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور کھولنے والا کون ہوتا ہے؟ خود مصر کا پادشاہ اور کیوں کھولتا ہے؟ اس لیے کہ ایک عبرانی قیدی کو قیدخانے سے نکالے اور مصر کے تخت فرمانروائی پر بٹھا دے۔ گویا مصر کے قیدخانے اور مصر کے تخت حکومت کا درمیانی فاصلہ ایک قدم سے زیادہ نہ تھا۔ اس نے قیدخانے سے قدم اٹھایا اور تخت فرمانروائی پر قدم رکھ دیا۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے　　　ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

پھر اس عجیب وغریب انقلاب کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایسا کہ ان ساری باتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے اور جسے قرآن کی ایجاز بلاغت نے صرف ایک جملہ میں واضح کر دیا ہے: وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منھا حیث یشاء (۵۶) اللہ نے سرزمین مصر میں اس کے قدم اس طرح جما دیے کہ اس کے جس

---

[1] اگر اس نے میرا کہانہ مانا تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے [2] خدایا! مجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں [3] سلیمیٰ کی آرزو تھی کہ میں اس کے عشق میں مرجاؤں اور میرے لیے اس کی آرزو کو پورا کرنا بہت آسان تھا۔

حصے کو چاہے اپنے کام میں لائے۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام خاندان کو کنعان سے مصر بلا لیا اور عین دار الحکومت میں کہ "جشن[1]" کی سرزمین تھی، عزت و احترام کے ساتھ وہ بسائے گئے۔ اب وہی صحرا کے بدوی جو مصر میں قابل نفرت سمجھے جاتے تھے، مصری دار الحکومت کے معزز باشندے ہو گئے اور وہاں ان کی نسل میں اس درجہ برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی۔

کئی لاکھ انسانوں کی یہ قوم جو مصر سے نکلی، کن لوگوں کی نسل سے بنی تھی؟ اسی لڑکے کی نسل سے جو غلام بن کر آیا تھا اور فرمانروا بن کر چکا تھا اور اس کے گیارہ بھائیوں کی نسل سے، جنھوں نے اسے ہلاک کرنا چاہا تھا لیکن اس نے انھیں زندگی اور زندگی کی کامرانیاں بخش دیں۔

اس طرح اس عہد کی کرشمہ سازیوں کا ظہور شروع ہو گیا، جس کی بشارتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھیں۔ پھر حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے بھی ان کی تجدید ہوئی تھی۔

روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ

سب سے پہلی بات جو اس سلسلے میں سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ ہے۔

حضرت یعقوبؑ کا گھرانا دین حق کی امانت رکھتا تھا، وحی الٰہی کی برکتوں سے فیض یاب تھا لیکن مادی ترقیوں اور دنیوی شوکتوں میں سے کوئی بات بھی اسے میسر نہ تھی حتیٰ کہ شہری زندگی کی ابتدائی خصوصیات سے بھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے تمام افراد صحرا میں رہتے تھے، مویشی چراتے تھے اور قدرتی زندگی کی سادگی پر قانع تھے۔

لیکن مصر کی حالت بالکل اس سے مختلف تھی۔ وہ دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان سے محروم تھا لیکن وقت کی تمام مادی ترقیوں کا سرمایہ دار تھا۔ اس کے دار الحکومت کے لوگ پڑھنے لکھنے میں ماہر تھے۔ اس کے امراء و اشراف حکمرانی و دانشوری میں ترقی یافتہ تھے۔ اس کے مندروں کے کاہن حقائق اشیا کے بھید جاننے والے تھے اور اس کے حکیم علوم و صنائع کے عجائب و غرائب سکھلانے والے تھے۔ آج آثار مصر نے ایک مدون علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد کا فرعون غالباً وہ شخص تھا جسے آثار مصر میں "آبوفی" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کے عہد میں مصری تمدن پوری ترقی کر چکا تھا۔

لیکن عجیب و غریب اتفاقات نے اس صحرائی گھرانے کے ایک فرد کو مصر پہنچا دیا اور ایسی حالتوں میں

---

[1] یہ مصر کے شمالی و مشرقی حصے میں تھی۔

پہنچایا جو کسی حال میں بھی عزت و کامرانی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی تھیں تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ یہ نکلا کہ دونوں قوتوں میں مقابلہ ہوا اور بالآخر دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔

حضرت یوسفؑ کے پاس دین حق کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مصریوں کے پاس دین حق کے سوا اور سب کچھ تھا۔ یہ صرف دین حق کی فضیلت سے آراستہ تھے۔ وہ ہر طرح کی مادی فضیلتوں میں تفوق رکھتے تھے۔ بااین ہمہ ہر مقابلہ میں فتح مندی حضرت یوسفؑ ہی کی سیرت و عمل کو ہوئی اور قدم قدم پر مادی فضیلتوں کو اپنے تفوق سے دست بردار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ جب مملکت کی سلامتی خطرہ میں پڑ گئی تو اس کی نجات کے لیے مادی فضائل کی کوئی بھی پیداوار کام نہ دے سکی۔ اسی عبرانی نوجوان کے آگے مصر کو جھکنا پڑا کہ اس کی سلامتی کی راہ نکال دے۔

جب حضرت یوسفؑ نے بادشاہ مصر سے کہا تھا: اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم[1] (۵۵) تو فی الحقیقت یہ دین حق اور فیضان وحی کا ایک اعلان تھا جو وقت کے سب سے بڑے مرکز تمدن کے مقابلے میں کیا گیا تھا یعنی آج مملکت کی نجات کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم و کاروانی کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہو لیکن ایسا شخص پیش کرنے سے مصر کی پوری مدنیت عاجز ہو گئی۔ اس کا عظیم الشان دارالحکومت جو کارفرماؤں، دانشمندوں اور کاہنوں سے بھرا ہوا ہے، ایک فرد بھی پیش نہ کر سکا جو یہ بوجھ اٹھانے کا اہل ہو لیکن میں طیار ہوں کہ یہ بوجھ اٹھاؤں۔ میں دنیا کی سب سے بڑی مملکت کو اس کی ہلاکت کی گھڑیوں میں بچا لوں گا کیونکہ میں حفاظت کرنے والا، علم رکھنے والا ہوں۔

متمدن مصر نے کنعان کے صحرائی کا یہ اعلان سنا اور اس کے آگے سر نیاز خم کر دیا۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ وکذٰلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منہا حیث یشاء نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین، ولاجر الآخرۃ خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون[2] (۵۵-۵۶)

قوانین عمل و نتائج عمل

لیکن یہ معاملہ کتنا ہی عجیب معلوم ہوتا ہو اور کیسی ہی عجیب حالتوں میں پیش آیا ہو، قرآن کہتا ہے کہ قوانین الٰہی کے قدرتی نتائج کا ظہور تھا اور حقیقت شناسوں کے لیے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں یہ سب کچھ ٹھیک اسی طرح ہوا جس طرح آگ کے جلانے سے گرمی نکلے یا

---

[1] مملکت کے خزانوں میں مجھے مختار کر دیجیے اور میں حفاظت کر سکتا ہوں۔ میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔

[2] اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دیے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے اور ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں اور نیک عمل والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

پانی پینے سے پیاس بجھ جائے کیونکہ اللہ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج ٹھہرا دیے ہیں اور جب کبھی ایک خاص طرح کا عمل وجود میں آتا ہے ایک خاص طرح کا نتیجہ بھی ضرور ظہور میں آجاتا ہے۔ یہاں ہر گوشے میں علت کے ساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے۔ بھائیوں نے جو کچھ یوسفؑ کے ساتھ کیا وہ اس کے سوا کیا تھا کہ ایک خاص طرح کا انسانی عمل تھا اور جب خاص طرح کا عمل تھا تو خاص طرح کا نتیجہ نکلنا ہی تھا اور نتیجہ نکلا حضرت یوسفؑ زندگی کی مختلف آزمائشوں میں جو کچھ کرتے رہے اس کی حقیقت بھی اس کے سوا کیا تھی کہ ایک خاص سیرت کے خاص اعمال تھے اور جب اعمال تھے تو ضروری تھا کہ جیسے کچھ اعمال ہوں، ویسا ہی نتیجہ بھی نکلے اور ویسا ہی نتیجہ نکلتا رہا۔ اسی طرح سرگزشت کی تمام سیرتوں پر نظر ڈالو ہر سیرت ایک خاص طرح کے عمل میں لگی ہوئی ہے اور ہر عمل ایک خاص طرح کا نتیجہ تیار کر رہا ہے۔ سب نے اپنے اپنے بیج بوئے تھے اس لیے سب کو اپنے اپنے پھل ملنے تھے اور سب نے اپنے اپنے پھل پا لیے پس جہاں تک اعمال و نتائج کا تعلق ہے یہ تاریخ انسانیت کا کوئی مستثنیٰ حادثہ نہ تھا بلکہ سنت الٰہی کی وہی کارفرمائی تھی جو ہمیشہ سے کارفرما ہے اور ہمیشہ کارفرما رہے گی۔ جب کبھی ایسے احوال و ظروف میں ایسے اعمال ظہور پذیر ہوں گے، ضروری ہے کہ اسی طرح کے نتائج بھی ظہور میں آئیں:

سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا (احزاب: ۶۲)[1]

بلاشبہ حوادث کی نوعیت عجیب تھی اور نتائج بھی عجیب طرح کے نکلے لیکن سنت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہتا ہے۔ وہ اپنی کس بات میں عجیب نہیں؟ وہ تو سرتا سر معجزہ ہے۔ تم جب چاہو اپنے حسن عمل کی قوت سے ہر طرح کے کرشمے اور اچنبھے پیدا کر دے سکتے ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ تم چاہتے ہی نہیں اور اسی لیے قانون عمل کے کرشمے تم پر کھلتے بھی نہیں۔ دنیا میں یوسفؑ کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ گزری لیکن یوسفؑ کے حسن عمل کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ کے لیے نہ تھی بلاشبہ مصر کا بازار اب باقی نہیں رہا لیکن دنیا کا بازار کس نے بند کیا ہے؟ آج بھی جس کا جی چاہے، شان یوسفیت پیدا کر کے دیکھ لے۔ دنیا کے تخت عظمت و اجلال اس کا استقبال کرتے ہیں یا نہیں۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

یہی وجہ ہے کہ سورت میں جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے کہ ارباب دانش کے لیے اس میں عبرتیں ہیں، موعظتیں ہیں، نشانیاں ہیں۔ سرگزشت کی ابتدا ہی اس اعلان سے ہوتی ہے کہ لقد کان فی یوسف و اخوته آیت للسائلین[2] (۷) پھر خاتمہ بھی اسی پر ہوتا ہے کہ لقد کان فی قصصهم

---

[1] ایسا ہی، اللہ کا قانون ان میں رہا جو پہلے گزر چکے اور تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

[2] ان کے لیے یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے معاملے میں (عبرت و موعظت کی) بڑی نشانیاں ہیں۔

عبرۃ لاولی الالباب[1] (۱۱۱) نیز جابجا اہم واقعات کے ظہور کے بعد وضاحت کر دی ہے کہ کذالک نجز المحسنین[2] (۲۲) انہ لا یفلح الظلمون[3] (۲۳) انہ من یتق و یصبر ، فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین[4] (۹۱) یعنی یہ سب کچھ جو ظہور میں آیا، عمل کا نتیجہ ہے ، بدلہ ہے، مکافات ہے اور جب نتیجہ ہے تو ضروری ہے کہ ہمیشہ ظہور میں آئے۔ جب بدلہ ہے تو ضروری ہے کہ ہمیشہ کام کرنے والوں کو ملے۔

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے جو بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عملی کا نتیجہ وہی ہے جو حضرت یوسف کو ملا۔ صبر جمیل کبھی اس نتیجے سے محروم نہیں رہ سکتا جو حضرت یعقوب کے حصے میں آیا تھا۔ معصیت کے وہی پھل پیدا ہوگا جو امراۃ العزیز کو نصیب ہوا تھا۔ جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو سچ نہیں ہو جا سکتا۔ سچ کتنے ناموافق حالات میں اپنے آپ کو پائے لیکن جھوٹ نہیں ہو جا سکتا۔ علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمران قوت سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے سب کو اس کا لوہا ماننا پڑے

سرگزشت کی شخصیتیں اور ان کی سیرت

سرگزشت کی اصلی عبرت اس کی خاص خاص شخصیتیں ہیں ضروری ہے انھیں اچھی طرح پہچان لیا جائے۔

سب سے پہلے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں درد و غم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر اور یقین کی روح بھی چھائی ہوئی ہے اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے درد و غم کے طوفان اٹھ رہے ہیں لیکن صبر و یقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں اس پر غالب نہیں آ سکتے اور یہی صورت اس سیرت مقدس کا اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک دو لفظوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا کرتا ہے پس غور کرو صورت حال کے یہ تینوں عنصر کس طرح اپنی انتہائی اور کامل صورتوں میں نمایاں ہوئے ہیں؟ درد و غم کی شدت جب نمایاں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے۔ آتش فراق کے شعلوں کا دھواں آنکھوں سے بے اختیار بہ رہا ہے اور جسم کا ایک ایک ریشہ اس طرح گھل گیا ہے گویا سرتا پا جاں گدازی وہلاکت کی تصویر ہے؛ وتولی عنھم وقال یا اسفی علی یوسف! وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم[5] (۸۴) اور یہ حالت ایک دن کی حالت نہ تھی بلکہ اس

---

[1] یقیناً ان لوگوں کے قصے میں دانشمندوں کے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ [2] اور ہم نیک عمل والوں کو ایسا ہی بدلہ عطا فرماتے ہیں [3] حد سے گزرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ [4] جو کوئی برائیوں سے بچتا اور مصیبتوں میں ثابت قدم رہتا ہے تو (اللہ کا قانون یہ ہے کہ) وہ نیک عمل والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا [5] (یعقوب) پکار اٹھا، آہ! یوسف کا درد فراق اور شدت غم سے (رونے سے) اس کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور اس کا سینہ غم سے بریز تھا۔

مدت فراق کی ہر صبح اور ہر شام اسی عالم میں بسر ہوئی تھی؛ قالوا "تاالله تفتؤا تذکر یوسف، حتّٰی تکون حرضا او تکون من الھٰلکین[1]۔ (۸۵)

یذکرنی طلوع الشمس صخرا   واذکرہ بکل غروب شمس

لیکن پھر جب یقین کی روشنی چمکتی ہے تو اس کی نمود کا یہ حال ہے کہ دنیا کے سارے سہارے جواب دے چکے ہیں۔ امید کے سارے رشتے یک قلم ٹوٹ چکے ہیں، ہر طرف سے صدا اٹھ رہی ہے کہ یوسفؑ کی اب کوئی امید نہیں، لیکن ان کے دل کے ایک ایک ریشے کی صدا یہ ہے کہ انما اشکوا بثی و حزنی الی الله و اعلم من الله ما لا تعلمون[2] (۸۶) اور اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیه، ولا تایئسوا من روح الله[3] (۸۷) حتیٰ کہ ہر زبان جھٹلا رہی ہے اور ہر نگاہ دیوانہ سمجھ رہی ہے لیکن ان کی زبان سے بے اختیار نکل رہا ہے؛ انی لاجد ریح یوسف (۹۴) مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے؛

تفاوت است میان شنیدن من و تو   تو بستن در و من فتح باب می شنوم

صبر یعقوبؑ

پھر دیکھو جب صبر کا مقام نمایاں ہوتا ہے تو اس کی مضبوطی کیسی غیر متزلزل، کیسی اٹل ہے؛ جب یوسفؑ کے فراق کا داغ لگا، تو اس وقت بھی زبان سے یہی نکلا کہ بل سولت لکم انفسکم امرا، فصبر جمیل والله المستعان علیٰ ما تصفون[4] (۱۸) اور پھر جب بن یمین کی جدائی کی خبر سنی تو اس وقت بھی اس کے سوا کچھ زبان سے نہ نکلا کہ فصبرٌ جمیل۔ عسی الله ان یاتینی بھم جمیعا۔ انه ھو العلیم الحکیم[5] پھر باوجودیکہ بے خبر نہ تھے۔ علم و یقین کے ساتھ سمجھ چکے تھے کہ یوسفؑ کے خلاف سازش کی گئی ہے لیکن پوری سرگزشت میں کہیں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ دو باتوں سے زیادہ اس باب میں کچھ زبان سے نکلا ہو۔ ایک تو یہ کہ بل سولت لکم انفسکم امرا اور دوسرا وہ جو اس وقت زبان سے نکل گیا، جب بھائیوں نے

---

[1] (باپ کا یہ حال دیکھ کر) بیٹے بولے؛ بخدا آپ تو یوسف کی یاد میں ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے یہاں تک کہ گھل جائیں اور اپنے آپ کو ہلاک کر دیں [2] باپ بولا؛ میں تو اپنا غم اور اپنی حاجت اللہ کی جناب میں عرض کرتا ہوں (کچھ تمہارا شکوہ نہیں کرتا) میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ [3] (اے میرے بیٹو) ایک بار (پھر مصر) جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ [4] نہیں (میں اسے نہیں مان سکتا) یہ تو ایک ایسی بات ہے جو تمہارے نفس نے گھڑ کر تمہیں خوشنما دکھا دی ہے خیر میرے لیے اب صبر کرنا ہے اور صبر بھی ایسا جو پسندیدہ ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگی ہے۔ [5] خیر میرے لیے اب صبر کے سوا چارہ نہیں ایسا صبر جو پسندیدہ ہو۔ اللہ کے فضل سے کچھ بعید نہیں کہ وہ (ایک دن) سب کو میرے پاس جمع کر دے۔ وہی ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور حکمت والا ہے۔

بن یامین کو ساتھ لینا چاہا ھل امنکم علیہ الاکما امنتکم علی اخیہ من قبل[۱] (۶۴) اور ان دونوں جملوں میں بھی نہ تو ملامت کی سختی ہے نہ شکایت کی تیزی، بلکہ صورت حال کی ایسی تعبیر ہے جس سے زیادہ نرم اور دھیمی تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔ پہلے جملے میں صرف اس کا اظہار تھا کہ جو بات کہہ رہے ہو، اصلیت اس کے خلاف ہے لیکن خیر، صبر کے سوا چارہ نہیں۔ دوسرے میں صرف پہلے واقعے کا نتیجہ یاد دلایا ہے کسی طرح کا الزام نہیں دیا ہے یعنی مجھے بھروسا کرنے کے لیے کہتے ہو لیکن اگر بھروسا کروں تو کیا اسی طرح کروں جس طرح پہلے کر چکا ہوں اور اس کا جو نتیجہ نکل چکا ہے تمھیں معلوم ہے۔

الم و تاسف

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو پہلے جملے کا اسلوب ایسا واقع ہوا ہے کہ سرزنش سے کہیں زیادہ تاسف پر مبنی ہے اور مخاطبوں کے لیے ایک طرح کی معذرت کا پہلو پیدا کر رہا ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا تم نے یوسفؑ کے خلاف سازش کی ہے بلکہ کہا تمھارے جی نے تمھارے لیے ایک بات بنا دی ہے اور اسے تمھارے خیال میں خوشنما دکھایا ہے کیونکہ "تسویل" کے معنی یہ ہیں کہ کسی بات کا جما دینا، خوشنما بنا کر دکھا دینا اور اس کے لیے طمع و خواہش کا پیدا ہو جانا۔ پس گویا یہ ایک ہمدرد دل کا تاسف تھا کہ افسوس، تم نفس کے دام میں پھنس گئے اور اس کے دھوکے سے بچ نہ سکے۔ پھر ساتھ ہی ان کے اس طرز عمل کے لیے معذرت کے پہلو کا بھی اعتراف ہے کہ طمع نفس میں اگر ایسا کر بیٹھے ہو اور انسان نفس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے صدمۂ جانکاہ میں جیسا کہ حضرت یعقوبؑ کو ناگہاں پہنچا تھا اور کسی طرح کی بات کا زبان پر نہ آنا، صرف اسی جملہ کا نکلنا، صبر کا کیسا عظیم الشان مظاہرہ ہے؟ یہ ممکن ہے کہ صدمہ کے فوری تاثر کے بعد ایک صابر اور متحمل آدمی اپنے دل و زبان کی نگرانی کر لے لیکن عین اس وقت جب صدمہ کی پہلی چوٹ لگ رہی ہو اور دل کی بے تابیاں بے اختیار زبان کی طرف اٹھنے لگی ہوں، ممکن نہیں کہ دل و زبان کی نگہداشت کی جا سکے۔ ضابطہ سے ضابط دل بھی اس عالم میں چیخ اٹھتا ہے۔ مضبوط سے مضبوط طبیعتیں بھی بے اختیار متزلزل ہو جاتی ہیں لیکن حضرت یعقوبؑ کا مقام صبر ایسا نہ تھا جو کسی حال میں بھی متزلزل ہو سکے۔ اس عالم میں بھی زبان کھلتی ہے تو ایسا سنبھلا ہوا جملہ نکلتا ہے گویا بے حالی و بیتابی کا کوئی معاملہ پیش ہی نہیں آیا ہے۔

یہی وہ صبر ہے جسے "صبر جمیل" فرمایا۔

---

[۱] کیا میں اس کے لیے تم پر اسی طرح اعتبار کروں جس طرح اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں کر چکا ہوں۔

جھیلنا اور اُف نہ کرنا

بظاہر خیال ہوتا ہے کہ یہ تینوں باتیں بہ یک وقت جمع نہیں ہوسکتیں۔ اگر صبر کامل ہے تو پھر درد وغم کی شدتیں کیوں ہوں؟ اور اگر یقین موجود تھا تو درد وغم کو محو ہوجانا چاہیے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس مقام میں مشکلات محسوس کیں اور طرح طرح کی توجیہوں کی جستجو میں نکلے لیکن اگر وقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معاملہ بالکل واضح ہے اور کسی ایسی توجیہ کی ضرورت نہیں جو بہ تکلف پیدا کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا مقام صبر کا مقام تھا اور صبر جبھی صبر ہوسکتا ہے جب بے صبری کے اسباب موجود ہوں اور زیادہ سے زیادہ موجود ہوں اگر درد وغم کی ٹیس نہیں اٹھ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جھیلنے اور اف نہ کرنے کی حالت موجود ہے؟ جھیلنا تو اسی کا جھیلنا ہوگا جو برابر آگ کی جلن محسوس کر رہا ہو لیکن پھر بھی زبان سے اُف نہ نکالے۔ اگر حضرت یعقوبؑ کا درد وغم اس طرح محو ہوجاتا کہ اس کی جلن باقی ہی نہ رہتی یا رہتی تو بہت دبی دبائی رہتی، تو یہ مقام صبر کا مقام نہ ہوتا، موجبات سے متاثر نہ ہونے کا مقام ہوتا اور ایسی حالت یا تو فرشتوں کی سی مخلوق کی ہوسکتی ہے یا ایسے انسان کی جس کے احساسات معطل ہو چکے ہوں لیکن حضرت یعقوبؑ انسان تھے فرشتہ نہ تھے اور اسی حیثیت سے قرآن نے ان کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ ان کی رُوح صبر و یقین سے معمور تھی۔ وُہ یوسف کے خواب میں اس کا مستقبل دیکھ چکے تھے۔ وُہ جانتے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ جدائی ختم ہونے والی ہے تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے جس کی جدائی ایک گھڑی کے لیے بھی شاق تھی وہ برسوں کے لیے ان سے جدا ہوگیا تھا۔ یہ جاننے پر بھی کہ وُہ زندہ وسلامت موجود ہے اس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا بلکہ اس بات کے تصور نے کہ وُہ جو زندہ موجود ہے مگر مجھ سے دُور ہے، درد فراق کی چبھن اور زیادہ کر دی تھی۔

بلائے ہجر و درد انتظارِ پیر کنعانی　　کسے داند کہ چوں یوسف عزیزے در سفر دارد

عظمت کی بنیاد و اساس

فی الحقیقت اس صورت حال کی ساری عظمت اسی میں ہے کہ یہ ایک ماورائے انسانیت سیرت نمودار نہیں کرتی بلکہ ایسی حالتوں میں ایک کامل صابر و مومن کی زندگی کی جو تصویر ہوسکتی ہے، وہ سامنے آگئی ہے۔ دل آتش فراق میں پھنکا جا رہا ہے اور ہزار کوشش کی جائے لیکن یہ آگ اس طرح بجھنے والی نہیں لیکن ساتھ ہی روح ایمان و یقین سے معمور ہے اور دماغ صبر جمیل کا عزم کر چکا ہے۔ پس غم کو دیکھا جائے تو وُہ اپنی جگہ ہے۔ صبر و یقین کو دیکھا جائے تو وُہ اپنی جگہ ہے۔ اگر دل اپنی بے قراریوں میں کبھی کمی نہیں کرتا تو دماغ بھی اپنے شیوۂ صبر و رضا میں کبھی متزلزل نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی بے تابیاں حد سے گزر جاتی ہیں اور "یا اسفی علی یوسف" بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے لیکن یہ بھی نکلتا ہے تو کس کے آگے نکلتا ہے؟

اس کے آگے، جس کے آگے اپنا درد و غم پیش نہ کیجیے تو یہ بھی شان عبودیت کے خلاف ہے: انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ، و اعلم من اللہ ما لا تعلمون (۸۶)۔

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم
گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوندست

باب ۲۶

حضرت یُوسف علیہ السّلام

—(۲)—

یُوسف علیہ السّلام پھر حضرت یعقوبؑ کے بعد حضرت یُوسف (علیہما السلام) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور یہی سرگزشت کی اصل شخصیت ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ایک خاص حقیقت کی جلوہ نمائی شروع ہو جاتی ہے اور جس جس رُخ سے دیکھیے اور جہاں کہیں دیکھیے، اسی کی نمود سامنے آتی رہتی ہے۔ یعنی انسان کی سیرت (کیرکٹر) کی فضیلت اور اس فضیلت کی اٹل کامرانیاں۔ ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اور اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح وکامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں، جب بھی وُہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں جب بھی اس کی رفتار نہیں رُکے گی۔ حوادث ووقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد وجماعت کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے۔ اعمال ونتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اسی لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز ودرماندگی کی آلودگی کبھی اسے چھو نہیں سکتی۔

پیش آمدہ پر صبر وسکون سترہ برس کا ایک کم سن لڑکا باپ کی آغوشِ محبت سے جبراً چھین لیا جاتا ہے اور اچانک اپنے آپ کو کن لوگوں میں پاتا ہے؟ ان میں جو چند سکوں کے بدلے اسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی ایک لاکھ انسانی طبیعتیں ایسی حالت میں کیا کرتیں؟ مگر غور کرو اس نے کیا کیا؟ اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح اس نے صورتِ حال کا پُورا جائزہ لے لیا ہو اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آ جائے اسے صبر وسکون کے ساتھ جھیل لینا چاہیے اور اسی کے مطابق کام لے جانا چاہیے۔ قافلہ والوں نے انھیں غلام کی حیثیت میں پیش کیا۔ وہ ایک غلام کی طرح پیش ہو گئے۔ عزیز مصر نے غلام کی طرح خرید کیا۔ انھوں نے غلام کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی اور اس کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جس طرح ایک طاعت شعار اور وفادار غلام کو اپنے آقا کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ کہیں سے بھی کوئی ایسی بات مترشح نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے میں اسے کوئی تامل ہوا ہو۔ گویا یہ ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے پوری زندگی کی سوگواری

بن جاتی، ان کے لیے کوئی مصیبت ہی نہ تھی۔ باپ کی آغوشِ محبت سے نکل کر اچانک ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کا غلام بن جانا۔ ان کے لیے ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک عیش چھوڑ کر دوسرا عیش اختیار کر لینا۔ نہ پچھلی حالت کا ماتم ہے نہ موجودہ حالت سے جھجک۔ نہ گزشتہ کی یاد میں سوگواری ہوئی نہ آیندہ کے اندیشہ میں بدحالی۔ اس عالم اور بے پروا ملاح کی طرح، جسے نہ تو کنارا چھوٹنے کا غم ستاتا ہے نہ آنے والے طوفانوں کا اندیشہ، اس نے اپنی کشتی چلانی شروع کر دی اور دیکھو بالآخر ساحلِ مقصود تک پہنچ کر رہی۔ حوادث و انقلاب کے ترکش میں اس سے بڑھ کر اور کون تیر ہو سکتا ہے جو اس پر چلایا گیا تھا؟ لیکن اس کے صبر و عزم نے اسے پرکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اس طرح بے داغ نکل گیا گویا گردشِ حوادث کا ہاتھ اس کے خلاف اٹھا ہی نہ تھا:

دریا دلاں چو موج گہر آرمیدہ اند　　　چیں بر جبیں ز جنبشِ ہر خس نمی رسد

غور کرو، ہر انسان کے لیے جو دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں اپنی راہ نکالنی چاہتا ہو، اس معاملہ میں کیسی عظیم الشان عبرت ہے؟ اگر حضرت یوسفؑ نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتمادِ نفس اور توکل علی اللہ کی یہ روحِ عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی، تو کیا ممکن تھا کہ اس منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخر ان کی منزلِ مقصود ثابت ہوئی؟

پھر دیکھو، زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمایشوں پر آزمایشیں پیدا کرتی رہیں اور ان کی غیر متزلزل اور بے داغ سیرت کس طرح فتح مندیوں پر فتح مندیاں حاصل کرتی گئی؟

عزیزِ مصر پر اثر

سب سے پہلے عزیزِ مصر کے ساتھ ان کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ اس نے بحیثیت غلام کے انھیں خرید کیا تھا اور مصر کے آثار و نقوش ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوا کرتا تھا۔ وہ غلاموں کے لیے اتنے ہی سنگدل تھے جتنی سنگدل دنیا کی تمام پرانی قومیں رہ چکی ہیں تاہم انھوں نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر اپنے حسنِ سیرت سے اس کا دل ایسا مسخر کر لیا کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگے اور اس نے اپنی بیوی سے کہا: اکرمی مثواه عسیٰ ان ینفعنا او نتخذه ولدا (۲۱)[۱]۔

غور کرو۔ یہ انقلاب حال کیونکر پیدا ہوا ہوگا؟ وہ کیسی وفاداری و دیانت اور راست بازی و امانت شعاری ہوگی جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ ایک عبرانی غلام کو اپنے فرزند کی

---

[۱] اسے عزت کے ساتھ رکھو۔ عجب نہیں یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں۔

ج چاہنے لگا اور اپنے تمام گھربار اور علاقہ کا مختار کل بنا دیا ؛

مراۃ العزیز پھر امراۃ العزیز کا معاملہ رونما ہوتا ہے پچھلی آزمائیش ذہن ودماغ کی آزمائیش تھی، یہ جذبات کی تھی اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائیش جذبات ہی کی آزمائیش ہی ہے۔ وُہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا۔ پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھراتا، آسمان کی بجلیوں سے س لرزتا، درندوں کے مقابلے سے منہ نہیں موڑتا۔ تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے لیکن نفس ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنی سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن حضرت یوسفؑ سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہ ہوسکی۔ ان کی بے داغ فضیلت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا بھی دھبّا نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر صورت حال کی پوری تصویر کھینچ دی ہے اور اگر ان اروں کو تشریح و بیان کا پُورا جامہ پہنایا جائے تو کئی صفحوں کی داستان بن جائے۔ تم چشم تصوّر سے م لو اور دیکھو کہ ترغیبات کے قہر و سلطانی کا کیا حال تھا اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں صبر ربا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی؟ عمر عین عروج شباب کی اور معاملہ محبت کا نہیں، محبوبیت کا، طلب کا ں، مطلوبیت کا۔ پھر طلب بھی ہُوئی تو کیسی طلب؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب۔ پھر سب سے کر یکہ موانع بہ کلی مرتفع ہوگئے۔ کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردۂ حجاب حائل ہونے والا نہیں۔ ن ہے جو ایسی حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے؛ عفت و پاکی کا کون سا پہاڑ ہے جو ان لیوں کی تاب لا سکتا ہے؛ لیکن ایک پہاڑ تھا جسے یہ بجلیاں بھی جنبش میں نہ لا سکیں۔ یہ حضرت یوسفؑ کی رت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہوسکتی تھی خود امراۃ العزیز کے لفظوں میں (اور اس سے بڑھ کر س معاملہ کا کون شاہد ہوسکتا ہے) نقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم[1] (۳۲) وہ اس حال میں بھی اپنی لہ سے بے جگہ نہ ہُوا۔ اس کوہ عصمت کے لیے ذرا سی بھی جنبش نہ تھی۔

داے فرض کا مقام بلند پھر دیکھو، امراۃ العزیز کی دعوت عیش کے جواب میں جو کچھ ان کی زبان سے نکلا۔ وُہ کیا تھا؟ معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای (۲۳) راشوہر میرا آقا ہے۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ عزت و احترام کے ساتھ رکھا پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کے سن سلوک کا بدلہ میں یہ دوں کہ اس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں؛ غور کرو یہ بُرائی ایسی بُرائی تھی کہ اسے

---

[1] بے شک میں نے اس کا دل قابو میں لینا چاہا مگر وُہ بے قابو نہ ہُوا۔

برائی دکھلانے کے لیے کتنی ہی باتیں کہی جاسکتی تھیں لیکن ان کا ذہن اسی بات کی طرف گیا اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کر کے دکھایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی سیرت کا اصلی جوہر یہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ امانتداری، راست بازی، اور اداے فرض کی روح اس طرح ان پر چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر سب سے پہلے وہی سامنے آتی تھی۔

پھر اس کے بعد لائمات کا معاملہ پیش آتا ہے۔ اب صرف ایک امراۃ العزیز ہی کا فتنہ نہ تھا۔ دارالحکومت مصر کے تمام فتنہ گران حسن جمع ہو گئے تھے کہ ان کی متاع ضبط و تحمل کی غارت گریوں میں حصہ لیں:

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا؟ قلن حاش للّٰہ! ماھٰذا بشرا۔ ان ھٰذا الا ملک کریم[1] (۳۱)

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے

عشق حق اور پرستاری صدق

پھر دیکھو۔ راست بازی و حق پرستی کی آزمایش نے اچانک کیسی صورت اختیار کر لی ہے؟ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے، لیکن اب حضرت یوسفؑ کے سامنے قید کی سزا اس لیے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں۔ لوگ قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ کو اس لیے قید خانے کی دھمکی دی جارہی ہے کہ عیش حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انھیں دعوت دی اور انھوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔

یہ حضرت یوسفؑ کی سیرت کا سب سے زیادہ عظیم مظاہرہ ہے۔ یہ عیش حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستورالعمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں: زندگی کا عیش مگر معصیت حق کی راہ میں۔ زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں۔ تو ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا کہ السجن احب الی مما یدعوننی الیہ (۳۳) قید خانہ مجھے محبوب ہے مگر وہ بات نہیں جس کی مجھے دعوت دی جارہی ہے۔

مفسرین کی حقیقت فراموشی

ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت یوسفؑ کی بدشگونی تھی کہ خود قید خانہ کی بات بول اٹھے اگر جلدی میں آکر ایسا نہ کہہ دیتے تو

---

[1] سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبے والا فرشتہ۔

ابتلا پیش نہ آتی۔ افسوس کس درجہ حقیقت فراموشی ہے حضرت یوسفؑ کی جو بات ان کی پاکی وعظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی، وہی ان حقیقت ناآشناؤں کی نظر میں ان کی لغزش ہو گئی۔ گویا حضرت یوسفؑ کا قید خانہ کو معصیت پر ترجیح دینا اور اسے خوشی خوشی اختیار کر لینا، کوئی ایسی بات تھی جو نہ ہونی چاہیے تھی اور صرف اس لیے ہو گئی کہ حضرت یوسفؑ نے بدشگونی کی بات کہہ دی تھی! غور کرو۔ قرآن کہاں ہے اور اس کے شارح کہاں پہنچ گئے ہیں۔

نزلوا بمکة فی قبائل هاشم　　　　ونزلت بالبیداء بعد منزل

پھر دیکھو۔ حضرت یوسفؑ کی یہی سیرت ہے جو قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی کو بھی اسی طرح روشن کر دیتی ہے جس طرح عزیز مصر کے ایوان عزت و اقبال کو اس نے روشن کر دیا تھا کیونکہ چراغ جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے، روشنی ہی دے گا اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہیں ہو جائے گی کہ جواہر خانہ شاہی میں رہنے کی جگہ کوڑے کرکٹ میں ڈال دیا گیا۔ تورات کی تصریح پڑھ چکے ہو کہ قید خانہ کا افسران کا معتقد ہو گیا تھا اور قید خانہ میں انھی کی افسری قایم ہو گئی تھی۔

دعوت حق کا داعیہ

پھر دیکھو عین قید خانہ کی زندگی میں دعوت حق کا داعیہ آن کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت تک انھوں نے مصر میں دین حق کی تبلیغ نہیں کی تھی، اگرچہ خود اسی پر قایم تھے لیکن اب وقت آگیا تھا کہ خاندانی نبوت کا ان میں ظہور ہو چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب یکایک اپنے قلب کو ولولۂ تبلیغ سے معمور پایا لیکن یہاں کون تھا جو اس تبلیغ کا مخاطب ہوتا؟ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے جو طرح طرح کے جرموں کی پاداش میں یہاں پہنچا دیئے گئے تھے مگر غور کرو انھوں نے رہائی کا انتظار نہیں کیا۔ انھی قیدیوں میں تبلیغ حق شروع کر دی اور اب مصر کا قید خانہ دعوت حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درس گاہ بن گیا۔

پھر دیکھو۔ تبلیغ حق کے جوش و طلب کا کیا حال ہے؟ دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے تھے اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سن کر حضرت یوسفؑ معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے، دوسرے کی موت قریب ہے۔ پس چاہتے ہیں کہ فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں اور تعلیم حق سے انھیں آشنا کر دیں۔ ممکن ہے جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے۔ جس کی موت قریب ہے ممکن ہے سچائی قبول کر لے اور دنیا سے جائے تو راہِ حق پر جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، انھوں نے خواب سنتے ہی اس کی تعبیر نہیں بتلا دی، بلکہ ان کی توجہ و رجوع سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کر دیا انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللہ وھم

بالآخرۃ ھم کٰفرون۔ (۳۷)[1]

ان کی سیرت کے اس مقام سے ہم معلوم کر لے سکتے ہیں کہ دعوت حق کا فریضہ کیونکر ادا کرنا چاہیے اور داعیٔ حق کے جوش و طلب دعوت کا کیا حال ہوتا ہے؛ قید خانے کی زندگی بھی اُسے فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ میں کیونکر قید سے رہائی پاؤں بلکہ تمام تر اس کی تھی کہ خدا کے بندے جہل و گمراہی سے کیونکر نجات پائیں؛ مہلت جب کبھی ملی اور جس حال میں ملی معاً اسی مقصد کے لیے کام میں لائی گئی اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا، اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور وہ زندہ رہنے والا ہو یا مر رہا ہو، اسے اس کا حق فوراً ملنا چاہیے۔

"واذکرنی عندربک" کا مطلب

پھر دیکھو، معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پہنچا سکتے ہیں، پہنچا دیں۔
جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر مامور ہونے والا ہے معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت و جلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقع حاصل ہوگا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے؛ چنانچہ تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا: اذکرنی عند ربک (۴۲) اپنے آقا کے پاس جائیو تو مجھے یاد رکھیو یعنی میری یہ تعلیم و دعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بہ عنوان مناسب اس کا تذکرہ کر دیجیو۔ ممکن ہے کہ پیامِ حق کام کر جائے۔

عام طور پر حضرت یوسفؑ کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے میری سفارش کیجیو۔ لیکن جس محل میں یہ بات کہی گئی ہے اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قیدیوں سے جو کچھ بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں ہے۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے اپنے قید و محن کے مصائب کا ذکر کیا ہو۔ پس اس بات کا وہی مطلب موزوں معلوم ہوتا ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔

جوشِ اصلاح

یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپؑ نے تعبیر فوراً کیوں بیان نہیں کر دی تھی۔ مفسرین کہتے ہیں تاخیر اس لیے کی کہ وحی کا انتظار تھا لیکن اگر آپ

---

[1] میں نے ان لوگوں کی ملت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔

انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیونکر وعدہ کر لیتے کہ لا یاتیکما طعام ترزقانہ ، الا نبأتکما بتاویلہ (۳۷)[1] اور فیضانِ وحی سے تو آپ کا قلب معمور ہو رہا تھا تعبیر کے لیے انتظار کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی؟ صاف بات یہی ہے کہ تاخیر قصداً کی تھی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کے احتیاج نے ان دونوں کو میری طرف متوجہ کر دیا ہے۔ چاہیے کہ اس توجہ سے فوراً فائدہ اٹھایا جائے اور دین حق کی دعوت چھیڑ دی جائے چنانچہ اس کا ذکر اس مناسبت سے شروع کر دیا کہ ذالکما مما علمنی ربی انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالآخرۃ ھم کفرون[2]۔ یعنی خواب کی تعبیر میں بہت جلد تبلا دوں گا کیونکہ میرے پروردگار نے مجھے اس کا علم دیا ہے لیکن میرے علم کو اس طرح کا علم نہ سمجھنا جس طرح اپنے کاہنوں اور جادوگروں کا سمجھا کرتے ہو۔ میری راہ دوسری ہے میں تمہارے طریقے پر کاربند نہیں۔ پھر اس طرح بات میں سے بات نکالتے ہوئے دین حق کی دعوت شروع کر دی کہ یصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار؟ (۳۹)[3]

علم وفضل کی بخشش

پھر دیکھو۔ اس سیرت کی فضیلت کا کیسا عجیب منظر سامنے آجاتا ہے۔ جب بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے اور سردار ساقی آکر یہ معاملہ انھیں سناتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان ایسے موقع پر کیا کرتا؟ دنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا جسے بغیر کسی جرم و گناہ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہو اور سالہا سال سے اسی حالت میں بے یار و مددگار پڑا ہو؟ یقیناً اسے تائید غیبی سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا اور کہتا۔ میں مشکل حل کر دے سکتا ہوں۔ مجھے یہاں سے نکلنے اور بادشاہ کے حضور حاضر ہونے کا موقع دیا جائے مگر ہم دیکھتے ہیں حضرت یوسفؑ کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش ظاہر نہیں ہوئی۔ انھوں نے خواب سنتے ہی اس کی تعبیر بیان کر دی۔ اس کا خیال بھی انھیں نہیں گزرا کہ اپنی مطلب براری کی یہ نہایت قیمتی بات تھوڑی دیر کے لیے بھی روک لوں۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ جتنی بات پوچھی گئی تھی، تبلا دی ، بلکہ اس سے بھی زیادہ علم وفضل کی بخشش سائل کے دامن میں ڈال دی یعنی خواب میں ایک آنے والی ہولناکی کی خبر دی گئی تھی انھوں نے تعبیر کے ساتھ یہ بھی تبلا دیا کہ اس ہولناک مصیبت سے بچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ سوال بادشاہ کی طرف سے تھا لیکن

---

[1] قبل اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے میں تمہارے خوابوں کا مال تمہیں بتاؤں گا۔ [2] اس بات کا علم بھی من جملہ ان باتوں کے ہے جو مجھے میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہیں۔ میں نے ان کی ملت ترک کر دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ [3] اے یاران مجلس! جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا صرف اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے۔

دیکھو، جس نے جواب دیا، وُہ قیدخانہ کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہُوا، اپنے علم وفضیلت کی بخشش میں پادشاہوں سے بھی زیادہ فیاض تھا:

عدیل ہمت ساقی ست فطرت عرفی   کہ حاتم دگران وگدائے خویشتن ست

پیغمبری کی شان

حضرت یوسفؑ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ دنیا نے ان کے ساتھ کچھ ہی کیا ہو، وہ دنیا کی خدمت و ہدایت کے سوا اور کوئی شے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب انھوں نے خواب سُنا اور خواب کا حل ان کے علم و بصیرت نے معلوم کر لیا تھا، تو وہ ایک لمحے کے لیے علم و ہدایت کا فیضان انسانوں پر نہیں روک سکتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ جب کبھی طلب اعانت کا ہاتھ ان کے آگے بڑھے وُہ اس کی دستگیری کریں اور انھوں نے دستگیری کی۔ اگر نہ کرتے تو داعی حق نہ ہوتے۔ ان کا بے لوث جذبۂ خدمت اس خودغرضانہ مطلب براری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک انسان کی مشکل اور احتیاج کو اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔

عزت نفس اور استقامت حق

پھر جب بادشاہ ملاقات کا مشتاق ہُوا اور اپنا پیام بھیجا، تو چاہیے تھا کہ جوش مسرت سے اس پیام کا استقبال کرتے کیونکہ اب خود بخود رہائی سامنے آ گئی تھی اور ایسی حالت میں آئی تھی کہ پادشاہ وقت مشتاق زیارت ہو رہا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی نگاہوں میں معاملہ نے دوسری ہی شکل اختیار کی انھوں نے قیدخانہ چھوڑنے اور پادشاہ کی ملاقات سے انکار کر دیا اور کہلایا کہ پہلے میرے معاملے کی تحقیقات کر لی جائے۔

اب یہاں پھر بے اختیار یہی سوال سامنے آجاتا ہے کہ دنیا کا ہر مظلوم قیدی ایسی حالت میں کیا کرتا اور اس پیکر صدق وصفا نے کیا کیا؟ غور کرو۔ ان کی سیرت کیسے جوہروں سے گوندھی گئی تھی اور کس طرح صبر وضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خودداری اور عزت نفس کی روح اس کے ایک ایک ذرہ میں رچی ہوئی تھی؟ حضرت یوسفؑ کے اس انکار و انتظار میں ان کی اخلاقی ذہنیت کی ایک پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ قید سے رہائی بلاشبہ ایک خوشخبری ہے لیکن ایسی رہائی مجھے کیا خوش کر سکتی ہے جو میری بے جُرمی کی وجہ سے ظہور میں نہ آرہی ہو، بلکہ محض پادشاہ کا ایک عطیہ اور بخشش ہو؟ میں تھا تو مجرم ہی لیکن چونکہ پادشاہ نے خواب دیکھا، کسی سے تعبیر بن نہ آئی، میں نے بتلا دی اس لیے خوش ہو کر پادشاہ نے رہا کر دیا۔ پس یہ بادشاہ کا احسان ہُوا۔ حق و انصاف کا فیصلہ نہ ہُوا۔ نہیں میں اپنی رہائی بطور ایک احسان کے قبول نہیں کر سکتا۔ اگر میں مجرم ہوں تو سزا کا سزاوار ہوں۔ کیوں مجھے کوئی بخشے؟ اگر مجرم نہیں ہوں تو میری بے جرمی کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس لیے رہا کرنا چاہیے کہ سزا کا مستحق نہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ کسی نے بخش دیا۔

عزت نفس اور استقامت حق کا کیسا بلند مقام ہے ؛ اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے جس میں
ہیں سے بھی کوئی لچک پڑتی دکھائی نہیں دیتی ؟ جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو ، اس کی بے داغ
خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں ، اور اس سورج کی روشنی کبھی مدھم نہیں پڑسکتی !

کانہٗ علمٌ فی راسہ نار

فی الحقیقت جمالِ یوسفؑ کی یہی رعنائیاں تھیں جنھوں نے ایک ہی نظارے میں بادشاہ کا دل مسخر کر لیا تھا
انک الیوم لدینا مکین امین[1] (۵۴)

بھائیوں کے ساتھ معاملہ

پھر سب سے آخر اس موقع کا مطالعہ کرو جب حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ کون بھائی ؟ جنھوں نے
قتل کا سامان کیا اور پھر غلام بنا کر اجنبیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کس کے سامنے ؟ اسی مظلوم کے سامنے جو آج
مظلوم نہیں بلکہ وقت کی سب سے بڑی مملکت کا مالک اور قحط سالی کی سب سے بڑی مصیبت میں سامان
زندگی بخشنے والا ہے۔ کیسا عجیب موقع تھا ؟ اور نفس انسانی کے لیے ولولۂ انتقام کی کیسی صبر آزما آزمائش ؛
پھر غور کرو۔ اوّل سے لے کر آخر تک حضرت یوسفؑ کا طرزِ عمل کیسا رہتا ہے ؟ کہیں بھی کوئی بات ایسی دکھائی
دیتی ہے کہ کہہ سکو ، بغض و انتقام کے جذبہ کی کوئی ہلکی سی بھی پرچھائیں پڑ رہی ہے ؟ اتنا ہی نہیں ، بلکہ وہ تو
ان کے لیے سرتاپا شفقت و رحمت ہو گئے تھے۔ انتقام و سرزنش کا کیا ذکر ہے۔ ان کی زبان سے تو ایک لفظ
بھی ایسا نہیں نکلا جس سے بھائیوں کے دلوں کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی۔ صاف نظر آرہا ہے کہ ان کی شرمندگی و
پشیمانی کا زخم ان سے کہیں زیادہ خود ان کے دل پر لگ رہا ہے اور اب فکر ہے تو اس بات کی کہ کس طرح ان کے
دلوں کے لیے تسکینِ خاطر کے سامان پیدا کر دیں۔

جب تیسری مرتبہ بھائی آئے اور اپنی مصیبتوں کی داستان سنائی : مسنا و اھلنا الضر[2] اور پھر دستِ سوال
بڑھایا کہ تصدق علینا ۔ ان اللہ یجزی المتصدقین[3] (۸۸) تو جوشِ محبت سے بے قرار ہو گئے۔ اس
وقت ان کے سامنے اور کوئی بات نہ تھی۔ صرف یہ تھی کہ میرے بھائی فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ میں مسندِ عزت پر
بیٹھا ہوں اور وہ دریوزہ گروں کی طرح دستِ سوال دراز کیے ہوئے ہیں۔ بے اختیار ان کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو

---

[1] آج کے دن تم ہماری نگاہوں میں بڑا صاحبِ اقتدار اور امانت دار انسان ہے۔ [2] ہم پر اور ہمارے گھر کے
آدمیوں میں بڑی سختی کے دن گزر رہے ہیں۔ [3] ہمیں محتاج سمجھ کر خیرات دے دیجیے۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو
اجر دیتا ہے۔

ظاہر کر دیں۔ ھل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ[1] تمھیں وہ بات بھی یاد ہے جو یوسف[2] اور اس کے بھائی کے ساتھ کی تھی؟ کہنے کو تو یہ کہہ گئے اور یہ کہے بغیر چارہ بھی نہ تھا کیونکہ یاد دلانا تھا کہ میں مصر کیونکر پہنچا، لیکن معاً خیال ہُوا کہ اس معاملہ کی یاد میں ان کے لیے سرتا سر سرزنش و خجالت ہے۔ اس لیے فوراً ایک بات ایسی بھی کہہ دی کہ ان کے لیے معذرت کا پہلو نکل آئے اور شرمندگی کا بوجھ محسوس نہ کریں: اذ انتم جٰھلون[2] (۸۹) یہ اس وقت کی بات ہے جب تمھاری نادانیوں کا زمانہ تھا یعنی اس معاملہ پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ نادانیوں کے زمانے کی ایک بات ہے اور دنیا میں کون ہے جس پر کوئی نہ کوئی زمانہ نادانیوں کا نہ گزرا ہو؟

یہ سنتے ہی جب انھوں نے پہچان لیا اور عجز و ندامت کا سر جھکا کر بولے: تاللہ لقد اٰثرک اللہ علینا و ان کنا لخٰطئین[3] (۹۱) تو بلا تامل جواب ملا: لا تثریب علیکم الیوم۔ یغفر اللہ لکم و ھو ارحم الراحمین نہیں آج کا دن بچھڑے ہوؤں کے ملنے اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جڑنے کا دن ہے۔ ملامت و الزام کی باتوں کا یہاں گزر نہیں۔ میرا دل تو ہر طرح کی رنجشوں سے صاف ہے۔ باقی رہا خدا کا معاملہ، تو اس کے لیے بھی میری دُعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ وہ تمھارے سارے قصور بخش دے اور وہ ضرور بخش دے گا کیونکہ اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور کون ہے؟

بھائیوں کے ساتھ بے مثال حسن سلوک

پھر آگے چل کر جب وقت آیا کہ اللہ کے فضل و کرم کا شکر ادا کرتے ہُوئے گزرے ہوئے واقعات کی طرف اشارہ کریں، تو دیکھو، اس معاملہ کی طرف کیونکر اشارہ کرتے ہیں؟ منۢ بعد ان نزغ الشیطن بینی و بین اخوتی (۱۰۰) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا یعنی اول تو اس معاملے کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا کہ بھائیوں پر اس کا بوجھ نہ پڑے گویا یہ شیطان کا ایک فتنہ تھا ورنہ میرے بھائی ایسا کیوں کرتے۔ پھر سارے معاملہ کو محض ایک طرح کے اختلاف سے تعبیر کیا تاکہ اصل واقعہ کی شناعت کم ہو جائے۔ پھر جتنا کچھ بھی ہونا ظاہر کیا، وُہ اس طریقہ پر کیا کہ "مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا تھا"، گویا یہ بھائیوں کا بلاوجہ جور و ستم نہ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جیسے بھائیوں میں باہم گرپیش آجایا کرتی ہے اور دونوں جانبوں کو اختلاف کے وجوہ میں دخل ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک ہی جانب کا قصور تھا۔

---

[1] تمھیں یاد ہے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ [2] جب تمھیں سمجھ بُوجھ نہ تھی [3] بخدا کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تمھیں ہم پر برتری دی اور بلاشبہ ہم سرتاسر قصوروار تھے۔

غور کرو، عفو و بخشش کا وہ کیسا مقام ہے؛ ہمت کا وہ کیسا علو ہے؛ ظرف کی وہ کیسی پہنائی ہے؛ خلق کی وہ کیسی عظمت ہے، جو دشمنی کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؛ جس سیرت کا یہ حال ہو اس کے لیے فضیلت کی اور کون سی بات باقی رہ گئی؛

شنیدم کہ مردان راہ خدا — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مظلومی میں صبر اور مختاری میں بخشش

مظلومی و بے چارگی کی حالت میں صبر کر لینا بلاشبہ ایک بڑائی ہے لیکن طاقت و اختیار کی حالت میں بدلہ نہ لینا اور بخش دینا سب سے بڑی بڑائی ہے؛ و لمن صبر و غفر ان ذالک لمن عزم الامور[1] (الشوریٰ: ۴۳) اور اس سیرت کی عظمت میں دونوں مقام جمع ہو گئے۔ جب بیچارگی تھی تو اف تک نہ کی، جب طاقت ملی تو انتقام کا وہم و گمان بھی نہ گزرا اور بلاشبہ یہ اس زندگی کا سب سے بڑا اسوہ حسنہ ہے۔

سب سے آخر میں ان کی دعا نمایاں ہوتی ہے اور یہ فی الحقیقت ایک مرقع ہے جس میں ان کی سیرت کا ایک ایک خال و خط دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ عظمت و کامرانی کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی جو صدا ان کے دل و دماغ سے نکل سکتی تھی وہ یہی تھی کہ فاطر السمٰوٰتِ و الارض: انت ولی فی الدنیا و الآخرۃ۔ توفنی مسلمًا والحقنی بالصّٰلحین[2] (۱۰۱) یعنی زندگی کی ساری کامرانیوں کا آخری ماحصل جس کی طلب و آرزو سے کبھی دل خالی نہیں ہو سکتا، یہی ہے کہ اطاعتِ حق پر خاتمہ ہو اور الحاق ان کے ساتھ ہو جو تیرے صالح بندے ہیں۔

امراۃ العزیز

حضرت یوسفؑ کے بعد سرگزشت کی نمایاں شخصیت امراۃ العزیز کی شخصیت ہے کیونکہ حضرت یوسفؑ کی مصری زندگی کے حوادث میں بڑا حصہ اسی کا ہے۔ اس شخصیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ عشق و ہوس کے مختلف مراتب یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے ہیں اور قرآن حکیم نے ایک عجیب اسلوب بلاغت کے ساتھ انھیں ہر جگہ ابھارا ہے اور ہر مرتبہ کی خصوصیت واضح کر دی ہے۔

پہلا دور

سب سے پہلے وہ موقع سامنے آتا ہے۔ جب اس نے حضرت یوسفؑ کو دعوت عیش دی اور

---

[1] اور جو کوئی صبر سے کام لے اور معاف کر دے تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ [2] اے آسمان اور زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

ناکام رہی۔ ط لقد همت به و هم بها لو لا ان را برهان ربّه[1] (۲۴) اور جب پردہ فاش ہو گیا اور شوہر سامنے کھڑا نظر آیا تو اپنی ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی۔ جھٹ اپنا جرم دوسرے کے سر ڈال دیا اور پھر کس دوسرے کے سر؟ اسی کے سر جس کی محبت و شیفتگی کی مدعی بنی تھی: قالت ما جزاء من اراد باهلك سوء الا ان يسجن او عذاب اليم[2] (۲۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت کی ابھی کچی تھی اور ہوس سے معاملہ آگے نہیں بڑھا تھا کیونکہ اگر محبت کامل ہوتی تو محبت کی راہ میں ذلت و رسوائی سے نہ ڈرتی اور خود اپنے محبوب کے سر جھوٹا الزام نہ لگاتی۔

لیکن پھر جب کچھ دن گزر گئے تو معلوم ہوتا ہے اس حالت نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔ اب اسے لائمات کے سامنے تو اقرار محبت میں عار نہ آیا لیکن دنیا کے آگے اقرار نہ کر سکی: انا راودته عن نفسه فاستعصم[3] (۳۲) ساتھ ہی محبت ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی کہ اپنے نفس کی کامجوئیوں پر محبوب کی مرضی کو ترجیح دیتی؛

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است ‌ ‌ ‌ ‌ بہ حکم شوق تقاضا مکن کہ بے ادبی است

اس لیے دھمکیاں دے کر رام کرنا چاہا: و لئن لم يفعل ما امره ليسجنن وليكونا من الصّغرين[4] (۳۲)

آخری دور

لیکن پھر جب وہ وقت آیا کہ عشق کی خامیاں پختگی و کمال تک پہنچ گئیں، تو اب نہ تو ننگ و ناموس کی جھجک باقی رہی تھی، نہ زور و طاقت سے کام نکالنے کا گھمنڈ۔ جونہی سنا یوسف کے معاملہ کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے، بے پردہ اور صریح اعلان کر دیا: الئن حصحص الحق۔ انا راودته عن نفسه، وانه لمن الصّدقين[5] (۵۱) وہ تو سرتاسر سچا ہے جو کچھ بھی قصور تھا، میرا تھا۔[6]

---

[1] عورت یوسفؑ کے پیچھے پڑ چکی تھی۔ یوسفؑ بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا اگر اس کے پروردگار کی دلیل سامنے نہ آگئی ہوتی۔ [2] (بات بناتے ہوئے) بولی۔ جو آدمی تیرے اہل خانہ سے بری بات کا ارادہ کرے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے کیا یہی نہ ہونی چاہیے کہ اسے قید میں ڈالا جائے یا کوئی اور دردناک سزا دی جائے؛ [3] میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لانا چاہا مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔ [4] اگر اس نے میرا حکم نہ مانا تو وہ لازماً قید میں پڑے گا اور بے عزت ہوگا [5] عزیز کی بیوی بول اٹھی۔ وہ میں ہی تھی جس نے اس پر ڈورے ڈالے کہ وہ اپنا دل ہار بیٹھے بلاشبہ وہ بالکل سچا ہے [6] اس آیت کے بعد آیت ذالك ليعلم انى لم اخنه بالغيب الخ اور وما ابرئ نفسى الخ امراة العزيز کے قول کا بقیہ حصہ ہو سکتا ہے اور حضرت یوسفؑ کا قول بھی ہو سکتا ہے۔ سیاق بیان پہلی بات کے حق میں ہے اور بعض وجوہ و قرائن دوسری حق میں۔ عام طور پر مفسرین نے دوسری صورت اختیار کی ہے لیکن ہم نے پہلی کو ترجیح دی کیونکہ ظاہر سیاق یہی ہے۔

ہاں ، بانگ بلند ست ایں ، پوشیدہ نمی گویم

اب اقرار محبت میں نہ تو کسی طرح کا عار محسوس ہوتا تھا۔ نہ عشق کی ذلت و رسوائی رہی تھی ۔ اب تو ہر بات میں جو محبوب کی راہ میں پیش آئے ، محبوب ہی کی طرح محبوب ہو گئی تھی:

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ حبًا لذکرک فلیلمنی اللوم

محبت کی خامی و پختگی کے یہ مراتب قدرتی ہیں اور عام ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی آئے گی ، ان تینوں حالتوں میں سے کوئی حالت ضرور ہو گی :

خام بدم ، پختہ شدم ، سوختم

تاویل الاحادیث

حضرت یوسفؑ کے حالات میں جا بجا " تاویل الاحادیث " کا لفظ آیا ہے اور اس طرح آیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ ایک علم تھا جو اللہ نے انھیں سکھا دیا تھا۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ اس علم سے مقصود کون سا علم ہے ؟

عربی میں تاویل کے معنی کسی بات کے نتیجہ اور مآل کار کے ہیں اور باتوں کے مطلب و مقصد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ سورہ یونس کی آیت (۳۹) کے نوٹ میں اس کی تشریح گزر چکی ہے" احادیث " یعنی باتیں ۔ پس تاویل الاحادیث کا مطلب یہ ہوا کہ باتوں کا مطلب ، نتیجہ اور مآل بوجھ لینے کا علم یعنی انسان میں علم و بصیرت کی ایسی قوت کا پیدا ہو جانا کہ ہر بات کے مطلب اور مآل کا شناسا ہو جائے ۔ معاملات کی تہ تک پہنچ جانا ، امور و مہمات کے بھیدوں کے رمز شناس ہو جانا۔ ہر بات کی نبض پہچان لینی ، ہر واقعہ کا مطلب پا لینا ، کوئی بات کتنی ہی الجھی ہوئی ہو ، لیکن اس طرح سلجھا لینا کہ ساری باتوں کی کل ٹھیک بیٹھ جائے ۔

خاندانِ یوسفؑ کا ماحول

حضرت یوسفؑ کا ظہور کنعان کے صحرا میں ہوا تھا اور ایک ایسے خاندان میں جو پشتہا پشت سے صحرائی بدویانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیدائش سے لے کر عنفوان شباب تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی نہ تو کسی طرح کی خارجی تعلیم و تربیت کا موقع ملا۔ نہ شہری زندگی کے رسم و راہ سے آشنا ہو سکے۔ جب شہری زندگی سے آشنا نہ تھے تو ظاہر ہے ۔ اجتماعی زندگی کی تمدنی خصوصیات سے کیونکر باخبر ہو سکتے تھے؟ ملکی معاملات اور انتظامی مہمات کی تو ان کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑی ہو گی۔

بسا اوقات خاندان کے موروثی اثرات خارجی اثرات سے بے نیاز کر دیتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ کا خاندانی ورثہ نبوت تھا۔ شہر یاری و ملک داری نہ تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توطن کنعان کے بعد سے تو شہری زندگی کا علاقہ بھی یک قلم مفقود ہو گیا تھا۔

باتوں کا مطلب و مآل

باایں ہمہ جب گردشِ حوادث نے انھیں مصر جیسی متمدن سرزمین میں پہنچا دیا تو وہ نہ صرف اس کے نظم و نسق کے لیے سب سے بہتر حکمران ثابت ہوئے بلکہ ان کی کاردانی و حقایق فہمی نے مملکت کو اس کی سب سے بڑی ہولناک بربادی سے بچا لیا اور ان کے فضل و کمال کے آگے سب نے سر جھکایا۔ خود پادشاہِ وقت کو اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک ایسے شخص میں جو ابھی چند سال ہوئے، صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا تھا، یہ قوتِ علمی کیسے پیدا ہوگئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام معاملات و مہمات کی کل بٹھانے والا ہوگیا؟ یقیناً مبدءِ فیاض کے کرشمۂ فیضان سے۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے؟ علم "تاویل الاحادیث" کا سکھا دینا۔ اب جب کہ صناعی علوم کی تدوین اور فنی مصطلحات کی بناوٹوں نے ہمیں طرح طرح کی تعبیرات سکھادی ہیں۔ ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے مصطلحہ الفاظ بولیں گے لیکن قرآن کی زبان صناعی مصطلحات کی زبان نہیں۔ نہ علمی مصطلحات سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے ان ساری باتوں کے لیے ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادائے مطلب کا قدرتی اور سیدھا سیدھا اسلوب ہو سکتا ہے یعنی باتوں کے مطلب اور مآل پا لینے کا علم۔ تعلیم کی ساری کاوشیں، ترتیبِ ذہنی کی ساری محنتیں، تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں کس غرض سے ہوتی ہیں؟ اسی لیے کہ باتوں کا مطلب و مآل بوجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ علم و دانش کا تمام تر حاصل و مقصود کیا ہے؟ یہی کہ باتوں کی کل بٹھانی آجائے۔ جس مطلب کے لیے ہم نے بے شمار علمی اصطلاحیں بنالی ہیں، قرآن نے اسی کو بغیر پیچ و خم کے اس طرح کہہ دیا، جو ادائے مطلب کا ایک صاف اور قدرتی طریقہ ہو سکتا ہے اور یہ اس کی بلاغت کی معجزانہ خصوصیت ہے۔

خواب کی تعبیر کا معاملہ

چونکہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیریں بتلائی تھیں، اس لیے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینے کا علم تھا۔ بلاشبہ خواب کی بات بھی احادیث میں داخل ہے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک گوشہ اس کا یہ بھی تھا لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ براہِ راست علمِ تعبیرِ منام پر اس کا اطلاق ہوا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینا نبوت کے عام خصائص میں سے ہے اور ہر نبی وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خواب کی حقیقت معلوم کر لیتا ہے۔ خود حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کا خواب سنتے ہی حقیقت معلوم کر لی تھی اور حضرت دانیال اور عزرا وغیرہما کی سرگزشتیں ہمیں معلوم ہیں۔ پس اگر یہی بات مقصود ہوتی تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خصوصیت کے ساتھ تاویل الاحادیث کا ذکر کیا جاتا۔ یہ نبوت کے اعمال و خصائص میں سے تھا اور جب نبوت کا مقام مل رہا تھا تو لازمی طور پر اس طرح کی تمام باتوں کی قابلیت بھی مل رہی تھی لیکن

حضرت یعقوبؑ نے خواب سُن کر کہا: وکذالك یجتبیك ربك و یعلمك من تاویل الاحادیث، ویتم نعمتہ علیك وعلیٰ اٰل یعقوب کما اتمھا علیٰ ابویك من قبل یعنی اللہ تجھے برگزیدگی عطا فرمائے گا۔ تاویل الاحادیث کا علم سکھائے گا اور جس طرح تیرے بزرگوں پر اپنی نعمتیں پوری کرچکا ہے، اسی طرح تجھ پر اور آل یعقوبؑ پر بھی کرے گا۔ اس بیان میں برگزیدگی سے مقصود امتیاز اور تفوق ہے اور اتمام نعمت سے مقصود نبوت ہے۔ پس تاویل الاحادیث کی تعلیم سے مقصود کوئی تیسری چیز ہونی چاہیے۔ اگر تعبیر خواب ہی کی بات ہوتی تو وہ حصول نبوت کی بشارت میں آ گئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ الگ کر کے نہ دکھائی جاتی۔ علاوہ بریں ایک نبی کے لیے تعبیر خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اسے اللہ کا ایک خاص عطیہ قرار دیا جاتا۔

پھر اگر ان تینوں مقامات پر غور کیا جائے جہاں تاویل احادیث کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ عیاں ہو جاتی ہے لیکن اس کی تفصیل "البیان" میں ملے گی۔

عزیز مصر کا معاملہ بیوی کے ساتھ عزیز مصر کا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ مفسرین کے لیے ایک حیرت انگیز معاملہ رہا ہے اور بعض مجبور ہوئے ہیں کہ طرح طرح کی دور از کار توجیہیں کریں۔ وہ کہتے ہیں اس پر اپنی بیوی کی بدچلنی بالکل واضح ہو گئی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہ من کیدکن، ان کیدکن عظیم (۲۸) لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں، اس نے اس معاملہ کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دی کہ بیوی سے کہا: استغفری لذنبك - انك کنت من الخٰطئین (۲۹) پھر اسی طرح مختار و آزاد چھوڑ دیا جس طرح پہلے تھی چنانچہ شہر کی عورتوں کی دعوت، مجلس طرب کی آراستگی حضرت یوسفؑ کی طلبی، سب بعد کے واقعات ہیں۔ نیز اس کا اختیار و تصرف اس سے ظاہر ہے کہ قید کرنے کی دھمکی دیتی ہے اور اسے پورا کر کے دکھا دیتی ہے۔ گویا بیوی کی بدچلنی کوئی ایسی بات نہ تھی جو عزیز کو استغفری لذنبك کہنے سے زیادہ کسی سرزنش اور مخالفانہ اقدام پر آمادہ کرتی۔ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شریف اور معزز آدمی اس بارے میں اس قدر بے حس اور بے پروا واقع ہو؟

لیکن اگر مفسرین کے سامنے اس عہد کی مصری معاشرت کی تفصیلات ہوتیں تو اس معاملے پر انھیں کبھی استغراب نہ ہوتا۔ انھوں نے دو ڈھائی ہزار سال پیشتر کی مصری معاشرت اور اس کے اخلاقی احساسات کو اپنے وقتوں کی معاشرت و احساسات پر قیاس کیا اور اسی کے مطابق توجیہات کے جامے چھانٹنے لگے۔

مصر کی معاشرتی حالت اس بارے میں ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں،

ایک براہِ راست اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے دوسرا بعد کے عہدوں سے۔ پہلا اثریات مصر (ایجپٹیا...
سے ماخوذ ہے، دوسرا بعض یونانی تحریرات سے جو سنہ مسیحی سے کچھ عرصہ پیشتر لکھی گئی ہیں اور یہ دونوں...
اس بارے میں متفق ہیں کہ اس عہد کی مصری معاشرت کی حالت ٹھیک ٹھیک ویسی ہی تھی جس کی تصو...
اس موقع پر قرآن مجید نے کھینچ دی ہے یعنی امراء کے طبقے کی معاشرتی اور ازدواجی حالت عامۃ النا...
بالکل مختلف تھی۔ ان کی عورتیں اپنے اعمال و تصرف میں بالکل آزاد تھیں۔ مردوں کے دباؤ میں رہنا پس...
نہیں کرتی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں پلہ انہی کا بھاری رہتا۔ اخلاقی حیثیت سے معاملے نے ایسی صور...
اختیار کر لی تھی کہ عصمت و بے عصمتی کا معاملہ عملاً غیر اہم ہو گیا تھا۔ لوگ سب کچھ جانتے تھے پھر اسے ناگزیر حالت...
سمجھ کر برداشت کر لیا کرتے تھے۔ گویا اس اعتبار سے پندرہ سو سال قبل مسیح، مصری سوسائٹی کا حال...
ٹھیک ٹھیک ویسا ہی تھا جیسا ایک ہزار سال بعد رومۃ الکبریٰ کے دارالحکومت میں ہمیں دکھائی دیتا...
اور جس کا نمونہ خود جولیس سیزر کی بیویوں کی زندگی میں ہم دیکھ لے سکتے ہیں۔ انھیں شک و شبہ سے اس...
بالاتر کہا گیا تھا کہ شک و شبہ کا سب سے بڑا محل انہی کی زندگی تھی۔ دراصل یونان اور روم کا تمدن ...
بہت سی باتوں کی طرح اس بات میں بھی بابل اور مصر ہی کے نقشِ قدم پر چلا تھا۔

مصر کی یہ حالت برابر رہی۔ امراۃ العزیز کے عہد سے لے کر کلیوپیٹرا تک، وہ صرف نسوانی حسن و جما...
ہی میں نہیں بلکہ ازدواجی زندگیوں کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں بھی شہرۂ آفاق رہا۔

سرگزشت کی اندرونی شہادت خود اس سرگزشت میں بھی اس کی اندرونی شہادت موجود ہے...
عزیز پر جب معاملہ کھل گیا تو جو بات اس کی زبان پر بے اختیا...
آ گئی، غور کرو وہ کیا تھی؟ انه من کیدکن ان کیدکن عظیم (۲۸) ہاں معلوم ہو گیا کہ یہ تم عورتوں ...
چرتر ہے۔ تم لوگوں کے چرتر بڑے ہی چرتر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اس وقت عورتوں ...
نسبت سوسائٹی کے عام خیالات کیا تھے۔ اور کس طرح یہ بات دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مکر و فریب ...
طاق ہیں۔ ان کے فریب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس موقع ...
اس طرح کی بات بے اختیار عزیز کی زبان سے نکل جاتی۔ چرتر جو کچھ بھی کیا تھا، اس کی بیوی ...
کیا تھا۔ تمام عورتوں نے نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ وقت کی معاشرتی زندگی عام طور پر ایسی ہی ہو رہی ...
اس لیے جب ایک عورت کا معاملہ سامنے آیا تو بے اختیار زبان سے نکل گیا "تم سب کا یہی حال ہے
تمہارے مکر و فریب سے خدا کی پناہ!"

پھر بعد کو جو معاملہ پیش آیا، اس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بارے میں وقت کے نسوا...

ان کا معیار کیا تھا؟ شہر کی امیرزادیوں نے جونہی یہ خبر سُنی کہ ایک عبرانی غلام ایسا طرحدار ہے کہ امراۃ العزیز
ن دینے لگی ہے اور دل قابو میں نہیں آتا تو بے اختیار اس سے ملنے کی مشتاق ہو گئیں اور پھر جب مجلس
افت آراستہ ہوئی اور یوسفؑ بلائے گئے تو کوئی نہ تھا جس نے اپنی دلربائیوں اور شیوہ طرازیوں کے
ے باکانہ تیروں سے انھیں چھلنی نہ کر دینا چاہا ہو۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کی عورتوں کا اس طرح بے حجابانہ
ں کھیلنا اور بغیر کسی جھجک کے ایک پورے مجمع کا اظہار تعشق کرنا، جبھی ہو سکتا ہے جبکہ لکھنؤ کی اصطلاح
" شوقینی" وقت کا فیشن ہو گئی ہو اور شوقین عورتیں پوری طرح آزاد ہوں۔

پس عزیز کے طرز عمل کے لیے اس کے سوا اور کسی توجیہ کی ضرورت نہیں کہ مصر کے ایک امیر کا طرز عمل تھا اور
ے ایسا ہی ہونا تھا۔ اس نے بیوی کو ملامت کر دی کہ قصور تیرا ہی ہے۔ یوسفؑ سے کہا، اس بات کو اور آگے
عانا اور معاملہ ختم ہو گیا۔ اس سے زیادہ نہ تو وہ کچھ کر سکتا تھا اور نہ وقت کے احساسات متقاضی تھے کہ کرے۔

"ان کیدکن عظیم"

عزیز کے اس قول میں کہ "ان کیدکن عظیم" (۲۸) جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے نہ کہ دنیا جہان کی
عورتوں کے لیے۔ پھر جو کچھ بھی ہے، عزیز کا قول ہے خود قرآن کا حکم نہیں لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس
ر کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لیے یہ قرآن کا فیصلہ ہے اور اس کے
ں عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکار اور بے عصمتی کی گھاتیں لگانے میں زیادہ ہشیار ہے۔
عام طور پر ہمارے مفسروں نے اس کا ایسا ہی مطلب قرار دیا ہے پھر حسب عادت وجوہ و مباحث کی
دراز وادیوں میں گم ہو گئے ہیں۔ پہلے اسے عورتوں کی جنس کی نسبت قرآن کا عام و مطلق حکم قرار دیتے ہیں۔
یرانی میں پڑتے ہیں کہ شیطان کے کید کو تو ضعیف کہا ہے؛ ان کید الشیطن کان ضعیفا۔ عورتوں کا کید
ے عظیم ہو گیا؛ پھر توجیہوں کی وادیوں میں قدم اٹھاتے ہیں اور جہاں تک نکل جا سکتے ہیں، نکل جاتے ہیں۔
دل کو ماننا پڑتا ہے کہ شیطان کے کید سے عورتوں کا کید بڑا ہے کیونکہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے۔
وں کی دقیقہ سنجی اس پر مطمئن نہیں ہوتی وہ کہتے ہیں نہیں، علی الاطلاق نہیں ہو سکتا، صرف جنسی تعلقات کے
الہ ہے۔ اس میدان میں مردان سے بازی نہیں لے جا سکتے۔ حالانکہ نہ تو قرآن کا یہ حکم ہے۔ نہ عزیز کا قول
ے محل میں ہے کہ اطلاق و عموم کے یہ سوالات پیدا ہوں۔ بحث و تفسیر کی یہ پوری عمارت بنیاد سے لے کر
ی تک بالکل بے اصل ہے۔

ردادر عورت کی مساوات

بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خودغرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں، اس نے

ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نسا میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کردی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کیلئے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا و للنساء نصیبٌ مما اکتسبن واسئلوا اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شیءٍ علیما[1] (النسا: ۳۲) چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے، اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے اور جس طرح بدعمل مردوں کی برائیاں بتلائی ہیں اسی طرح بدعمل عورتوں کی بھی بتلائی ہیں۔ کہیں بھی دونوں میں کسی طرح کا امتیاز اس نے جائز نہیں رکھا ہے مردوں کے لیے اگر فرمایا: التائبون ، العابدون ، الحامدون ، السائحون ۔ الراکعون ، الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر ، والحافظون لحدود اللہ[2] (توبہ: ۱۱۲) تو عورتوں کیلئے بھی فرمایا: مسلمات ، مومنات ، قانتات ، تائبات ، عابدات ، سائحات[3] (تحریم: ۵)۔ منافقوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں جنسوں کا کیا: المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یامرون بالمنکر و ینھون عن المعروف[4] (توبہ: ۶۷) مومنوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں دونوں کا کیا والمومنین والمؤمنٰت بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر[5] (توبہ: ۷۱) مردوں اور عورتوں کی یہ اخلاقی مساوات اس کا عام اسلوب ہے۔ ہر جگہ تم دیکھو گے کہ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا، ایک ہی درجہ میں رکھتا اور ایک ہی طرح پر ذکر و خطاب کرتا ہے: ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات ، والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات ، والصابرین والصابرات

---

[1] مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور چاہیے ہر حال میں اللہ کی بخشایش کے طلبگار رہو اور یقیناً وہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے [2] (ان لوگوں کے اوصاف و اعمال کا یہ حال ہے کہ) اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ [3] مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار عورتیں، توبہ کرنے والی عورتیں، عبادت کرنے والی عورتیں، سیر و سیاحت کرنے والی عورتیں [4] منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم جنس برائی کا حکم دیتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔ [5] مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و کارساز ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں۔

والخاشعین والخاشعات، والمتصدقین والمتصدقات، والصائمین والصائمات، و
الحافظین فروجھم والحافظات، والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات، اعد اللہ لھم مغفرۃ
واجرا عظیما (احزاب: ۳۵) یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی مسلمہ و مومنہ ہیں۔
جس طرح مردوں میں قانت مرد ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی قانتہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق
ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بکثرت
اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بکثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔
پھر جس طرح مردوں میں ایسے پاکباز ہیں کہ نفسانی خواہشوں کے غلبے سے اپنی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح
عورتوں میں بھی ایسی پاکباز ہستیاں ہیں جو اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ غور کرو کسی وصف میں بھی
تفریق نہیں۔ کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں بھی عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس
قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی
جنس مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بداخلاق ہے؛ اور مرد بڑے پاکباز ہوتے ہیں مگر بدبخت عورتیں ہیں جو
نفس پرست اور مکار ہیں۔ تفسیر قرآن کی تاریخ کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک مصری بت پرست کے قول کو
اللہ کا فرمان سمجھ لیا گیا اور اس سے اس طرح استدلال کیا جا رہا ہے گویا عورتوں کی جنسی پستی و بداخلاقی کے لیے
رب اللہ کا قطعی فیصلہ موجود ہے۔

مرد کی ذمہ داریاں

حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی
کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصے میں
آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لیے ثابت ہوگی۔ یہ مرد وہی ہے جس کی
حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گزرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے اسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنا دے۔ اس لیے
وہ کید عظیم کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے۔
پھر جب وہ اس کے پیچھے قدم اٹھا دیتی ہے تو اس سے گردن موڑ لیتا ہے اور کہنے لگتا ہے اس کا کید تو سب سے
بڑا کید اور اس کی برائی تو سب سے بڑی برائی ہے۔ فی الحقیقت تو سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے
جو پہلے اسے اپنی کامجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس
معصوم کے سر ڈال دیتا ہے۔

دنیا میں کوئی عورت بری نہ ہوتی اگر مرد اسے برا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ عورت کی برائی کتنی ہی سخت اور
کتنی ہی صورت میں نمایاں ہوتی ہو لیکن اگر جستجو کرو گے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا۔ اور اگر اس کا

ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

تورات سے غلط تاثر

تورات میں ہے کہ شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی اس لیے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھی راہ سے بھٹکانے والی ہے لیکن قرآن نے اس قصہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی بلکہ ہر جگہ اس معاملے کو آدم اور حوا دونوں کی طرف منسوب کیا۔ انھیں جو حکم دیا گیا تھا وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے لیے تھا ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین[1] (بقرہ: ۳۵) اور لغزش بھی ہوئی تو ایک ہی طرح دونوں سے ہوئی: فازلھما الشیطٰن عنھا، فاخرجھما مما کان فیہ (بقرہ: ۳۶) شیطان نے دونوں کے قدم ڈگمگا دیے اور دونوں کے نکلنے کا باعث ہوا یعنی جو لغزش ہوئی اس میں یکساں طور پر دونوں کا حصہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ ذمہ داری ہو۔

بہرحال یہ بات یاد رہے کہ سورۂ یوسف کی اس آیت سے جو استدلال کیا جا رہا ہے وہ قطعاً بے اصل ہے اور جہاں تک عورتوں کے جنسی اخلاق کا تعلق ہے، قرآن میں کہیں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے فروتر ہے یا بے عصمتی کی راہوں میں زیادہ مکار اور شاطر ہے۔

امراۃ العزیز کا نام

تورات میں ہے کہ مصر کے جس امیر نے حضرت یوسفؑ کو خریدا تھا اس کا نام فوطی فار تھا (پیدائش ۳۷: ۳۶) لیکن اس کی بیوی کا نام نہیں لکھا۔ نہیں معلوم ہمارے مفسرین نے کہاں سے یہ بات معلوم کر لی کہ اس کا نام زلیخا[2] تھا؟ بہرحال اس کی کوئی قابل اعتماد اصلیت پائی نہیں جاتی۔ البتہ مفسرین کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ اس وقت مصر کا حکمران خاندان عمالقہ میں سے تھا۔ یہ عمالقہ وہی ہیں جنھیں مصر کی تاریخ میں ہیکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور جن کی اصلیت یہ بتائی گئی ہے کہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ یہ چرواہوں کی قوم مصر میں کہاں سے آئی تھی؟ جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب سے آئی تھی اور یہ دراصل عربی قبائل عاربہ ہی کی ایک شاخ تھی۔ قدیم قبطی اور عبرانی زبان کی مشابہت ان کے عرب ہونے کی ایک مزید دلیل ہے۔

حضرت یوسفؑ کا انتقال

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف زندگی بھر مصر کے حکمران مختار رہے اور جب ان کا آخری وقت آیا تو اپنے بھائیوں اور اپنے

---

[1] وہ جو درخت ہے اس کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اگر اس کے پاس گئے تو ظالموں میں سے گنے جاؤ گے۔ [2] یہ نام تالمود میں آیا ہے۔

...لاد سے کہا "ایک وقت آئے گا جب خدا تمھیں پھر اسی زمین کنعان میں لے جائے گا جس کا ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ سے اس نے وعدہ کیا ہے تو جب بھی وُہ وقت آئے تم میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا اور میرے بزرگوں کے پاس دفن کر دینا" چنانچہ ان کے خاندان کے لوگوں نے ان کی نعش میں خوشبُو بھری اور ایک صندوق میں محفوظ کر دی۔ (پیدائش ۵۰ : ۲۴)

خوشبو بھرنے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ مصریوں کے طریقہ کے مطابق ممی کر کے رکھی گئی تھی۔ جب ...ار سو برس بعد حضرت موسٰی علیہ السلام کا ظہور ہُوا اور وُہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے تو انھوں نے حضرت یوُسفؑ کی نعش بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ اس طرح حضرت یوسفؑ کی وصیت کی تعمیل ظہور میں آگئی۔

سورۂ یوسف کے بصائر و حکم کی طرح اس کے مباحث و مسائل کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے لیکن مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

حضرت موسیٰؑ

باب ۲۷

حضرت موسیٰؑ اور فرعون

(۱)

دنیا پر یکے بعد دیگرے ہمیشہ متضاد قوتوں نے حکومت کی ہے ، رات کے جانے کے بعد ہمیشہ دن جلوہ گر ہُوا ہے ، تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی چمکی ہے ، سیاہی کے بعد ہمیشہ سفیدی نے ظہور کیا ہے۔ یہی حال حکومتوں اور سلطنتوں کا بھی ہے۔ جب ایک ظالم حکومت مٹتی ہے تو اس کی جگہ اسی وقت ایک عادل سلطنت قایم ہوجاتی ہے۔ ظالم کا جانا ہی عدل کے ظہور کا پیام ہے اور رات اگر ختم ہوگئی ہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ دن آگیا۔

جب جابرانہ قوموں کی قوت فنا ہوجاتی ہے تو ایک عادلانہ نظام قایم ہوجاتا ہے۔ فرعون کی جابرانہ سلطنت کا زوال ایک دوسری قوم کی عادلانہ حکومت کا مقصد تھا۔ اس لیے خدا نے فرعونیوں کی ہلاکت کے ساتھ ہی عدل الٰہی کے قیام کا مژدہ سنایا:

و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین و نمکن لھم فی الارض و نری فرعون و ھامان و جنودھما منھم ما کانوا یحذرون۔ (القصص: ۵)

اور ہم اپنے دائمی قانون عدل کی بنا پر چاہتے ہیں کہ جو لوگ ہماری زمین میں کمزور بنا کر ایک مدت تک رکھے گئے ہیں ، ان پر احسان کریں اور ان کو دنیا کی پیشوائی عطا فرمائیں۔ بڑی بڑی طاقت ور قوموں کے تاج و تخت کے وہی وارث ہوں اور ان کی بادشاہت زمین پر قایم ہوجائے۔ فرعون ، ہامان اور ان کی حکمران قوم کو ان کی طرف سے جس چیز کا کھٹکا تھا اور جس کے لیے وہ انھیں کمزور رکھتے تھے ، وہی ان کے سامنے لائیں گے۔

انقلاب قوت و ضعف

یہ تو سلطنت فرعونی کے انقلاب کی سرگزشت تھی لیکن غور کرو کہ اس آیہ کریمہ کے اندر قرآن حکیم نے کس طرح اپنے ایک قانون الٰہی کی خبر دی ہے ؛ وہ بتلاتا ہے کہ دنیا قوت کے جاہ و جلال کی نمایش گاہ ہے اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل ہے۔ طاقتور قومیں کمزوروں کو غلام و محکوم بناتی ہیں۔ ان میں پھوٹ ڈال کر باہم ملنے نہیں دیتیں کیونکہ اگر وہ مل کر ایک ہوجائیں تو کمزور نہ رہیں اور اتفاق و یگانگی کی طاقت اعلیٰ ظالموں کا تاج و تخت الٹ دے۔ یہی حال مصر میں بنو اسرائیل کا تھا ، لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کا ایک استثنائی قانون بھی ہے اور خدا کے زبردست ہاتھ کی گاہ گاہ چمک جانے والی حرکت بھی ہوتی ہے۔ جب ظلم اور طاقت کے شیطان کا غرور حد سے بڑھ جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا

طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنا دی جاتی ہے اور وہی زمین جو کمزوروں کے لیے قتل گاہ تھی طاقت والوں کی تباہی و ہلاکت کی تماشاگاہ بن جاتی ہے۔ پس اس دن چھوٹے بڑے کیے جاتے ہیں اور بڑوں کو چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ وہ کہ کمزور کر دیے گئے تھے، وہ کہ بیکس و بے نوا تھے، وہ کہ صرف رونے، ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے اور لٹنے لٹانے کے لیے تھے، وقت آتا ہے کہ احسان الٰہی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں اور کمزوری کی جگہ طاقت کے لیے، بیکسی کی جگہ فرمانروائی کے لیے، رونے کی جگہ خوشیوں کے لیے، ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لیے اور لٹنے کی جگہ لوٹنے کے لیے تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوت فرعونی کی جگہ قوت موسوی کی تلوار آن کی آن میں دنیا کو پلٹ دیتی ہے اور صدیوں کی گری ہوئی قوموں میں پھر جاہ و جلال ربانی کے ظہور و قیام کے لیے دنیا کی وارث و خلیفہ بنا دی جاتی ہے۔

تربیت عسکری

لیکن جس طرح تلوار کی آخری حرکت کسی سلطنت کی شہ رگ کاٹ دیتی ہے اسی طرح اس کی پہلی جنبش نظامِ حکومت بھی قایم کر دیتی ہے۔ حکومت سیاست کا سرچشمہ ہے اور سیاست کی پیاس ہمیشہ تلوار ہی کے پانی سے بجھتی ہے۔ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا تاج و تخت الٹنے اور بنو اسرائیل کی حکومت قایم کرنے کے لیے ایک تیغ برہنہ کی صورت میں نمایاں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے دیکھو، کس طرح ان کو بچپن ہی سے میدانِ جنگ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنایا اور طرح طرح کی آزمایشوں میں ڈال دیا؟ ابھی انھوں نے دنیا میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ماں کی آغوشِ محبت سے جدا ہو گئے جس آغوشِ محبت سے زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی محروم نہیں رہتے، اللہ کی معلمانہ مشیت نے اپنے رسول اولوالعزم کو اس سے محروم کر دیا۔ دریاے نیل کی طوفان خیز موجوں کی آغوش میں انھیں ڈال دیا گیا کہ ایک دن دریا کے طوفان ہی میں سے ان کو اپنی راہ نکالنی تھی۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (القصص: ۷)

(اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلائے اور اگر فرعون کے ظلم کی وجہ سے اس کی جان کا خوف ہو تو دریا میں ڈال دے اور کسی قسم کا خوف یا غم نہ کرے ہم پھر اس کی گود میں اس کے لختِ جگر کو واپس کر دیں گے اور اس کو اپنا پیغمبر بنائیں گے۔)

حضرت موسیٰ کی والدہ نے اپنے لختِ جگر کو دریا کی لہروں کی آغوش میں ڈال دیا لیکن نیل کی لہریں اس امانت مقدس کو اور کہیں نہیں لے گئیں اسی کے محل تک بحفاظت پہنچا دیا، جس کے سرِ غرور کو کچلنے کے لیے ایک دن یہ شیر خوار بچہ اٹھنے والا تھا۔ پھر محل فرعونی کی عورتوں کو ان پر مہربان کر دیا، انھوں نے اپنے بچوں کی

طرح خاص شاہی محل کے اندر پرورش کی اور ان کی والدہ ہی ان کی دایہ قرار پائیں) اس میں اللہ کی بڑی مصلحت تھی کہ حضرت موسیٰؑ کی پرورش شاہی محل میں ہوگئی تو بادشاہوں کے جاہ و جلال کا رعب اُن کے دل سے نکل جائے گا اور بچپن ہی سے شاہانہ زندگی، سیاست و ملک داری کے طریقے اور ظالمانہ حکومتوں کے تمام اسرار و خفایا ان پر منکشف ہوجائیں گے:

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝
(القصص: ۸)

(پھر اس کو آل فرعون نے دریا سے نکال لیا اور اس بچے کی پرورش کی تاکہ آگے چل کر وہ ان کا دشمن اور سرمایۂ رنج و غم بنے) بے شک فرعون، ہامان اور ان کا لشکر غلطی پر تھا جبکہ اپنے دشمن کو اپنے گھر کے اندر پال رہا تھا۔

آغاز کار اس کے بعد آزمایش و ابتلاء کے متعدد واقعات پیش آئے۔ انھوں نے ایک ظالم کو عین حالتِ ظلم میں قتل کر دیا۔

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝
(القصص: ۱۵)

اور جب کہ تمام لوگ غافل تھے موسیٰ شہر میں آئے اور اس میں دو آدمیوں کو جھگڑتے دیکھا۔ ان میں ایک آدمی ان کی قوم کا تھا اور دوسرا ان کے دشمن کے گروہ کا۔ موسیٰ کو دیکھ کر ان کی قوم کے آدمی نے دشمن کے ظلم کی فریاد کی اور موسیٰ نے اس کو ایک ایسا گھونسا مارا کہ وہ مرگیا۔ یہ حال دیکھ کر وہ گھبرائے کہ شیطان نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ بے شک شیطان گمراہ کن دشمن ہے۔ اب خدا نے ظلم و فساد اور انسانی عبودیت و غلامی کی سرزمین سے ان کو دور کرنا چاہا۔

کیونکہ ضرورت تھی کہ وہ کسی آزاد مقام پر رہ کر آنے والے وقت کے لیے تیار ہوجائیں پس وہ نکلے اور ایک طرف خدا کی رہنمائی کے سہارے چل کھڑے ہوئے:

وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝
(القصص: ۲۲)

(جب موسیٰ مصر سے نکل کر مدین کی طرف روانہ ہوئے تو کہا کہ خدا مجھ کو ضرور سیدھا راستہ دکھائے گا۔)

درسگاہ مدین خدا نے ان کی رہنمائی کی اور بخطِ مستقیم ان کو اپنے ایک صالح بندے کی آغوش تربیت میں ڈال دیا۔ وہاں انھوں نے کامل آٹھ سال تک آزادی کی ہوا میں اپنے جذبات حقہ

اور قوائے صالحہ کو نشوونما دی۔ پھر جب پلٹے تو فرعون کا تاج و تخت اُلٹنے کے لیے تمام ساز و سامان نصرۃ سے مسلح تھے ؎

وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ؕ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (القصص: ۳۱-۳۲)

اور ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پھینک دو۔ موسیٰ نے اپنے ہاتھ سے عصا پھینک دیا لیکن جب دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پھر اس طرف رُخ نہ کیا۔ ہم نے کہا اے موسیٰ آگے بڑھو، مطلق خوف نہ کھاؤ، تم محفوظ رہو گے، پھر ہم نے حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا۔ تمہارے خدا کی طرف سے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لیے یہ دو نشانیاں دی گئی ہیں۔

سپہ سالار جنگ

فوج کی تنظیم و تربیت کے لیے جس سپہ سالار کی ضرورت تھی وہ تمام آلات حرب سے مسلح ہوگیا لیکن وُہ جن لوگوں سے اپنی فوج مرتب کرنا چاہتا تھا، وُہ خود گرفتار زندان مصیبت تھے۔ اس لیے اس نے اپنا پہلا مطالبہ جو فرعونی گورنمنٹ سے کیا، وُہ اسی فوج کی رہائی کا مطالبہ تھا ؎

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ (الدخان: ۱۸)

(خدا کے ان بندوں کو میرے حوالے کردو، میں تمہارے پاس ایک امانت دار پیغمبر بن کے آیا ہوں)

داخلی تبلیغ

لیکن فرعون نے جیسا کہ تمام ظالم بادشاہوں کا طریقہ ہے، اس الٰہی مطالبے کو رد کر دیا۔ پس ضرور ہُوا کہ اب کچھ دنوں تک مصر ہی میں رہ کر بنو اسرائیل کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صدیوں کی محکومی و غلامی نے جس درجہ ان کے فوجی قویٰ کو معطل کر دیا تھا، اسی درجہ کی قوی و موثر تعلیم کے ذریعے ان میں حریت و استقلال کے عزائم پیدا کیے جائیں۔ پس حکم الٰہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت کی داخلی تبلیغ میں مشغول ہو گئے اور بنی اسرائیل کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس تیاری کا طریقہ اور اس کے اصول جو قرآن کریم نے بتلائے ہیں، ہم کسی دوسری صحبت میں اُن کی طرف متوجہ ہوں گے۔

پہلی فوجی نمائش

جب ایک اچھی مدت اس پر گزر گئی تو حکم الٰہی ہُوا کہ اب وقت آگیا کہ اس تیار کردہ

فوج کی حرکت شروع ہو جائے۔ پس پہلی منزل یہ ہے کہ فرعونی گورنمنٹ کے ساز و سامان اور احکام و قوانین کی بالکل پروا نہ کرو۔ وہ بنو اسرائیل کو اپنی غلامی سے نکلنے نہیں دیتی مگر تم بنو اسرائیل کو ساتھ لے کر راتوں رات نکل کھڑے ہو۔ تمھارا تعاقب کیا جائے گا مگر عذابِ الٰہی بھی اس کے تعاقب سے غفلت نہیں کرے گا:

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿﴾ (الدخان: ۲۳) (میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ، کیونکہ تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔)

انھوں نے حکم الٰہی کی تعمیل کی اور اس طرح فوج کے لیے جس اجتماع و انضمام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا قوام تیار ہو گیا۔

روحِ عسکری

لیکن فوج صرف آدمیوں کی اس صف ہی کا نام نہیں جو میدانِ جنگ میں دیوار کی طرح کھڑی کر دی جاتی ہے، بلکہ جس طرح دنیا کی ہر حقیقت مادہ قوت سے مرکب ہے، اسی طرح فوج بھی جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ رُوح تلواروں کے چمکتے ہُوئے جوہر میں نہیں مل سکتی۔ اس کا آشیانہ شہسواروں کے خود میں نہیں وہ حلقہ دار زرہ کے جال میں مُرغ رشتہ بپا کی طرح گرفتار نہیں۔ اس نے ان قیود سے آزاد ہو کر صرف سپاہی کے دل ہی کو گھر بنایا ہے۔ اسی گوشے میں اس کی معجزانہ طاقت کی کارفرمائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ فوج کی تعداد میں کمی بیشی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک سو اور ایک ہزار کے اضافہ سے اس کی حقیقت بدل نہیں جاتی۔ سامانِ جنگ کے عدم و وجود کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ چاہے تو ایک انسان کے اندر چمک کر کے اُسے ایک ہزار انسانوں پر غالب کر دے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (انفال: ۶۵)

اے پیغمبر مسلمانوں کو جہاد کے لیے اُبھار دو، اگر تم میں بیس آدمی بھی صابر ہوں گے تو وہ دو سو دشمن پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سو آدمی بھی صبر کی طاقت رکھتے ہوں گے تو کفار کی ایک ہزار جمعیت پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔

عزم و استقلال اور صبر و توکل کی طاقت صرف افراد کی کثرت سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کو آزادی کی زندگی ہی پیدا کرتی ہے جو قوائے انسانی کی نشو و نما کی فطرتی تربیت گاہ ہے۔

لیکن آزادی ایک ایسا جوہر ہے جو کبھی تو اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ ہر ریگستان کے چمکتے ہُوئے ذرّے میں سے مل سکتا ہے اور کبھی اس قدر گراں ہو جاتا ہے کہ صرف تاجِ شاہی کے ٹکے ہُوئے موتیوں ہی میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس فوج کی تعلیم و تربیت کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہُوئے تھے۔ اس کے

اندر یہ جوہر یک قلم مفقود ہو گیا تھا۔ فرعون کی غلامی نے اس کے تمام شریفانہ جذبات فنا کر دیے تھے، اس نے کبھی حکومت کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کی طاقت نے مومنین بالغیب کا ایک چھوٹا سا گروہ ضرور پیدا کر دیا جس نے حریت صادقہ کی رُوح سے معمور ہو کر فرعون کو للکارا تھا:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ (طٰہٰ: ۷۲)	جو حکم چاہو ہمارے لیے دو، تمہاری حکومت زیادہ سے زیادہ اس دنیوی زندگی ہی کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ ہمیں قتل کر دو، اس سے زیادہ تم اور کیا کر سکتے ہو؟

لیکن یہ بھی صرف نور ایمان کی ایک جدید رُوح کی صدا تھی جس نے غلاموں کے ملک میں حریت حقہ کا غلغلہ بلند کر کے ایک نمونہ قایم کر دیا ورنہ بنو اسرائیل کے حلق سے کبھی اس طرح کی صدائیں بلند نہیں ہو سکتی تھیں۔

جہاد فی سبیل اللہ سے اعراض

پس اس بنا پر بنو اسرائیل کی فوجی تعلیم و تربیت کے لیے وہی قدرتی مرکز موزوں تھا، جہاں انسان نے سب سے پہلے آزادی کی ہوا کھائی یعنی آبادیوں اور بستیوں سے الگ کوہ، صحرا اور میدان، جہاں نہ کسی کی حکومت ہو، نہ کسی انسان کا حکم، آزاد چیزوں کے غول ہوں اور خود مختار پرندوں کے جھنڈ، اسی کائنات فطری و حقیقی میں رہ کر وہ اپنی گم شدہ حریت کو تلاش کر سکتے تھے جو مصر کی آبادیوں میں کھو گئی تھی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اُنہے والے جاہ و جلال و عظمت کو یاد دلا کر اُن کے جذبۂ شجاعت کو تازہ کرنا چاہا:

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ڰ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۰ - ۲۱)	جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے لوگو! خدا کی نعمتوں کو دیکھو اس نے تم میں پیغمبر پیدا کیے تھے اب تم کو بادشاہ بنانا ہے اور وہ عظمت عطا فرمانا ہے جو اب تک کسی کو بھی نہ دی تھی، پس عزم اور ہمت کرو اور ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ، اس کی حکومت صرف تمہاری ہی قسمت میں لکھی گئی اور ہرگز بزدلوں کی طرح پیٹھ نہ پھیرو۔ اس کا نتیجہ بجز ناکامی و محرومی کے کچھ نہ ہو گا۔

لیکن یہ امتحان ایک ایسی قوم کے لیے سُود مند نہ ہو سکا، جو صدیوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار تھی۔ بنو اسرائیل کی بزدلی نے نہایت مایوسانہ جواب دیا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ڰ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ	اُن لوگوں نے جواب دیا کہ اے موسیٰ، ارضِ مقدس میں ایک نہایت ہیبت ناک قوم رہتی ہے۔ ہم اس میں ہرگز داخل

يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (مائدہ: ۲۲)

نہیں ہو سکتے، وہ اپنے ساز و سامان اور طاقت سے ہمیں پیس ڈالیں گے جب تک کہ وہ ملک سے خود بخود نہ ہٹ جائیں ہم اس کا رُخ نہ کریں گے۔

اس داخلہ سے محض شاہی جاہ و جلال کا منظر دکھانا مقصود نہ تھا بلکہ بنو اسرائیل کی قدیم کھوئی ہوئی عظمت کو خلافت الٰہی کی صورت میں قایم کرنا تھا اور خلافت الٰہی کے قایم کرنے کے لیے جس قسم کی شجاعت درکار ہوتی ہے اسے صرف نورِ ایمان ہی قایم کر سکتا تھا۔ بنو اسرائیل کے دل اس کی حرارت سے خالی تھے۔ دو مخلص مومنوں نے اپنے نورِ ایمان کی حرارت سے ان کے دلوں کو گرمانا چاہا:

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۳)

جو لوگ بیت المقدس میں داخل ہونے سے ڈر رہے تھے۔ انھیں میں سے دو آدمیوں نے جن پر خدا نے نورِ ایمان کے ذریعے سے احسان کیا تھا کہا، جہاد فی سبیل اللہ سے انکار نہ کرو اور اللہ پر اعتماد کر کے ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ، جب اس کے اندر داخل ہو جاؤ گے تو تم یقیناً غالب ہو گے، اگر تم مسلمان ہو تو خدا پر بھروسا کرو۔

لیکن اس پر بھی ان کے دلوں میں حرارت پیدا نہ ہوئی اور انھوں نے صاف جواب دے دیا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (مائدہ: ۲۴)

ان لوگوں نے کہا: اے موسیٰ جب تک وہ طاقتور لوگ اس شہر میں ہیں ہم اس شہر میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے خدا کے ساتھ جا کر لڑو، ہم اس جگہ پر بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔

چہل سالہ قیام صحرا

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالکل مایوسی ہو گئی اور انھوں نے اس بزدل قوم سے علیحدہ ہونا چاہا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا:

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَ اَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۵)

خداوندا! میں صرف اپنے وجود اور اپنے بھائی ہی پر اختیار رکھتا ہوں۔ اپنی قوم کی بزدلی اور روحانی موت کو دیکھ کر اب مجھ میں اور اس بدکار قوم میں علیحدگی کر دے۔

لیکن حکم الٰہی ہوا کہ اے موسیٰؑ! تم مایوسی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہو تمھاری پیغمبرانہ استقامت کی طاقت کو ان مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ بنی اسرائیل کو مدتوں کی غلامی نے جہاد فی سبیل اللہ کے مقدس راہ سے ناآشنا

کر دیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی راحتوں کے عاشق ہیں۔ بڑے مقصد کی راہ میں مصیبت اٹھانے سے جی چراتے
غلامی کی زندگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ پس اس سے نہ گھبراؤ اور انھیں یہاں سے نکال کر کسی آزاد و بے قید صحرا
جا بساؤ۔ وہاں کی خالص اور فطری آب و ہوا میں ایک زمانہ بسر کریں۔ عہد غلامی کی پرورش یافتہ نسل مٹ جا
ایک نئی مستعد نسل پیدا ہو پھر وُہ راہِ جہاد کی مشکلات کو برداشت کر سکے گی۔ خدا نے کہا،

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۶)

بیت المقدس کا داخلہ ان کے لیے چالیس سال تک حرام
اب اس سرزمین میں وہ سرگرداں رہیں گے۔ حصول عظمت
یہ چہل سالہ تاخیر انھیں کی بزدلی کا نتیجہ ہے۔ پس ایسے
کی محرومی پر تمھیں افسوس نہیں کرنا چاہیے۔

باب ۲

حضرت موسیٰؑ اور فرعون

(۲)

دنیا کی ترقی کے ساتھ قوانین فطرت نے بھی ترقی کی ہے اور اس ترقی کی حرکت نہایت عجیب وغریب ہے۔ دنیا کی ہر چیز ترقی کرتی ہے تو بڑھتی ہے، اُبھرتی ہے، پھیلتی ہے، لیکن قوانین فطرت کی نشوونما اُس کے بالکل برعکس ہوئی۔ انھوں نے ترقی کی تو سکڑنا شروع کیا، اور سمٹ کر انسان کے گرد جمع ہو گئے۔ وُہ پہلے خاک کے ذرات میں ملے ہُوئے تھے، ہوا کے اجزا میں بکھرے ہُوئے تھے، پانی کی موجوں کے ساتھ تیرتے پھرتے تھے۔ اس لیے جب کوئی قوم نظامِ عدل کی خلاف ورزی کرتی تھی تو خاک کے تودوں، ہوا کے جھونکوں اور دریا کی لہروں کے اندر ہیجان پیدا ہوتا تھا اور وُہ زمین کی زلزلہ انگیز حرکت، ہوا کے قیامت خیز تموج اور سمندر کی طوفانی لہروں کی صورت میں نمودار کر کے پیس ڈالتے تھے۔ اڑائے جاتے تھے، بہا کر ساحل عدم تک پہنچا دیتے تھے، لیکن اب انھوں نے صرف انسان ہی کے دل و دماغ کو اپنا نشیمن بنایا کہ وہ تمام مظاہر فطرت کا مجموعہ تھا۔ پس اب ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھ صرف انسان ہی کے سر پر آ گیا جسے آسمان و زمین نے گھبرا کر اپنے کندھے سے پھینک دیا تھا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (احزاب: ۷۲)	ہم نے اپنی امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے، لیکن انسان آگے بڑھا اور اس بوجھ کو اٹھا لیا۔ بلاشبہ ایسا کر کے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور بڑی ہی نادانستگی کی۔

انبیاء کرام کا ظہور اسی ترقی کی مکمل صورت تھی، لیکن آغاز فطرت سے انسانی قوت نے جو بے راہ روی اختیار کی تھی، اب وہ اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ چکی تھی اور انبیاء علیہم السلام نے زبانی وعظ صلاح و فلاح اور ہدایت و ارشاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا، وُہ دنیا کے لیے کافی نہ تھا۔ اب دنیا قوت کے نشے میں بالکل چُور ہو گئی تھی اور ایسی حالت میں اس کا مقابلہ صرف قوت ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ انسان پر فطرت نے جو ذمہ داریاں عاید کر دی تھیں، تمدن کی ترقی اور جذبات و عواطف کی رقت لطافت نے ان کے احساس کو اور بھی سریع الاشتعال بنا دیا تھا۔ اس لیے قلب کی یہ حرکت ہاتھ پاؤں میں بھی جنبش پیدا کرنا چاہتی تھی اور انسان زبان کے ساتھ ہاتھ سے بھی کام لینا چاہتا تھا۔

پہلا آتشکدہ اس آتشکدے کی آگ سب سے پہلے مصر کی سرزمین میں بھڑکی، جسے فراعنہ نے ظلم و جور،

اُسے عدوان اور تمرّد و طغیان کی جولان گاہ بنا دیا تھا۔ جہاں ایک قوم کے ساتھ غلامی کی حالت میں جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ غلامی کی لعنت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں تھیں اور انسانی حکومت کی پرستش کا داغ پیشانی پر، یہ ظالمانہ طرزِ عمل صرف فرعون کے قصرِ شاہی تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس کا نظارہ ہر گلی کوچے میں نظر آتا تھا۔ حاکم قوم اپنی قوی حکومت کے گھمنڈ میں بنی اسرائیل کے ہر فرد کو اپنا زرخرید غلام سمجھتی تھی اور اس کو یقین تھا کہ سرزمین کنعان کا مہجور گلہ صرف اسی لیے ہیں دیا گیا ہے، تاکہ چارپایوں کی طرح ہمارے آگے جھکے اور کتے کی طرح ہماری جوتیوں کی گرد چاٹے۔ پس خدا تعالیٰ کے ایک صاحب عزم، صاحب قوت و نفوذ اور ذکی الحس بندے نے راہ میں جور و ستم کا درد انگیز نظارہ دیکھا اور ایک مظلوم اسرائیلی کی فریاد، اور غیرت قومی کے فوری احساس نے اس کے جذبات رقیقہ کے برقی خزانے میں آگ لگا دی:

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝
(القصص: ۱۵)

اور ایک ایسی حالت میں جب کہ تمام شہر غافل تھا، موسیٰ شہر میں آئے اور دو آدمیوں کو دیکھا کہ لڑ رہے ہیں۔ ان میں ایک موسیٰ کی قوم کا تھا۔ دوسرا اس کے دشمن کے گروہ کا۔ موسیٰ کو دیکھ کر اس کی قوم کے آدمی نے اپنے دشمن کے مقابلے میں مدد مانگی۔ موسیٰ نے اس کی مدد کی؛ اس کے دشمن کو ایک گھونسا مارا اور وہ مر گیا۔ موسیٰ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو ایک شیطانی کام ہو گیا۔ بے شک شیطان انسان کا دشمن اور گمراہ کن ہے۔

اس کے بعد اگرچہ فرعون کے غلبے اور جبر و استبداد کے خوف سے موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے، لیکن قومی حمیت کی آگ دل میں برابر سلگتی رہی۔ سوء اتفاق سے دوسرے دن پھر یہی موقع پیش آ گیا:

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۚ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ

اب موسیٰ شہر میں خوف زدہ ہو کر چھپنے لگے، اتفاق سے پھر وہی پہلا سا موقع پیش آ گیا اور جس شخص نے کل ان سے مدد طلب کی تھی اس نے آج پھر ان سے فریاد کی۔ موسیٰ نے کہا کہ تو تو بڑا گمراہ آدمی ہے۔ پھر جب موسیٰ نے اس قبطی پر حملہ کرنا چاہا جو ان دونوں کا دشمن تھا تو اس نے کہا: کیوں موسیٰ، جس طرح تم نے کل ایک آدمی کو مار ڈالا ہے، کیا آج اسی طرح مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہو؛ تم زمین پر

مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۞ (القصص : ۱۸-۱۹)

ظالم بن کر رہنا چاہتے ہو۔ امن دوست بنا تمھیں پسند نہیں۔

مرحلہ ہجرت

اب تمام شہر میں اس واقعہ کی شہرت ہو گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جلا وطنی کا وہ مقدس مرحلہ پیش آگیا، جو ہر حقانی جد و جہد کی پہلی منزل ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ز قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ۞ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ز قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۞ (القصص : ۲۰-۲۱)

شہر کے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے موسیٰ! ارکان سلطنت تمھارے قتل کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں، اب تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمھیں خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہوں۔ موسیٰ شہر سے خوف زدہ ہو کر خفیہ طور پر نکلے اور خدا کی جناب میں دعا مانگی کہ خداوندا! مجھ کو ظالموں کے پنجے سے نجات دے۔

حریت کا بیرونی مرکز

مصر سے نکل کر ان کو خدا کے فضل سے اس صالح بندے کی باریابی کا شرف حاصل ہوا جو مصر کی غلامانہ اور مستبدانہ آبادی کی جگہ آزادی کی آب و ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور حضرت موسیٰؑ کی دعوت حریت کے لیے یہ دوسری منزل تھی کہ ایک آزاد و خود مختار زمین میں رہ کر آنے والے وقت کے لیے تیار ہوں:

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ز قَالَ لَا تَخَفْ وقفہ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۞ (القصص : ۲۵)

(جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت شعیب کے پاس مدین میں آئے اور ان سے اپنے واقعات بیان کیے، تو انھوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا ڈرو مت، تم نے ظالم قوم کے پنجے سے نجات حاصل کر لی۔)

مذہبی حیثیت سے یہ پہلا قدم تھا جو سیاست کی طرف بڑھایا گیا تھا، لیکن قومی حمیت کی جو آگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں سلگ رہی تھی، اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حرارت درکار تھی۔ چنانچہ جب فرعون کے تخت و تاج کو لوٹنے کا وقت آگیا تو آتشکدۂ طور نے اپنی حرارت کو ان کے دل کے کانونِ مقدس کے اندر مشتعل کر دیا:

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ج قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۞ فَلَمَّآ

(جب موسیٰ نے شعیب کی خدمت میں اپنے درس و فکر کے دن پورے کر لیے اور اپنے اہل و عیال کو وہاں سے لے کر چلے، تو طور کے دامن میں ایک آگ نظر آئی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا، تم لوگ یہاں ٹھہرو، میں اس آگ کا پتا لگاؤں، یا

أَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يّٰمُوْسٰى إِنِّيْ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(القصص، ۲۹-۳۰)

آگ کا کوئی انگارا ساتھ لے آؤں تاکہ تمہارے تاپنے کے کام آئے۔ لیکن جب وُہ اس آگ کے پاس پہنچے تو وادی ایمن کے کنارے سے ربّانی صدا اٹھی، اے موسیٰ! یہ آگ نہیں جس کے لیے تم دوڑے ہو، بلکہ میں ہوں، ساری دنیا کا پالنے والا۔)

ربانی نصرت

خدا تعالیٰ کو دنیا میں ایک سب سے بڑے سرکش اور مستبد بادشاہ، اور سب سے بڑی ظالم حکمران قوم کو ہلاک کرنا منظور تھا۔ اس لیے وُہ خود ہی زمین پر اتر آیا، جیساکہ وہ ہمیشہ اپنی جلال و قہاریت کی فضا میں اترتا رہا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود مطہر کے اندر سے اس نے اپنی پاک حریت اور انسانیت کی قدرتی آزادی کے ظہور کا اعلان کر دیا، لیکن ابھی حضرت موسیٰ اس راہ کے پہلے ہی مرحلے میں تھے اور اقتضائے بشریت سے ان کے دل میں خوف و ہراس باقی تھا۔ وُہ جب اپنی تنہائی اور فرعونیوں کی کثرت کا مقابلہ کرتے تھے تو قدرتی طور پر ان کے اندر ہراس پیدا ہو جاتا تھا۔ پس قوت مربیہ الٰہی نے سب سے پہلے ان کے قلب کو مختلف طریقوں سے عزم و ثبات کا کامل جوہر بخشا، اور دکھلا دیا کہ طاقت صرف انسانوں کی قلت و کثرت ہی میں مخفی نہیں۔ حق اور ربانی نصرت کی رُوح سے معمور ہو کر ایک تنہا انسان لاکھوں انسانوں پر غالب آسکتا ہے، چنانچہ سب سے پہلے انھیں حکم دیا:

وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰى أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۖ إِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝

(القصص، ۳۱)

(اے موسیٰ! اپنی لاٹھی پھینک دو۔ جب موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو دیکھا تو وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہی تھی، وُہ دوڑے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ خدا نے کہا، اے موسیٰ! تم پیچھے ہٹنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہو۔ تمہارا کام صرف آگے بڑھنا ہے۔ آگے بڑھو کیونکہ تمھیں آگے بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے، خوف نہ کرو تم ہمیشہ امن میں رہو گے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ نے اگرچہ اب تک تلوار کا قبضہ نہیں پکڑا تھا۔ لیکن خدا نے انھیں دکھا دیا کہ جو ہاتھ حق کی حمایت میں اٹھتا ہے، اس کے پاس گو لوہے کی تلوار نہ ہو لیکن وہ خود اپنی انگلیوں کے اندر ہی تلوار کی چمک رکھتا ہے:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ وَّاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ

(اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالو، وہ اس کے اندر سے چمکتا ہوا نکلے گا اور اس سے تمھیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا اپنے بازو کو

مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ٥ (القصص: ۳۲)

سمیٹ لو، تمھارے خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کے لیے یہ دو نشانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عدالت الٰہی کے قانون کو توڑ دیا تھا اور اللہ کی اطاعت سے باہر ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ اب ان معجزانہ آلات حرب سے مسلح ہو گئے، لیکن سیاسی میدان میں تلوار اور توپوں کی گرج سے زیادہ دل کی قوت اور زبان کی طاقت و روانی کام آتی ہے، اس لیے انھوں نے اپنی کمزوریوں کا عذر کیا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ٥ وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِیْٓ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ٥ (القصص: ۳۳-۳۴)

الٰہی! ان کی قوم کے ایک آدمی کو میں نے مار ڈالا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے عوض میں مجھے قتل کر دیں۔ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح مقرر ہے۔ اس کو میرا حامی بنا میرے ساتھ کر دے کہ وہ میری تصدیق کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں۔

خدا نے ان کی تمام باتیں قبول کیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کی مدد سے ان کے دست و بازو کو قوی تر کر دیا:

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ٥ (القصص: ۳۵)

خدا نے کہا: ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرے دست و بازو قوی کر دیں گے اور تم دونوں کو معجزات قاہرہ کی برکت سے ایسا غلبہ عطا کریں گے کہ وہ لوگ تمھارے پاس پھٹک بھی نہ سکیں گے۔ صرف تم اور تمھارے ساتھیوں ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

فرعون سے مطالبہ

خدا تعالیٰ نے ان معجزات قاہرہ اور ان بشارات عظیمہ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا۔ فرعون مشرک بھی تھا، مے نوش بھی تھا، بدکار بھی تھا، فاسق بھی تھا، فاجر بھی تھا، غرض وہ سب کچھ تھا جو دنیا کا ایک سیاہ کار اور شریر و ظالم انسان ہو سکتا ہے۔

لیکن اب غور کرو کہ تفسیر قرآن کا کیسا اہم مقام تمھارے سامنے ہے، اور افسوس کہ تم نے قرآن کا حق فہم بھی ادا نہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر حق تھے، توحید الٰہی، رد شرک و اصنام پرستی، تزکیہ نفس و اخلاق، درس کتاب و حکمت ان کے فرائض نبوت کے حقیقی ارکان ہیں، ان کا مخاطب ایک مشرک و فاجر بادشاہ تھا اور ایک مشرک و فاجر حکمران قوم تھی۔ اگر "سیاست" اور "دین" دو الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ

نادانی اور جہل کے ابلیس نے تمہیں سمجھایا ہے اور اگر ایک قوم کو غلامی سے نجات دلانا ایک غیر دینی عمل ہے بدبختانہ تم سمجھتے آئے ہو، تو اب ضرور تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت و تبلیغ بھی اس چیز سے الگ رہتی جس کا نام تم نے "سیاست" رکھا ہے۔ وہ آتے اور فرعون سے سب کچھ چاہتے، مگر وہ نہ چاہتے جو نہ تو دین ہے اور پیغمبرانہ دعوت کا کوئی جزو حقیقی، مگر قرآن حکیم تمہارے سامنے موجود ہے۔ خدا نے فرعون کو نہ تو توحید کی دعوت دی، نہ اس کی شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں، نہ اس کی سیاہ کاریوں کا جائزہ لیا، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتا کر رخصت کیا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ (طٰہٰ:۲۴) فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ بڑا سرکش اور ظالم ہو گیا ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور انھوں نے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا کہ:

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۞ (الدخان:۱۸) (خدا کے بندوں کو یعنی بنی اسرائیل کو مجھے واپس دے دو جسے تم نے اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ میں تمہارے پاس ایک امانت دار رسول بن کر آیا ہوں)

آیہ کریمہ کے معارف تم نے غور کیا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے آگے اپنی تبلیغ کا مقصد یہ نہیں کہا کہ فسق و فجور چھوڑ دو، گناہ اور شرارت سے باز آ جاؤ، نیک زندگی اختیار کرو، پاک طریقوں پر عمل کرو، بلکہ یہ مطالبہ کیا کہ خدا کے جن بندوں کے پاؤں میں تو نے اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیریں ڈال دی ہیں، انھیں چھوڑ دے اور مجھے واپس دے دے۔ خدا نے مجھے اس قوم کا امین بنایا ہے۔ اس کے بندوں کو میں آزادی دلاؤں گا۔ محکومی کی جگہ ایک حکمران قوم بناؤں گا۔ تو ظالم و مستبد ہے اس لیے تو اس امانت کا مستحق نہیں۔ یہ شرف اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے کہ میں اس امانت کو ٹھیک ٹھیک رکھوں۔

یہ مطالبہ اگرچہ نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا، لیکن درحقیقت وہ سیاست کی روح، سیاست کا مغز اور سیاست کی حقیقی تفسیر تھا۔ پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا مطالبہ "ادّوا" کے لفظ سے کیا۔ "ادّوا" کا اصل "الاداۃ" ہے اور اس کے معنی ہیں دفع الحق کے یعنی کسی ایسی چیز کو دے دینا جو لینے والے کا حق تھا تم نے اپنے پاس سے اسے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ادا خراج، ادا جزیہ اور ادا امانت عربی میں بکثرت آتا ہے۔ خراج اور جزیہ حکومت کا حق ہے۔ امانت، امانت رکھنے والے کی چیز ہے، اسے واپس دینا، اس کے حق کو ادا کرنا ہے۔ پس حضرت موسیٰؑ نے "ادّوا" فرمایا۔ یعنی ایک ایسی چیز مانگی جو فرعون کی ملکیت نہ تھی حضرت موسیٰؑ کا حق تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رعایا کسی قوم کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق نہیں بنائی گئی ہے اگر خدا نے کسی گروہ کو کسی شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اس سے آلۂ بے جان

کی طرح کام لے اور اپنا غلام بنا لے، اگر ایک قوم کسی ضعیف فرقہ کی قسمت کی مالک ہو گئی ہے تو وہ اسے اپنے اغراض ذاتی و قومی کا ذریعہ نہیں بنا سکتی۔ رعایا صرف ایک امانت الٰہی ہے، اور جب کوئی قوم اس امانت میں خیانت کرتی ہے تو خدا اس کو واپس لے کر اپنے دوسرے امانت دار بندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

پھر انھوں نے بنو اسرائیل کو "عباد اللہ" کے لفظ سے تعبیر کیا، جس میں یہ اشارہ تھا کہ رعایا بادشاہوں کی قوم ہو کر ان کی غلام نہیں بن جاتی، بلکہ اس کے گلے میں غلامی کا صرف ایک ہی حلقہ ڈالا گیا ہے اور وہ حلقہ صرف خدا کی عبودیت کا ہے۔ وہ "عباد اللہ" ہیں، "عباد السلاطین" نہیں ہیں، ان کو خدا کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ سلطانوں کے تختِ غرور کے آگے جھکنے کو نہیں بنایا گیا۔ پھر انھوں نے اپنا تعارف "رسول امین" کے لقب سے کیا، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے امانتِ الٰہی میں خیانت کی، اس لیے خدا اب اپنی امانت کو اس دوسرے امین بندے کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جہاں کہیں تاج و تخت کی بشارت عظمیٰ دی ہے، اس سے حکومت کرنے کی صلاحیت ہی مراد ہے اور دنیا کی جس سلطنت نے سیاست کے اس اصول زریں کو پامال کر دیا، وہ دفعۃً برباد ہو گئی۔ دنیا کے جابرہ میں فرعون نے سب سے زیادہ بیدردی کے ساتھ اس اصول کو پامال کیا تھا۔ وہ بنو اسرائیل کو نہ صرف غلام بلکہ جایداد غیر منقولہ سمجھتا تھا اور ان کے واپس کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا، اس لیے حضرت موسیٰؑ نے جبراً ان کو چھین لینا چاہا کہ جبر کا علاج صرف جبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے حکم دیا:

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ (الدخان: ۲۳)

(میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔)

عذابِ الٰہی کا ظہور

حضرت موسیٰ علیہ السلام امانتِ الٰہی کو لے کر نکلے تو حسب اطلاع الٰہی فرعون نے ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ اُن کا تعاقب کیا۔ اب اگرچہ اس قسم کے سرکشوں کی سزا کے لیے خدا نے خود انسان ہی کو مسلط کر دیا تھا اور دوسری فطری مخلوقات نے اپنا یہ منصب انسان ہی کو دے دیا تھا، تاہم فرعون کی ہلاکت و بربادی میں سب نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ دریاے احمر کی موجیں اُن کو نگل گئیں۔ خوش فضا باغوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، زمین سے اُبلنے والے چشمے اُن سے علیحدہ ہو گئے۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اُن سے رُوٹھ گئیں، اور آسمان و زمین تک کو ان پر رحم نہ آیا:

وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ وَّ

(ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ دریا کو ساکن چھوڑ دو اور نکل بھاگو۔ فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں ڈوب جائے گا، چنانچہ حکم الٰہی پورا ہوا، اور وہ سب کے سب دریا میں نابود ہو گئے۔ پھر دیکھو کہ یہ کون لوگ تھے؟ ان کی کیسی شان و شوکت تھی، کیسا

زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ قف وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝

(الدخان، ۲۴-۲۹)

گھمنڈ اور کیسی شرارتوں سے بھری صدائیں تھیں؛ لیکن بالآخر خدا کے عذاب سے نہ بچا سکی۔ کس قدر سرسبز باغ، کیسی کیسی دلفریب نہریں، شاداب و پُر ثمر زراعت گاہیں، عالیشان اور پُرتکلف عمارتیں، عیش و نشاط کی نعمتیں، غرضکہ وہ سب کچھ جو دنیوی جاہ و جلال میں سے ان کے پاس تھا اور جن کے اندر وُہ بے فکری کے مزے اڑا رہے تھے، اپنے بعد چھوڑ گئے اور ہم نے دوسری قوموں کو ان کا وارث بنایا، جو ان پر قابض ہوگئیں، اور باوجود اس دردانگیز انقلاب کے نہ تو آسمان ان پر رویا اور نہ زمین نے ان پر آنسو بہائے، اور نہ ان کو اپنی حالت کی اصلاح کی مہلت دی گئی، کیونکہ مہلت پُوری ہوگئی تھی، اور آسمان و زمین کا خداوند جب ناراض ہو جائے تو پھر تمام کائنات ہستی میں کون ہے جو ان بدبختوں سے راضی ہو سکتا تھا؛

قوت اگرچہ سیاست کا جزو لازمی ہے، لیکن اس میں رحم و تلطف اور رفق و ملاطفت کی آمیزش بھی کی جا سکتی ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے جب فرعون کے پاس بھیجا تو سب سے پہلے اسے پیغمبرانہ اخلاق کے اظہار کی تلقین کی؛

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

(طٰہٰ : ۴۳، ۴۴)

اے موسیٰ تم اور ہارون فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وُہ سرکش ہو گیا ہے، بایں ہمہ اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا۔ شاید وہ عبرت حاصل کرے یا اس کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔

اخلاق اور سیاست

لیکن فرعون کے جبر و استبداد، غرور و عناد، اور حکومت ابلیسی کے گھمنڈ نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے دریائے لطف کے ایک قطرے سے بھی تشنہ لب رکھا اور دریائے احمر کی لہروں میں اُن کی معجزانہ قوت نے نہایت عبرتناک طور پر بحر عدم کے ساحل تک پہنچا دیا۔ تاہم الٰہی سیاست فطرۃً رحم کے ساتھ ہم آغوش رہنا چاہتی تھی۔ فرعون کو اس کے تمرد نے اگرچہ اس تلطف آمیز سیاست سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا، لیکن جب دنیا کے ساتھ تمدّن نے اور زیادہ ترقی کی تو اخلاق و سیاست کی تصویریں ایک مرقع میں نظر آگئیں۔ اسلام اسی اخلاق و سیاست کا مجموعہ ہے۔

لیکن ہر اجتماع و ترکیب سے پہلے اس کے متفرق اجزاء کا الگ الگ ہونا ضروری ہے، اور ہر اعتدال کے لیے افراط و تفریط کا وجود لازمی ہے، سیاست کا ایک جزو یعنی قوت کو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیدا کر دیا تھا؛

اور اس کی آخری نمایش دریا سے احمر میں ہو چکی تھی، لیکن دوسرا جز یعنی اخلاق اب تک معدوم تھا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس کو بھی پیدا کر دیا اور اس کے حریف یعنی سیاست و قوت کی رگ گردن کاٹ ڈالی۔ یہود ٹھوس پتھر کی طرح سخت تھے، لیکن حضرت مسیحؑ نے اپنی معجزانہ آتش بیانیوں سے ان کو اس قدر گداز کر دیا کہ وہ ایک سیال مادہ بن گئے، جو ہر قوت کے سامنے جھک جاتا تھا، لچک جاتا تھا، دب جاتا تھا۔

اگر کوئی شخص اُن کے گال پر ایک طمانچہ مارتا تھا تو انھوں نے کہا کہ وُہ اپنا دوسرا گال بھی آگے کر دیں گے، اگر کوئی شخص ایک میل ان کو بیگار میں لے جانا چاہتا تھا تو دو میل تک اس کا بوجھ پہنچا دیتے تھے۔ اظہارِ قوت کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت ہے، لیکن انھوں نے دنیوی حکومت کے لیے کچھ بھی نہ چاہا، اور صرف خدا کے غریب بندوں ہی کو آسمانی حکومت کی بشارت دی۔ قوت کی نمایش کے لیے جنگ ناگزیر ہے، لیکن انھوں نے کہا کہ اپنے دشمنوں کو بھی پیار کرو۔ غرض حضرت موسٰی علیہ السلام کے زمانے میں قوت جس درجہ افراط تک پہنچ گئی تھی، ٹھیک اسی کے مقابل حضرت مسیحؑ نے اس کو تفریط تک پہنچا دیا، اگرچہ اپنے اپنے وقتوں میں دونوں چیزیں صحیح اور عین اعتدال پر تھیں۔

باب ۲۹

حضرت موسیٰؑ اور رسولِ اکرم صلعم

امتِ وسطا اس بنا پر اعتدال کلی داعی کے لیے جس قسم کے الگ الگ افراط و تفریط کی ضرورت تھی، اب وہ پوری ہوگئی اور قوانین ارتقا جس جامع و مکمل مذہب کو ڈھونڈ رہے تھے، اس کے ظہور کا وقت آگیا، پس زبان الٰہی نے اس معتدل امت کے پیدا ہونے کی بشارت دنیا کو سنادی؛

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (بقرہ: ۱۴۳)

اسی طرح ہم نے تم کو ایک عدل و توسط کی قوم بنایا تاکہ تم لوگ دنیا میں نمونہ بنو، اور پیغمبر تمہارے لیے نمونہ ہو۔

داعی مذہب اسلام نے اس "امتِ وسطا" کے لیے اپنا اعلیٰ نمونہ قائم کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ ایک سخت طاقت ور بادشاہ اور سخت جابر قوم کا مقابلہ کرنا تھا، اس لیے خدا نے ان کو فطرۃً پُرجلال بنایا تھا۔ اسی لیے فرعون کے سامنے نرم کلامی کی تلقین کرنی پڑی، لیکن پیغمبر اسلام خود ہی فطرۃً رحم و شفقت کرم و رافت، عفو و درگزر کا خلق عظیم تھا؛

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص (آل عمران: ۱۵۹)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے فطرتاً نرم خو پیدا کیے گئے اور اگر تم سخت و سنگدل ہوتے تو لوگ تمہارے گرد جمع ہی نہ ہوتے اور بھاگ جاتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی قوم کی ذلت برداشت نہ ہوسکی، اور وہ چند دنوں کے بعد اس کو لے کر چلے گئے، لیکن پیغمبر اسلام نے کامل تیرہ برس تک اپنی قوم کے ہدایت یاب ہونے کا انتظار کیا، طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں اور اپنے متبعین کو مختلف قسم کے جسمانی مصائب میں مبتلا دیکھا، بااین ہمہ خدا نے ان کو صبر و سکون کا اعلیٰ ترین معیار بتلادیا؛

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ج (کہف: ۲۸)

ان لوگوں کے ساتھ رہ کر صبر کرو، جو صبح و شام خدا کی پکار میں سرگرم رہتے ہیں اور صرف خدا کی مرضی تلاش کرتے ہیں، اپنی نگاہ ان سے نہ پھیرو۔

کفار مکہ کی ایک ایک کنکری اس کے متبعین کو ٹھوکر لگانا چاہتی تھی، لیکن ان لوگوں نے داعی اسلام کے اسوۂ حسنہ کی اس عدیم النظیر طاقت کے ساتھ تقلید کی کہ ایک تنکے کو بھی نگاہِ گرم سے نہ دیکھا، بلکہ بعض موقعوں پر ثابت کیا کہ اخلاق مسیحی اس کے آگے ہیچ ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان : ۶۳)	اور خدا کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں، اور جب جہلاء ان کو نامعقول طریقے سے مخاطب کرتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو، ہمیں اپنی راہ چلنے دو۔

ضعف اور قوت کا راز

لیکن اس ضعف میں ان کی قوت کا راز بھی چھپا ہوا تھا، دنیا میں ایک ہی اصول متضاد نتائج پیدا کرتا ہے۔ کبھی تو قوت دب کر بالکل فنا ہو جاتی ہے اور کبھی وہ جس قدر دبائی جاتی ہے اُسی قدر اُبھرتی بھی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر لیتی ہے۔ پانی کی سوتیں بعض اوقات تو خاک پتھر کے اندر دب کر بالکل خشک ہو جاتی ہیں، لیکن کبھی اندر ہی اندر منافذ پیدا کر کے زمین کے اندرونی حصے میں اپنا جال پھیلا دیتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں، قوت کی موت اور اس کی زندگی دراصل تربیت ہی پر موقوف ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ یہود کی شقاوت کو توڑنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنا ایک خاص مظلومانہ نظام قایم کیا، لیکن پیغمبرِ اسلام مسلمانوں کو ایک طاقت ور قوم اور بزرگ ترین ہستی بنانا چاہتے تھے، وہ آسمان کی بادشاہت غریبوں اور مسکینوں کو نہیں دیتے تھے بلکہ دنیا کی بادشاہت کی بشارت سے مسکینوں کو صاحبِ تخت و تاج بنانے والے تھے، اس لیے انھوں نے ابتدا ہی سے خود اپنے پیروؤں کو) عزم و استقلال کی تعلیم دی، اور ایک بلند ترمطمع نظر کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ اس مظلومی کے زمانے میں جبکہ ارض مکہ کی ایک ایک کنکری مسلمانوں کو ٹھوکر لگاتی تھی اور دنیوی عیش و نعم کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے تھے۔ پیغمبر اسلام نے خدا کی نصرت سے معمور ہو کر بشارت دی کہ آج ظلم و جبر کے پتھروں کو اٹھاؤ، کل کو تمام دنیا تمھارا بوجھ اٹھائے گی:

تشکونا الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قلنا لہ الا تستغفرلنا، الا تدعو اللّٰہ لنا، قال: کان الرجل فی من قبلکم لہ فی الارض فیجعل فیہ فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسہ فیشق باثنین و ما یصدہ ذالک عن دینہ و یمشط بامشاط	صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرتؐ سے اپنے مصائب کی شکایت کی اور کہا کہ آپ ہمارے لیے خدا سے مدد نہیں مانگتے اور اس کی درگاہ میں دُعا نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا، گزشتہ قوموں میں ایسے راسخ العزم لوگ تھے کہ زمین میں گڑھے کھود کر انھیں ڈال دیا جاتا۔ پھر آرے سے ان کو دو ٹکڑے کر دیا جاتا، اور لوہے کی کنگھیاں ان کے بدن پر چلائی جاتی تھیں،

الحديد ما دون لحمه من عظم او عصب وما يصده ذالك عن دينه و الله ليتمن هذا الامر حتى يسير الراكب من ضعا الى حضرموت لا يخاف الا الله۔

جو ان کی رگوں کو ہڈیوں سے الگ کر دیتی تھیں۔ تاہم یہ بھی ان کو سچائی سے نہیں ہٹا سکتی تھی، خدا کی قسم دین اس قدر کامل اور غالب ہوگا کہ ایک سوار یمن سے حضرموت اسی طرح چلا جائے گا کہ خدا کے سوا اس کو کسی چیز کا

(بخاری جزء ۴ ص ۲۰۱)

خزانۂ قوت کی حفاظت

دنیا کے خزائن و دفائن میں قوت کا خزانہ سب سے زیادہ قیمتی اور مستحق اس لیے اس کو ہر وقت اور ہر جگہ آسانی کے ساتھ صرف نہیں کیا جا ہر چیز اجزاء کی تقسیم سے فنا ہو جاتی ہے اور کوئی عظیم الشان نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ عرب جاہلیۃ سے زیادہ فیاض ساتھ کسی قوم نے جنگی قوت کو خرچ نہ کیا ہوگا، لیکن انتشار و پراگندگی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا،

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِىْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۚ

(حشر: ۱۴)

وہ متفق ہو کر تم سے نہیں لڑ سکتے، صرف قلعہ بند گاؤں آڑ میں چھپ کر حملہ کریں گے، وہ باہم نہایت سخت جنگ کرتے تھے، اس لیے تم ان کو متحدہ جماعت سمجھتے ہو جماعت صرف اتفاق ہی سے پیدا ہوتی ہے اور ان میں اتفاق کہاں؟ وہ ایک نادان و بے عقل قوم ہے و اجتماع قواء کے فواید نہیں سمجھتی۔

صحابہؓ کی شان فداکاری

لیکن تکمیل مذہب، نشر امن و اسلام اور عدل و انصاف کے قیام کا جو اسلام کے پیش نظر تھا، وہ ایک متفقہ جماعت اور متحدہ قوت کا محتاج تھا، وہ اپنی قوت کا خزانہ اس طرح نہیں صرف کر سکتا تھا، جس احمقانہ طریقے سے اہل عرب صرف کیا کرتے تھے، کو کفار مکہ کی سفیہانہ آویزشوں پر صبر و تحمل کا جو حکم دیا گیا تھا، وہ نہ تو کسی قسم کی کمزوری پر مبنی تھا، اور نہ ہی اس اخلاق مسیحی کی تکمیل مقصود تھی، بلکہ سیاسی مصالح کی بنا پر اس کے ذریعے قوت کے خزانے کو ایک اجتماعی اور مقصد وحید کے لیے جمع کرنا اور محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ چنانچہ جب اس سیاست الٰہی کے اظہار کا وقت آ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ،

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ

(توبہ: ۷۳)

اے پیغمبر کفار اور منافقین سے جہاد کرو، اور ان کے ساتھ پوری سختی سے پیش آؤ۔

قوت کا یہ سرچشمہ دفعتہً اُبل پڑا اور وہی فقیر و مظلوم مسلمان جنھوں نے سالہا سال تک دشمنان حق کے مظالم خاموشی کے ساتھ سہے تھے، اس جوش و قوت کے ساتھ سرفروشی کے لیے تیار ہو گئے کہ آگ کے شعلے، سمندر کی موجیں، پہاڑوں کی چوٹیاں، تیروں کی بارش بھی ان کے سیلاب کو نہ روک سکی:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان فقام سعد بن عبادہ فقال ایانا تریـد یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا۔ (مسلم جلد دوم ص ۸۴)

آنحضرت صلعم کو جب علم ہوا کہ ابو سفیان نے بدر کی طرف پیش قدمی کی ہے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، انصار میں سے سعد بن عبادہ اٹھے اور کہا: کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ہماری جان ہے، اگر آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں گھس پڑیں، اور اپنے سینوں کو تلواروں کے میان سے ٹکرا دیں۔

دین کا اہم ترین مقصد

لیکن یہ سیلاب ایک معتدل قوم کے دل سے امڈا تھا، اس لیے وہ دریائے احمر کی موجوں کی طرح ہر جسم کے نگلنے کے لیے اندھا دھند تیار نہ تھا بلکہ اس کا حال بالکل مختلف تھا۔ چونکہ اس کی سطح پر جس قدر جنبش پیدا کرتا تھا، اسی قدر مساوی و ہم وزن طاقت کے ساتھ اسے تھپیڑے بھی لگاتا تھا:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (بقرہ: ۱۹۴)

جو شخص تم پر ظلم کرے، تم بھی اس پر اسی قدر ظلم کرو جس قدر اس نے تم پر کیا ہے، اس سے آگے بڑھنے میں خدا سے ڈرو اور یقین رکھو کہ خدا صرف پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

(سیاست و اخلاق کے جو اجزا شریعت موسوی و عیسوی میں الگ الگ بکھرے ہوئے پڑے تھے، اسلام نے ان میں باہم ترکیب دے دی اور رحمت و فیاضی سے سیاست پر اخلاق کے جز کو غالب کر دیا، لیکن مضمون بہت طویل ہو گیا ہے) ورہم اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے، یہ ایک مستقل عنوان ہے، اور اللہ تعالیٰ درس بیان معارف اسلامیہ کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بہر حال صفوۃ القول یہ کہ اسلام جس طرح اخلاق و عقاید اور عادات و خصائل کا مکمل مجموعہ ہے اسی طرح سیاست میں بھی ایک کامل ترین مذہب ہے، اور سیاست صحیحہ اور دین الٰہی دو الگ الگ حقیقتیں نہیں، دینِ حق کا اہم ترین مقصد سیاست حقہ کا قیام ہی ہے، اس حقیقت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے قرآن حکیم کو پڑھا ہے، مگر قرآن کے پڑھنے والے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عقاید و عبادات کے تمام ارکان قائم ہو گئے تو ان کے ساتھ اس کے سرچشمہ سیاست یعنی حکومت کی بھی تکمیل ہو گئی، اور دنیا کو اس کی تکمیل کا

مژدہ سُنایا گیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (مائدہ:۳)

آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اپنی نعمت تم پر پُوری کر دی اور تمھارے لیے پسند کر لیا دین اسلام کو۔

باب ۳۱

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ

(۱) آیت ۴۹ (طٰہٰ) میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا جو مکالمہ نقل کیا ہے، وُہ اگرچہ دو تین جملوں سے زیادہ نہیں، لیکن حقائق و معارف کے دفاتر اس میں پنہاں ہیں۔

فرعون کا پہلا سوال یہ تھا کہ من ربکما یا موسیٰ؟ جس پروردگار کا ذکر کرتے ہو، وُہ کون ہے؟

مصریوں کی دیومالا

اس سوال کی نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معلوم کرلیا جائے، مصریوں کے عقاید کیا تھے؟

مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے، جن میں سے بعض تو خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے، جیسے نیفات، فتا اور مات اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ الگ مظاہر تھے، جیسے اوزیرس، عالم آخرت کا خدا۔ میہ اورات، آسمان کا خدا۔ کنیمو، جسم بنانے والا۔ ایریز، رُوح بخشنے والی دیبی۔ طوط، عمر کی مقدار مقرر کرنے والا۔ حورس، درد و غم دور کرنیوالا۔ حاثور (گائے)، رزق بخشنے والا اور ان سب سے بلند تر آمن رع تھا۔ یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پُوری طرح نشو و نما پاچکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کرلی تھی، ان کا لقب "فاراع" اسی لیے ہُوا کہ وہ "راع" یعنی سُورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔[۱]

فرعون کا تعجب

پس جب حضرت موسیٰؑ نے کہا: میں خدا کا فرستادہ ہوں تو فرعون نے متعجب ہوکر پُوچھا: کس خدا کے؟ آمن رع کے، جس نے مجھے اپنا مظہر ٹھہرایا ہے؟ ایریز دیبی کے، جو روح پیدا کرنے والی ہے، کنیمو دیوتا کے، جو جسم و خلقت بنانے والا ہے؟

حضرت موسیٰؑ کا جواب

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا، نہیں۔ الذی اعطیٰ کل شیئ خلقہ ثم ھدیٰ! ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا جسم و وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں دے کر اس پر زندگی و عمل کی راہ بھی کھول دی!

فرعون کے تمام تصورات کا ابطال کیوں کر ہوا؟ اس طرح کہ یہ تمہارے ان گڑھے ہُوئے معبودوں کا قائل نہیں

---

[۱] ڈیولپمنٹ آف ریلیجن اینڈ تھاٹ اِن انشینٹ ایجپٹ مصنفہ جے ایچ بریسٹڈ (BREASTED) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھیکس۔ جے ہیسٹنگس۔

جن میں سے کسی کو تم نے خلقت دینے والا سمجھ رکھا ہے، کسی کو رُوح بخشنے والا، کسی کو رزق و تندرستی کا سرچشمہ، میں تو صرف اس ایک ہی ہستی کا پرستار ہوں جو جسم بھی دیتی ہے اور وہ سب کچھ بھی دیتی ہے جو جسم کے نشو و نما و قیام کے لیے ضروری ہے۔ خالق بھی وہی ہے، رہنمائے زندگی بھی وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ چنانچہ آگے چل کر انھوں نے اس اعتقاد کی تفصیل بھی کر دی ہے۔

پھر اس جملہ کی جامعیت اور مانعیت دیکھو۔ کائنات ہستی میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کے سوا کیا ہے کہ یا تو وجود ہے یا وجود کی وہ معنوی قوتیں ہیں جو اسے قایم و باقی رکھتی اور قیام و عمل کی راہوں پر لگاتی رہتی ہیں۔ انھی دو حقیقتوں کو یہاں خلقت اور ہدایت سے تعبیر کیا ہے اور ان دو لفظوں نے وجود اور حیات کے تمام گوشے سمیٹ لیے ہیں۔

دعوے کے ساتھ دلیل کیونکر ہوئی؟ اس کے لیے تفسیر سورۂ فاتحہ کا مبحث "ربوبیت" دیکھنا چاہیے۔

فما بال القرون الاولیٰ

اس کے بعد فرعون نے دُوسرا سوال کیا اور بطریق جدل کیا۔ فما بال القرون الاولیٰ اچھا، اگر حقیقتِ حال ایسی ہی ہے تو جو لوگ پچھلے عہدوں میں گزر چکے اُن کے لیے کیا ہونا ہے؟ وہ راہ صواب پر تھے یا گمراہی پر؟ انھیں تو تمھارے اس نئے اعتقاد کی خبر بھی نہ تھی۔

اب دیکھو، یہاں پھر وہی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ سوال امام فخرالدین رازی سے کیا جاتا تو اس بحث میں صبح کر دیتے اور سارا معاملہ اسی میں اُلجھ کر رہ جاتا لیکن حضرت موسیٰؑ داعی تھے۔ مجادل اور مناظر نہ تھے۔ انھوں نے صرف ایک بات کہہ کر ساری بحث ہی ختم کر دی "علمها عند ربی فی کتاب" اس کا علم اللہ کو ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور ہمیں اس کی فکر کیوں ہو؟ ہمارے جاننے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ لا یضل ربی ولا ینسیٰ! خدا انسانوں کی طرح نہیں کہ غلطی میں کھو جائے یا کوئی بات بھول جائے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ہر انسان کا جیسا اعتقاد و عمل ہو گا، ٹھیک اسی کے مطابق اُسے نتائج بھی ملیں گے۔ پس پچھلوں کا جیسا حال رہا ہو گا، ویسا ہی نتیجہ بھی بھگتیں گے۔ ہم کو اپنا حال دیکھنا ہے اور اپنے ہی سامنے کی باتوں کا ہم علم بھی رکھتے ہیں۔ ہم اس کاوش میں کیوں پڑیں کہ پچھلوں کا کیا حال تھا اور وہ بخشے جائیں گے یا نہیں؟

غور کرو فرعون کا سوال مجادلانہ تھا اور ایسا تھا کہ بحث و کاوش کی قسم کا کوئی جواب بھی دیا جاتا، مُسکت اور مختتم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو بات بھی کہی جاتی بحث طلب ہوتی اور ایک نیا سوال پیدا کر دیتی، لیکن انبیا کرام کا طریق دعوت یہ نہیں ہوتا کہ بحث میں الجھیں یا دوسرے کو الجھائیں۔ پس حضرت موسیٰؑ نے اس کاوش میں پڑنے ہی سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: ہم یہ جانتے ہی نہیں اور ہمیں اس کا خواہشمند بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اسے جانیں۔

ایک اصل عظیم

پھر غور کرو۔ انھوں نے اس جملے کے اندر جو بات کہہ دی، وہ انسان کی فکری گمراہیوں کی کتنی راہیں بند کر دیتی ہے، بشرطیکہ لوگ اسے سمجھیں! مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اسی کاوش کی

پیروی کرتے رہے، جو فرعون کے سوال سے ٹپک رہی ہے۔ وہ حقیقت نہ پا سکے جو حضرت موسیٰ کے جواب میں مضمر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے جواب نے ہمیں یہ اصل عظیم بتلا دی ہے کہ جن گوشوں کا ہمیں علم نہیں اور جن کی کاوش ہمارے لیے سود مند بھی نہیں، ان کی فکر میں ہمیں نہیں پڑنا چاہیے اور ان کا حکم اللہ کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ اگر لوگ اس اصلِ عظیم پر عامل ہو جائیں تو مذاہب کے کتنے ہی گمراہ کن جھگڑے ختم ہو جائیں۔

ابھی دور نہ نکلو، اسی گوشے میں رہو جو فرعون کے اس مجادلانہ سوال کی اصل جگہ ہے اور غور کرو، مذہب کے نام سے کتنے جھگڑے بنا لیے گئے ہیں جن میں سے ہر جھگڑا "فما بال القرون الاولیٰ" کی فرعونی صدا کا ٹھیک ٹھیک اعادہ ہے؛ اب سے پہلے فلاں گروہ جو گزرا ہے، اہل حق میں تھا یا اہل باطل میں؟ فلاں انسان جو گزر چکا، نیک تھا یا بد؟ فلاں بزرگ کا رتبہ خدا کے نزدیک زیادہ ہے یا فلاں بزرگ کا؟ افضل کون ہے؟ زید یا عمرو؟ ولایت و طریقت میں سب سے بڑا کون رہا؟ فلاں یا فلاں؟ پھر اس میں بحثیں ہیں، تصنیفیں ہیں، لڑائیاں ہیں، فرقہ بندیاں ہیں۔ گویا انسان کی نجات کے لیے صرف یہی فکر کافی نہیں کہ خود اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ اس فیصلے کے لیے بھی ذمہ دار بنا دیا گیا ہے کہ اب سے پانچ سو برس پہلے کسی نے کیا کیا تھا اور ایک ہزار برس پہلے کون کیسا تھا؟ پھر ان میں سے ہر فریق اس طرح حکم لگانا شروع کر دیتا ہے، گویا خدا کے دفتر کا رجسٹر ابھی ابھی پڑھ کر اٹھا ہے اور اسے علم قطعی حاصل ہو گیا ہے کہ فلاں کا نام فلاں درجے میں لکھا ہوا ہے، فلاں کا فلاں درجے میں!

پچاس برس ہوئے شام میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی بستیاں صرف اس لیے جلا دی تھیں کہ ایک کہتا تھا: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی[1] سب سے بڑے ولی ہیں۔ دوسرا کہتا تھا: نہیں، شیخ احمد رفاعی۔ ہندوستان کا یہ حال ہے کہ آج تک میرے پاس نہایت سنجیدہ عبارت میں لکھے ہوئے استفتاء آتے رہتے ہیں: زید کہتا ہے: بڑے پیر صاحبؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ عمرو کہتا ہے: مجدد الف ثانیؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ نماز کس کے پیچھے جائز ہے؟"

ایک مرتبہ میرے جی میں آیا، لکھ دوں: دونوں کے پیچھے نہیں۔

برباد کن تفرقہ فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص و مدوّن ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام قائم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا، ان چاروں اماموں میں افضل کون ہیں؟ حضرت امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ و قتال کی شکل اختیار کی چنانچہ ہلاکو خاں کو اسلامی ممالک پر حملہ کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی۔ حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آ کر بلا بھیجا اور شہر کے پھاٹک

---

[1] حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

کھول دیے۔ پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعی کو چھوڑا نہ حنفی کو۔ فجاسوا خلال الدیار، وکان وعدًا مفعولا! (پس وہ تمہاری آبادیوں میں پھیل کر رہے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے)

شیعہ سنّی کا اختلاف

شیعہ سنی کے اختلاف نے مسلمانوں کو دو مختلف امتوں میں متفرق کر دیا، لیکن اس تمام اختلاف کا ماحصل بھی کیا ہے؟ یہی کہ "فما بال القرون الاولیٰ" اور تیرہ سو برس گزر گئے مگر اتنی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ علمها عند ربی فی کتاب، لا یضل ربی و لا ینسیٰ۔

بہرحال یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی تمام کاوشوں کے اندر وہی فرعون والی مجادلانہ روح کام کیا کرتی ہے اور طریق موسوی یہ ہے "علمها عند ربی فی کتاب" کہہ کر سارے جھگڑے ختم کر ڈالنا اور سرے سے ان کاوشوں میں پڑنا ہی نہیں۔

صحیح راستہ

قرآن اور صاحب وحی نے ہمیں جن امور کی خبر دے دی ہے، اُن کا علم ہمیں حاصل ہو گیا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اُن باتوں کو اسی طرح یقین کریں، جس طرح تبلادی گئی ہیں، لیکن اُن سے زیادہ جو سوال بھی دینی عقائد کی بنا پر اٹھایا جائے گا، ہمارا جواب یہی ہوگا، "علمها عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسیٰ" خدا نے اپنے دفتر کی مثلیں ہمارے پاس نہیں بھیج دی ہیں اور نہ ہمیں لوگوں کی سعادت و شقاوت اور مدارج فضائل کے فیصلہ کی ٹھیکیداری عنایت فرمائی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں، حقیقتِ حال کیا ہے۔ البتہ خوش قسمتی سے معاملہ ایسے محاسب کے ہاتھ ہے جو نہ تو غلطی کر سکتا ہے، نہ بھول چوک میں پڑ سکتا ہے۔ پس دوسروں کی فکر میں تمہیں پگھلنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی خبر لو اور اُن کا معاملہ اُن کے خدا پر چھوڑ دو۔

باب ۳۱

حضرت موسیٰؑ اور جادوگر

جادوگروں کا ایمان اس میں اشارہ ہے کہ سحرۂ فرعون کا اللہ کے حضور بڑا درجہ ہُوا، کیونکہ انھوں نے قبولیتِ حق کی استعداد اور اس کی استقامت دونوں کا ثبوت دے دیا۔ اُن کا کفر ساری زندگی کا کفر تھا اور ایمان صرف چند لمحوں کا ایمان، لیکن چند لمحوں کے ایمان نے عمر بھر کا کفر محو کر دیا۔ ان کا دل صدیقوں کا دل اور ان کی صدا شہدائے حق کی صدا ہو گئی۔ مصری شاہنشاہ کا سارا قہر و جلال ایک پل کے لیے بھی ان کی استقامتِ ایمانی پر غالب نہ آ سکا!

جادوگر اور فرعون سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے کہ شکست کھانے کے بعد فرعون نے جادوگروں سے کہا، یہ تمھاری ملی بھگت ہے کہ موسیٰؑ کو جتا دیا (اعراف: ۱۲۳) یہاں اس کے قول کا دوسرا حصہ نقل کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، موسیٰؑ تمھارا سردار ہے۔ تم جادو میں اس کے شاگرد ہو۔ اس لیے اس کے آگے گر پڑے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ عوام پر حقیقتِ حال مشتبہ کر دے اور شکست کی ذلت چھپا لے۔

جادو فریبِ نظر ہے "یخیل الیہ من سحرھم" (طٰہٰ: ۶۶) یعنی جادوگروں کی رسّیاں اور لاٹھیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کی شعبدہ گری کی وجہ سے دیکھنے والا خیال کرنے لگتا، سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر کہا: انما صنعوا کید ساحر، ولا یفلح الساحر حیث اتی۔ یہ جادوگروں کا فریبِ نظر ہے اور جادوگر کیسا ہی تماشا دکھائے، حقیقت کی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سورۂ اعراف میں اس واقعہ کی تشریحات گزر چکی ہیں اور آیندہ سُورتوں میں مزید تشریحات ملیں گی۔

حضرت موسیٰؑ نے تین چار لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا، کیا اس سے زیادہ دنیا کی کوئی زبان خدا کے بارے میں کچھ کہہ سکتی ہے؟ "پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کا وجود بخشا اور پھر اس کی زندگی و بقا کے لیے جن جن باتوں کی ضرورت تھی، اُن سب کی راہ انھیں دکھا دی۔" یعنی ایسا وجدان، ایسے حواس، ایسی معنوی قوتیں دے دیں، جو اُن کی رہنمائی کرتی ہیں: من نطفۃ خلقہ، فقدرہ، ثم السبیل یسرہ (عبس: ۱۹) الذی خلق فسوی، والذی قدر فھدی (الاعلیٰ: ۲-۳) (مزید تشریح کے لیے دیکھو تفسیر فاتحہ)

موسیٰؑ اور ہارونؑ آیت ۴۴ (طٰہٰ) انبیا کے طریقِ دعوت کی اصل الاصول ہے۔ تشریح اس کی پچھلی سورتوں میں گزر چکی۔

(یاد رہے، جس فرعون کی طرف اب حضرت موسیٰؑ جا رہے ہیں، یہ وُہ نہیں جس کے محل میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ وُہ مرچکا تھا اور دوسرا فرعون تخت نشین ہو چکا تھا۔)

اِدھر تو حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم ہُوا اور وہ مصر کی طرف چلے، اُدھر مصر میں حضرت ہارونؑ کو اشارۂ غیبی ہُوا کہ موسیٰؑ کی جستجو میں نکلیں۔ چنانچہ راہ میں دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ اب چونکہ دونوں یک جا ہو چکے تھے۔ اس لیے وحی الٰہی نے دُوسری مرتبہ مخاطب کیا تو دونوں کو کیا۔ پس آیت ۴۳ (طٰہٰ) میں "اذھبا" کا خطاب پہلے واقعے سے تعلق نہیں رکھتا بعد کا واقعہ ہے۔

واقعہ پیدائش کا ذکر

حضرت موسیٰؑ کو اُن کی پیدائش کا واقعہ اس لیے یاد دلایا گیا کہ انھیں معلوم ہو جائے مشیت الٰہی کا ہاتھ اول دن سے انھیں چُن چکا ہے، اور ایسے عجیب و غریب حالات میں ان کی پرورش ہوئی ہے جو بغیر قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ پھر ان کا مصر سے نکلنے پر مجبور ہونا اور مدین کے بیابانوں میں صحرا کی زندگی بسر کرنا بھی اسی لیے تھا کہ پیش آنے والے معاملہ کے لیے ان ساری باتوں کی ضرورت تھی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور شخصیت طیار ہوگئی، تو پردۂ غیب چاک ہُوا اور ندا حق نے نمودار ہو کر کام پر لگا دیا۔ چنانچہ اسی لیے فرمایا وفتناك فتونا، ہم نے تجھے ہر طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا۔ ثم جئت علیٰ قدر یاموسیٰ (۴۰) پھر بالآخر تم اس اندازے پر ٹھیک اتر آئے جو تمھاری تکمیل کے لیے ٹھہرا دیا گیا تھا۔

اپنے کام کے لیے چُنا

اس کے بعد فرمایا، واصطنعتك لنفسی۔ میں نے تجھے اپنے لیے بنایا اور تیار کیا "اپنے لیے" یعنی اپنے کام کے لیے۔ کائنات کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے بنتی ہے لیکن جب انسانوں کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی سچائی اور عدالت کے قیام کا ذریعہ ہوں، انھیں وہ خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ وحی کی عام اصطلاح ہے۔ گویا قدرت انھیں اس لیے بناتی ہے کہ اور کسی کام کے لیے نہ ہوں، صرف اسی ایک کام کے لیے پیدا ہوں، زندہ رہیں اور جان دے دیں!

بنی اسرائیل کی قنوطیت

مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل کے اخلاق و عواطف بالکل پژمردہ کر دیے تھے عزم و ہمت کا کوئی ولولہ ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ نے فتح و اقبال کے آنے والے وقت کی بشارت سنائی تو اکثر کو یقین نہیں آیا۔ چونکہ یہ بات علم الٰہی میں تھی، اس لیے یہاں آیت ۱۶ (طٰہٰ) میں پہلے سے خبردار کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو، ایسے لوگوں کی محرومیاں تمھیں بھی اقدام عمل سے روک دیں۔

لاٹھی کے سانپ بننے، ہتھیلی کے چمک اُٹھنے اور ہارونؑ کے وزیر و شریک ہونے کا ذکر تورات میں بھی ہے (خروج ۴) نیز یہ کہ خدا نے فرمایا "اب تو جا۔ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں (خروج ۳: ۱۰)

رب اشرح لی صدری" کی تشریح سورۂ " الم نشرح" میں ملے گی۔

جوتی اتار دینے کا حکم جوتی اتار دینے کا حکم اس لیے ہوا کہ تعظیم کی جگہ ننگے پاؤں ہوجانا قدیم اور عام رسم تھی، چنانچہ بابل اور مصر میں بادشاہ کے حضور برہنہ پا ہوکر آتے تھے۔ تورات میں بھی اس حکم کا ذکر ہے۔ (خروج ۳: ۶)

آیت ۱۵ (طہٰ) میں "الساعۃ" سے مقصود روزِ قیامت نہیں ہے جیسا کہ مفسروں نے سمجھا ہے بلکہ وہ وقت ہے بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی شکست کے لیے ظہور میں آنے والا تھا۔ چنانچہ سیاق و سباق اس کی وضاحت دے رہا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی ابتدائی زندگی پھر حضرت موسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کا وہ واقعہ بیان کیا ہے جب وہ مدین کی بستی میں مقیم تھے اور اپنے خسر کا گلہ چرایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا گزر سینا کے کوہ جوار میں ہوا اور وہیں یہ معاملہ پیش آیا۔ تورات میں اس جگہ کو "حورب" کہا ہے۔ یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا۔

تورات میں ہے کہ انھوں نے درخت میں آگ دیکھی اور متعجب ہوکر قریب گئے (خروج ۳: ۲) لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے، محض رفع تعجب کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ آگ کی جستجو میں تھے۔ سورۂ نمل کی آیت (۷) سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔ وہ مع اہل و عیال کے بیابان میں تھے۔ رات ٹھنڈی تھی اور سوچ رہے تھے، کہیں سے آگ مل جائے تو تاپنے کے لیے الاؤ جلائیں۔ اتنے میں دور ایک روشنی آگ کی طرح نظر آئی۔ یہ سمجھے آگ ہے لیکن جب قریب پہنچے تو کارفرمائے قدرت نے پکارا: اے موسیٰؑ! تو اس آگ کی چنگاری لے کر کیا کرے گا؟ تیرے ہاتھوں ایک دوسری آگ روشن ہونے والی ہے! وانا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ۔

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

صاحب "موسیٰؑ" آیت ۶۵ (الکہف) میں حضرت موسیٰؑ کے جس شخص سے ملنے کا ذکر کیا گیا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم عطا فرمایا تھا، وہ کون تھا؟ اس بارے میں قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی ہے صحیحین کی روایت سعید بن جبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام خضر تھا۔

اس بارے میں بہت سی روایتیں مفسرین نے نقل کر دی ہیں جن کی صحت محل نظر ہے، تصریحات متناقض اور زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔

پچھلی قوموں کا شمار حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: کیا پچھلی قوموں کے ایام و وقائع تم تک نہیں پہنچے؟ یعنی تم نہیں سن چکے ہو؟ پھر تین قوموں کا ذکر کیا جن کے حالات سے نہ تو بنی اسرائیل بے خبر تھے،

کے باشندے بے خبر ہو سکتے تھے، جہاں ان کی نشوونما ہوئی تھی۔ بقیہ قوموں کا حال چونکہ اس درجہ مشہور نہ تھا اس لیے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا، والذین من بعدھم لا یعلمھم إلا اللہ۔ لا یعلمھم الا اللہ میں یہ پہلو بھی موجود ہے کہ بہت سی قومیں تھیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے۔ تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ذکرِ ایام اللہ

(حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی الٰہی سے ایما ہوا تھا کہ اپنی قوم کو "ایام اللہ" کی عبرتیں اور بصیرتیں یاد دلائیں، کیونکہ ان میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے فتح و کامرانی کی بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں بنی اسرائیل مصر میں عرصہ تک مظلومی و مقہوری کی زندگی بسر کر چکے تھے اس لیے طبیعتوں میں مایوسی و بے ہمتی سرایت کر گئی تھی۔ مستقبل کے فتح و اقبال کی بشارتیں سنتے، مگر اپنے دل میں عزم و ثبات کے ولولے نہیں پاتے تھے۔ پس حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ انھیں "ایام اللہ" کے تذکرے سناؤ۔ ان تذکروں میں قوانینِ حق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی بڑی بڑی دلیلیں ہیں۔ یہ دلیلیں واضح کردیں گی کہ جو لوگ مصائب و محن کے مقابلہ میں ہمت نہیں ہار دیتے، سچائی کی راہ میں جمے رہتے ہیں اور سعی و عمل سے گھبراتے نہیں، ان کی کامیابی قطعی اور اٹل ہوتی ہے اور ہمیشہ ایسے ہی لوگ فتح و مراد سے ہم آغوش ہوئے ہیں!)

ستر آدمیوں کا انتخاب

حضرت موسیٰ کا قوم کے سرکش سرداروں میں سے ستر آدمیوں کو فیصلہ کے لیے چننا اور لرزا دینے والی ہولناکی کا ظہور۔

تورات میں ہے کہ سرداروں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰؑ کی بزرگی و پیشوائی سے انکار کیا تھا۔ اس پر حکم الٰہی سے ایک وقت مقرر کیا گیا اور سرکش گروہ جمع ہوا۔ اس وقت زلزلہ آیا، زمین پھٹی اور سب اس میں مدفون ہو گئے۔ (گنتی ۱۶: ۳۱)

بنی اسرائیل مصر کی ضلالت

بنی اسرائیل مصر کی بت پرستی سے اس درجہ مالوف ہو چکے تھے کہ رہ رہ کر انھیں اس کا شوق ہوتا۔ جونہی حضرت موسیٰ چالیس دن کے لیے الگ ہوئے، انھوں نے گائے کے بچھڑے کی طلائی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ تورات میں ہے کہ یہ مورتی حضرت ہارونؑ نے بنائی تھی (خروج ۳۱: ۳۲) لیکن قرآن نے دوسری جگہ واضح کر دیا ہے کہ یہ سامری نامی ایک شخص کی کارستانی تھی اور حضرت ہارونؑ کا دامن اس دھبے سے پاک ہے۔ (طٰہٰ: ۹۰)

عجائب پرستوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی ذرا سی بات عجیب نظر آئی، فوراً معتقد ہو گئے اور سمجھ بوجھ کو خیرباد کہہ دیا۔ سامری مصر کے مندروں کے بھیدوں سے واقف تھا، وہاں اس ترکیب سے مورتیاں بنائی جاتی تھیں کہ جونہی ہوا ان کے اندر جاتی، طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتیں۔ آج کل یہ صنعت باجوں اور کھلونوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں معبودوں کا معجزہ تھا۔ چنانچہ اس نے بچھڑے کی مورتی میں بھی یہی کاریگری رکھی۔ بنی اسرائیل اتنی ہی بات دیکھ کر معتقد ہو گئے۔ آیت ۱۴۸ (الاعراف) کا مطلب یہ ہے کہ ان عقل کے اندھوں نے اتنی موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ ایک ہی طرح کی

ں نکلتی ہے؟ آدمی کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟
ہندوستان کی طرح بابل اور مصر میں بھی بیل اور گائے کی عظمت کا تصور پیدا ہوگیا تھا۔ اگر کالڈیا کے تمدن کی قدامت تسلیم
ائے تو وہیں سے یہ خیال دوسرے ملکوں میں پھیلا ہوگا۔

ت موسیٰؑ کا دورِ ثانی

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا پہلا حصہ ختم ہوگیا، جس کا تعلق اُن ایام ووقائع سے تھا جو ان کے اور فرعون کے درمیان گزرے۔ اب یہاں سے وُہ واقعات شروع ہوتے ہیں
کے اور ان کی امت کے درمیان گزرے۔ پہلے حصے میں یہ حقیقت واضح کی تھی کہ دعوتِ حق کی مخالفت ہمیشہ
جماعتوں نے کی اور ہمیشہ ناکام رہیں۔ اس حصے میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ایک نئی ہدایت یافتہ جماعت کو
ہیں کیسی کیسی لغزشیں پیش آسکتی ہیں؛ تاکہ پیروانِ دعوت ان سے اپنی نگہداشت کریں۔

(ا) حضرت موسیٰؑ کا کوہ طور پر اعتکاف اور شریعت کا عطیہ، یہاں "شریعت" سے مقصود وہ دس احکام ہیں جو
موسیٰؑ نے وحی الٰہی سے پتھر کی دو تختیوں پر کندہ کیے تھے اور جنھیں تورات میں عہد کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی
ت کر، زنا مت کر وغیرہا (خروج ۳۴: ۲۹)

(ب) اس اصل عظیم کا اعلان کہ انسان اپنے حواس کے ذریعے ذات باری کا مشاہدہ وادراک نہیں کرسکتا اور اس
ں معرفت کا منتہیٰ مرتبہ یہ ہے کہ عجز و نارسائی کا اعتراف کیا جائے۔
یہودیوں نے تورات کے متشابہات کو حقیقت پر محمول کر لیا تھا اور سمجھتے تھے حضرت موسیٰؑ نے خدا کی شبیہ دیکھی۔
ج ۲۴: ۹) قرآن نے یہاں اس غلطی کا ازالہ کر دیا۔ فرمایا: جب خدا نے موسیٰؑ سے کلام کیا تو اس نے کہا: میرے سامنے
ایک نگاہ دیکھ لوں یعنی جب غیب سے ندائے حق سنی تو جوشِ طلب میں بے خود ہوگئے اور لذتِ سماع کی محویت
ذتِ مشاہدہ کے حصول کا ولولہ پیدا ہوگیا:

و الاذن تعشق قبل العین احیانا [1]

حکم ہوا پہاڑ کو دیکھ۔ اگر یہ تاب لا سکا تو تُو بھی تاب لا سکے گا، یعنی جو بات نظارہ سے مانع ہے وُہ خود تیری ہستی کا
ہے۔ یہ بات نہیں کہ نمود حق میں کمی ہو۔ ولنعم ما قیل!

ہرچہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

(ج) آیت ۱۴۵ (الاعراف) کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے جن حکموں کی ضرورت تھی، وُہ سب

---

[1] مولانا جامیؒ یوسف زلیخا میں فرماتے ہیں:
نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کایں دولت از گفتار خیزد

ان تختیوں کے احکام میں موجود تھے "تفصیلاً لکل شیئ" یعنی تمام باتیں الگ الگ کر کے بیان کر دی تھیں۔ یہ مطلب نہ کہ دنیا جہان کی ہر بات تشریح و تطویل کے ساتھ لکھ دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا تذکرہ اور اس حقیقت کی تلقین کہ جس طرح پیغمبر کی "تنذیر" ہمیشہ وقوع میں آئی اسی طرح "تبشیر" نے بھی اپنی برکتیں دکھلائیں۔ نیز بنی اسرائیل کے ایام و وقائع، جن میں مخاطبین قرآن کے لیے مواعظ و عبر تھے؛

(ا) حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے مطالبہ کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے رہا کر دے اور مصر سے نکل جانے دے۔ بنی اسرائیل حضرت یوسفؑ کے زمانے میں مصر گئے تھے اور عزت کے ساتھ ساتھ بسائے گئے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ مصریوں نے انھیں اپنا غلام بنا لیا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ کا ظہور ہوا۔

(ب) جب ایک افتادہ جماعت اٹھتی ہے اور اپنی حالت سنوارنا چاہتی ہے تو مستبد قوتیں اسے بغاوت سے تعبیر کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے دیا جائے لیکن امراء مصر نے کہا "یہ چاہتا ہے تم مصریوں کو تمھارے ملک سے نکال باہر کرے" اور سورۂ یونس میں ہے کہ انھوں نے موسیٰ سے کہا، تم چاہتے ہو ملک کی سرداری تمھیں مل جائے (۷۸)

(ج) ارکانِ حکومت کا مشورہ اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلے کے لیے جادوگروں کی طلبی۔ سورۂ طٰہٰ میں مزید تفصیل (دیکھو آیت ۵۸)

جادو کا اعتقاد

(د) مصر کے جادوگروں کا اجتماع اور حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ

جادوگروں کی نسبت فرمایا؛ لوگوں کی نگاہیں جادو سے مار دی تھیں۔ یعنی جادو کے شعبدوں کی کوئی حقیقت نہیں، محض نگاہ کا دھوکا تھا۔ چنانچہ دوسری جگہ اسے تخیل کی تاثیر سے بھی تعبیر کیا ہے (۲۰: ۶۶)

آیت ۱۱۷ (الاعراف) میں فرمایا: ما یأفکون یعنی ان کی نمائش جھوٹی تھی۔

جادو کا اعتقاد دنیا کی قدیم اور عالمگیر گمراہیوں میں سے ہے اور نوعِ انسانی کے لیے بڑی مصیبتوں کا باعث ہو چکا ہے۔ قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا لیکن افسوس ہے کہ دنیا متنبہ نہ ہوئی، اور ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی جہل و قساوت نے ہزاروں بے گناہ انسانوں کو زندہ جلا دیا۔

(ہ) جادوگروں کا بری طرح ہارنا، حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا، فرعون کا اسے سازش قرار دینا اور قتل و تعذیب کی دھمکی۔

جادوگروں کا ایمان

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ یہ معاملہ مصریوں کے تہوار کے دن پیش آیا تھا اور مملکت کی تمام آبادی جمع تھی اور خود حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں کو نصیحت کی تھی اور وہ متاثر

آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے لیکن چونکہ فرعون نے اس معاملے کو قومی خطرہ کا رنگ دے دیا تھا، اس لیے مقابلے پر جمے رہے۔ انھوں نے آپس میں کہا "موسیٰ ہمیں نکال کر ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔" ۶۳

جب فرعون نے دیکھا، تمام باشندگانِ ملک کے سامنے اسے شکست ہوئی اور جن جادوگروں پر بھروسا کیا گیا تھا، وہی ایمان لے آئے، تو ڈرا، کہیں ایسا نہ ہو، لوگ حضرت موسیٰؑ کے معتقد ہو جائیں اس لیے جادوگروں پر مکر و سازش کا الزام لگایا یعنی حضرت موسیٰؑ سے مل گئے ہیں۔ اس لیے جان بوجھ کر انھیں فتح مند کرا دیا اور پھر فوراً ان پر ایمان لے آئے۔

سچا ایمان اگرچہ ایک لمحہ کا ہو، ایسی روحانی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے مرعوب و مسخر نہیں کر سکتی۔ وہی جادوگر جو فرعون سے صلہ و انعام کی التجائیں کر رہے تھے، ایمان لانے کے بعد معاً ایسے بے پروا ہو گئے کہ سخت سے سخت جسمانی عذاب کی دھمکی بھی انھیں متزلزل نہ کر سکی!

فرعون کا حضرت موسیٰؑ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو کر فیصلہ کرنا کہ انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دینا کہ بنی اسرائیل کے لڑکے قتل کر دیئے جائیں تاکہ ان کی تعداد بڑھنے نہ پائے۔

فرعون نے پہلے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کے خاندان کے ایک آدمی نے کہ دل میں مومن تھا، اس سے باز رکھا (دیکھیے المومن : ۲۸) پس یہاں درباریوں اور فرعون کے مکالمہ کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب حضرت موسیٰؑ آزاد چھوڑ دیئے گئے تو درباریوں نے کہا: یہ شورش پھیلائے گا اور ہمارے دیوتاؤں سے علانیہ برگشتہ رہے گا۔ اس پر فرعون نے کہا: ڈرنے کی کیا بات ہے؟ بنی اسرائیل تو ہماری طاقت کے تلے دبے ہوئے ہیں۔

مصری مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے "رع" کہتے تھے اور چونکہ پادشاہ کو اس کا اوتار سمجھتے تھے، اس لیے اس کا لقب "فارع" تھا۔ یہی فارع عبرانی میں "فاراعو" اور عربی میں فرعون ہو گیا۔

محکومانہ زندگی کے اثرات

(ط) محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم و ہمت کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ لوگ غلامی کے ذلت انگیز امن پر قانع ہو جاتے ہیں اور طلب و سعی کی مشکلوں سے جی چرانے لگتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا ہوا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہتے رہتے اس درجہ مسخ ہو گئے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، آزادی و کامرانی کی طلب میں اُن حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آ رہی ہیں؛ حضرت موسیٰؑ نے جب صبر و استقامت کی تلقین کی تو شکرگزار ہونے کی جگہ اُلٹی شکایتیں کرنے لگے۔ وہ ان کی نجات و کامرانی کے لیے فرعون کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انھیں شکایت تھی کہ تمھاری اس جدوجہد نے فرعون کو اور زیادہ ہمارا مخالف بنا دیا۔ تم فائدہ

پہنچانے کی جگہ اُلٹے وبال جان ہو گئے۔

(ی) حضرت موسیٰؑ نے کہا، خدا جسے چاہتا ہے، زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ پس اس سے مدد مانگو اور اس راہ میں جمے رہو۔ اس سے معلوم ہوا، جو جماعت دنیوی بے سروسامانی سے ہراساں ہو کر بے ہمت نہیں ہو جاتی، خدا کی مدد پر بھروسا کرتی اور مشکلات و موانع کے مقابلہ میں جمی رہتی ہے وہی ملک کی وراثت کی مستحق ہوتی ہے۔ یعنی "استعانت باللہ" اور "صبر" اس راہ میں اصل اصول ہے۔ نیز فرمایا "انجام کار متقیوں کے لیے ہے" یعنی جو جماعت برائیوں سے بچنے والی اور عمل میں پکی ہوگی، بالآخر کامیابی اسی کے لیے ہے۔

قومِ فرعون پر شدائد

قومِ فرعون پر نکبت و شدائد کا ورود اور پہلے سرکشی، پھر حضرتِ موسیٰؑ سے رجوع۔ تورات میں ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی طرح ہو گیا تھا، اور تمام مچھلیاں مر گئی تھیں۔

آیت ۱۳۵ (الاعراف) میں فرمایا، ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انھیں اس تک پہنچنا تھا یعنی آنے والا وقت تھا جس کی طرف وہ اپنے اعمال کے ذریعے بڑھ رہے تھے اور بالآخر پہنچنے والے تھے۔

یہ آنے والا وقت کون سا تھا؛ ان کے ظلم و فساد کا آخری نتیجہ کہ خدا کے قانونِ جزا نے اس طرح کے نتیجہ کی جتنی مقدار فساد و عمل کی ٹھہرا دی ہے، جب وہ مہیا ہو گئی تو نتیجہ ظہور میں آ گیا اور فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا۔

یہی ظہورِ نتائج کا وقت ہے جسے قرآن نے امتوں کی "اجل" سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت ۳۴ میں اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

اس سے معلوم ہوا، ہر جماعت اپنے اعمال کے ذریعے ایک خاص نتیجہ تک پہنچتی رہتی ہے جو اس کی مقررہ اجل ہے۔ اگر اعمال نیک ہوتے ہیں تو یہ اجل فلاح کی ہوتی ہے۔ بُرے ہوتے ہیں تو ہلاکت کی ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی وراثتِ ارضی

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ظالم قومیں جن مظلوم قوموں کو حقیر و کمزور سمجھتی ہیں بالآخر وقت آتا ہے کہ وہی شاہی و جہانداری کی وارث ہو جاتی ہیں۔

آیت ۱۳۷ (الاعراف) سے معلوم ہوا کہ خدا کا وعدۂ نصرت اُنھی کے حق میں پورا ہوتا ہے جو اس کی شرطیں پوری کریں یعنی راہِ عمل میں جمے رہیں۔ اگر بنی اسرائیل جمے نہ رہتے، تو فتح مندی سے محروم رہتے۔

بنی اسرائیل چونکہ مصری بُت پرستی سے مانوس ہو چکے تھے، اس لیے سینا کے بُت خانے دیکھ کر خواہشمند ہوئے کہ ان کی پرستش کے لیے بھی ایک بُت بنا دیا جائے۔

فرعون کی نعش

سورۂ یونس کی آیت (۹۲) کا مضمون بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے یعنی مشیت الٰہی کا یہ فیصلہ کہ فرعون کے جسم کو غرق ہونے سے بچا لیا جائے گا تاکہ آنے والی قوموں کے لیے قدرتِ حق کی

ثانی ہو اور اسی لیے قدیم مفسرین کو حل مطلب میں مشکلات پیش آئیں لیکن دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو مطلب واضح ہے۔

قدیم مصریوں میں حنوط کا طریقہ رائج تھا یعنی بادشاہوں اور امیروں کی نعشیں ایک خاص طرح کا مسالہ لگا کر ایک وقت تک کے لیے محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے اوائل سے اس وقت تک بے شمار نعشیں مصر میں نکل چکی ہیں اور دنیا کا کوئی عجائب خانہ نہیں جس کے حصے میں دو چار نعشیں نہ آئی ہوں۔ اس طرح کی نعشوں کے لیے یونانیوں نے "ممی" کا لفظ استعمال کیا تھا جو غالباً مصریوں ہی کی اصطلاح تھی۔

آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرمایا، تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا لیکن تیرا جسم سمندر کی موجوں سے بچا لیا جائے گا تاکہ وہ حسب معمول ممی کر کے رکھا جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے عبرت و تذکیر کا موجب ہو۔

اگر مصریات (ایجپٹیالوجیا) کے بعض علماء کی یہ تحقیق درست ہے کہ یہ فرعون رعمیس ثانی تھا تو اس کا بدن آج تک زایل نہیں ہوا کیونکہ اس کی ممی نکل آئی ہے اور قاہرہ کے دارالآثار میں صحیح و سالم موجود ہے۔

باب ۳۲

سامری اور گوسالہ پرستی کا معاملہ

سورۃ طٰہٰ کی آیت ۸۰ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور یہ مقام بھی من جملہ اُن مقا[مات]
کے ہے جن میں قرآن کی تصریحات تورات کے موجودہ نسخے سے مختلف واقع ہوئی ہیں اور اس کی صریح تحریفات نمایا[ں]
کرتی ہیں لہ خروج (باب ۳۲: ۱-۵) میں ہے کہ سنہرا بچھڑا خود حضرت ہارونؑ نے بنایا تھا لیکن قرآن نے یہاں صاف صاف ک[ہا]
کہ حضرت ہارونؑ کا دامن اس شرک سے پاک تھا۔ یہ دراصل سامری کی کارستانی تھی۔

سامری کون تھا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اس کا نام تھا، یا قومیت کا لقب؟
قیاس کہتا ہے کہ یہاں "سامری" سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیونکہ جس قوم کو ہم نے
سُمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آرہا ہے اور اب بھی عراق میں ان
بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں قرآن کا "السامری" کہہ کر اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں، اُس
قومیت کی طرف اشارہ ہے، یعنی وُہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبہ میں دو مختلف قومیں آ[باد]
ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی، عرب تھ[ی]
دوسری، جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اُتری، سُمیری تھی۔ اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سام[را]
اور آور آباد ہوا تھا۔ جس کا محل اب تلّ العُبید میں دریافت ہُوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہُو[ئے]
زیور اور سنہری ظروف برآمد ہو رہے ہیں۔

سُمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارے میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قایم نہیں کی جا سکتی ہے، لیکن
نینوئی میں آشور بنی بال[1] (متوفی ۶۲۶ھ ق-م) کا جو کتب خانہ نکلا ہے، اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت[2] کی کتاب

---

[1] اشور بنی پال، اشوریوں کا بادشاہ۔ یہ نینوئی کا وہی عظیم الشان شاہنشاہ ہے جسے یونانی نوشتوں میں سردانا پالس (ARDANAPALUS
کے نام سے پکارا گیا ہے۔ [2] یہ لغت کی کتاب قدیم اقوام کے علوم و ادبیات میں اپنی کوئی دوسری نظیر نہیں رکھتی اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے
اب سے تین ہزار سال پہلے دوآبہ و فرات کی علمی ترقیاں کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس لغت میں صرف آکادی اور سُمیری زبان ہی کے ہم معنی الفاظ جمع نہیں کیے
بلکہ حتّی، قاسی اور مصری زبان کے ہم معنی الفاظ بھی آگئے ہیں۔ اس کتاب کے انکشاف نے قدیم زبانوں کے حروف و اصوات کے لیے ایک مستند او[ر] قطعی [ذریعہ]
بہم پہنچا دیا (حتّی وہی قوم ہے جسے آجکل (HITTIT) لکھا جاتا ہے اور قاسی سے مقصود (KASSITE) ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی ہے۔ جس میں آکادی اور سُمیری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سُمیری زبان کے اصوات سامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے، بہت ممکن ہے کہ وُہ بھی دراصل اُنھی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعید تعلق رکھتے ہوں جن کے لیے ہم نے تورات کی اصطلاح "سامی" اختیار کرلی ہے۔

نسل انسانی کے دو قبائلی سرچشمے

اصل یہ ہے کہ جس طرح عہد قدیم میں منگولیا کا علاقہ صحرا نورد قبائل کا ابتدائی سرچشمہ رہا ہے اور یہاں سے انسانی گروہوں کے قافلے نکل کر وسط ایشیا، ہندوستان، ایران، اناطولیہ۔ پھر تمام یورپ میں پھیل گئے، ٹھیک اسی طرح نسل انسانی کے اقدام و انشعاب کا ایک مرکزی سرچشمہ جزیرہ نمائے عرب بھی رہ چکا ہے۔ یہاں کے صحراؤں میں یکے بعد دیگرے نسل انسانی کا مواد بنتا رہا۔ پھر اُبل اُبل کر دُور دُور تک پھیلتا گیا۔ فلسطین، شام، مصر، عراق، آرمینیا اور خلیج فارس کی ساحلی آبادیاں، سب اسی مرکزی نسل کا انشعاب تھیں ورسب کا تمدن اسی عربی نسل کا تمدن تھا۔ قوم "عیلام" جس کا ذکر کتاب پیدائش میں آیا ہے اور جو جنوبی ایران میں آباد تھی، عجب نہیں، دراصل اسی نسل کی ایک شاخ ہو۔ (اس مقام کی مزید تفصیل سورۂ نوح کی تشریحات میں ملے گی)

بہرحال سُمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا مگر یہ دُور دُور تک پھیل گئے تھے۔ مصر سے ان کے تعلقات کا سُراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے، اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰؑ کا بھی معتقد ہوگیا رجب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سامری کا ایمان اور ارتداد

(گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سُمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی۔ مصری اپنے دیوتا حورس کا چہرہ گائے کی شکل کا بناتے تھے اور خیال کرتے تھے، کرۂ زمین ایک گائے کی پشت پر قائم ہے۔ جب سامری نے دیکھا، بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی سے مضطرب ہورہے ہیں، اس نے کہا، مجھے سونے کے زیور لادو۔ پھر انھیں گلا کر بچھڑے کی ایک مورتی بنادی۔ مصری مندروں کی مخفی کاریگریاں سے معلوم تھیں۔ اس نے مورتی کے اندر ہوا کے نفوذ و خروج کی ایسی کل بٹھادی کہ اس سے ایک طرح کی آواز نکلنے لگی۔)

سامری حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہوگیا تھا لیکن اسرائیلی توحید پر اس کا دل جما نہیں تھا۔ چند دنوں اس طریقے پر کاربند رہا۔ پھر منحرف ہوگیا۔ اسی لیے جب حضرت موسیٰؑ نے پُوچھا: یہ تو نے کیا کیا؟ تو اس نے کہا: بصرت بما لم یبصروا بہ۔ (مجھے ایسی بات سجھائی دی جو دوسروں کو نہیں سوجھی) یعنی بچھڑا بنانا۔ فقبضت من اثر الرسول

(بقیہ حاشیہ صلنڈ ۳) ان دونوں کے لیے تورات میں عتق اور قاضی کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی وہی اختیار کیے۔ تفصیل کے لیے دیکھو ایم جسٹرو کی دی سویلیزیشن آف بابیلونا اینڈ اسیریا مطبوعہ ۱۹۱۵ء اور سر ای۔ اے۔ ڈبلیو BUDGE کی "بابی نایل اینڈ گریز مطبوعہ ۱۹۲۰ء)

قبضۃ تھا۔ میں نے رسول کی پیروی میں تھوڑا بہت حصّہ لیا تھا، مگر پھر چھوڑ دیا۔ یعنی گو میں نے آپ کی پیروی میں چند قدم اٹھا دیے تھے مگر میرا دل اس پر جما نہیں تھا۔ وکذٰلک سوّلت لی نفسی۔ کیا کروں، میری طبیعت میں ایسا ہی تقاضا ہوا۔ میں آپ کے پیچھے چل نہ سکا۔

عربی میں جب کہیں گے قبضت قبضۃ "میں نے صرف ایک مٹھی اٹھائی، تو اس کے معنی تقلیل کے ہوں گے۔ قبضت قبضۃ۔ ای شی قلیل، والقبضۃ المقدار المقبوض (ابن سیدہ) اردو کا بھی محاورہ ہے۔" میں نے تو صرف ایک ہی مٹھی اٹھائی ہے"۔ یعنی بہت تھوڑا حصہ لیا ہے۔

گوسالہ کی نسبت یہودی خرافہ

یہودیوں نے اپنی قومی برأت کے لیے یہ کہانی گڑھ لی تھی کہ گوسالہ پرستی کے معاملہ میں ایک روحانی طاقت کا ہاتھ کام کر رہا تھا ورنہ ہمارے اسلاف کیوں ایسی گمراہی میں پڑتے؛ وہ کہتے تھے: بچھڑے کی گویائی اس مٹی کا معجزہ تھی جو حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کے سموں سے پامال ہوئی تھی۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو ان کے آگے آگے جبریلؑ جا رہے تھے اور زندگی کے فرشتے پر سوار تھے جس نے گھوڑے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس گھوڑے کے سم جس مٹی پر پڑتے تھے اس میں زندہ کر دینے کی خاصیت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ بات کسی نے نہیں دیکھی لیکن سامری نے دیکھ لی۔ پس اس نے بچھڑا بنا کر اس میں (آبِ حیات کی جگہ) اس "خاکِ حیات" کی ایک مٹھی ڈال دی۔ بس پھر کیا تھا وہ زندہ ہو کر بولنے لگا۔

مفسرین کا تسامح

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی تفسیر کی روایتوں میں بھی داخل ہو گئی اور "اثرالرسول" کا مطلب یہ بنا لیا کہ "جبریلؑ کے نقشِ قدم" کی ایک مشتِ خاک سامری نے اٹھا لی تھی لیکن یاد رہے کہ یہ تفسیر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایسی تفسیر کرنا قرآن کے اس مقام کو تمسخر انگیز حد تک بےمعنی بنا دینا ہے۔

اولاً قرآن نے اس معاملے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے اور یہ بات بلاغتِ قرآنی کے صریح خلاف ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو قیاس اور قرینہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا بیان نہ کرے۔ پھر اچانک صرف "اثرالرسول" کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دے۔

ثانیاً، قرآن میں جہاں کہیں بھی بغیر اضافت و اسناد کے "الرسول" کہا گیا ہے، اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے، یعنی پیغمبر۔ پس یہاں "الرسول" سے فرشتہ سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

بیانِ قرآن سے اختلاف

ثالثاً: ایسا سمجھنا صریح قرآن کو جھٹلانا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ بچھڑے کی مورتی میں زندگی پیدا ہو گئی تھی بلکہ صاف صاف کہتا ہے کہ جسداً لہٗ خوار۔ ایک بےجان دھڑ تھا جس سے آواز نکلتی تھی۔ اگر ایک ملکوتی کرشمہ نے اُسے زندہ کر دیا ہوتا،

قرآن اسے عجلاً جسداً کیوں کہتا؟

رابعاً: قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ اس مورتی میں کوئی بات نہ تھی۔ محض ایک شعبدہ تھا کیونکہ وہ بنی اسرائیل کے استعجاب و تاثر کو ان کی حد درجہ بیوقوفی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے: افلا یرون الا یرجع الیھم قولا؟ ی اِن عقل کے اندھوں نے اتنی بات بھی نہ دیکھی کہ اگر یہ کوئی زندہ وجود ہے تو اُن کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ مالی بھاں بھاں کیوں کرتا رہتا ہے؟ پھر اگر مفسروں کی یہ کہانی مان لی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کا یہ بیان ت قلم غلط ہے کیونکہ اس میں تو ایک ملکوتی معجزہ تھا۔ اس کے اندر تو جبریلی زندگی کی ایک روح دوڑ رہی تھی!

نہائی جسارت

خامساً: یہ کہانی خود اپنی بناوٹ ہی میں ناقابل تسلیم ہے۔ اگر فی الحقیقت کوئی ایسا ملکوتی مظاہرہ ہوا تھا اور بصرت بما لم یبصروا بہ کے یہی معنی ہیں تو ماننا پڑے گا کہ سامری کی دحانی بصیرت تمام بنی اسرائیل سے حتٰی کہ حضرت ہارونؑ سے بھی کہ پیغمبر تھے بڑھی ہوئی تھی کیونکہ یہ کرشمہ الٰہی کوئی دیکھ سکا۔ صرف اس کی نگاہ حقیقت شناس کام کر گئی بلکہ کہنا پڑے گا خود حضرت موسٰیؑ سے بھی بڑھی ہوئی تھی کیونکہ ہ بھی یہ بات نہ پا سکے۔ لیکن کیا ایسا مانا جا سکتا ہے؟ حمزہ، کسائی اور اعمش کی قرأت میں بما لم یبصروا بہ جگہ بما لم تبصروا بہ (بالمثناۃ) ہے۔ اگر یہ قرأت اختیار کر لی جائے تو صریح مطلب یہ ہوگا کہ "میں نے وہ بات دیکھ لی جو تم بھی نہ دیکھ سکے"۔ یعنی حضرت موسٰیؑ بھی نہ دیکھ سکے۔ پھر کیا "بصرت" کو اس کہانی پر لے جانا صحیح ہو سکتا ہے؟

ان مفسروں کی تصریح

سادساً: خود یہی مفسر عجلاً جسداً لہ خوار کی تفسیر میں یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ خوارہ کان بالریح۔ لانہ کان عمل فیہ خروقاً، فاذا دخلت الریح فی جوفہ خار، ولم یکن فیہ حیاۃ یعنی اس میں زندگی نہ تھی۔ محض ہوا کے نفوذ سے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگتی تھی۔ پھر جب یہ تفسیر بھی موجود ہے تو کون سی وجہ ہے کہ خواہ مخواہ حضرت جبریلؑ کو گھسیٹا جائے اور فرشتوں کو گھوڑا بننے کی زحمت دی جائے؟

سابعاً: جن روایتوں کی بنا پر یہ کہانی چلی ہے اگر ان کے متن سے قطع نظر کر لی جائے تو بہ اعتبار اسناد کے بھی قابلِ اعتنا نہیں۔ سب سے زیادہ زور ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم کی روایت پر دیا جاتا ہے جس میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا گیا ہے لیکن وہ بھی مجروح ہے اور حاکم کی تصحیح کی جو قدر و قیمت ہے وہ ہم امام ذہبی کی زبانی سُن چکے ہیں۔

بچھڑا کیوں کر بنا

آیت ۸۷ (طہ، میں "فقذفنٰھا" تک لوگوں کا جواب ہے۔ اس کے بعد "فکذٰلک" سے قرآن واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ یہ لوگوں کے جواب کا ٹکڑا نہیں۔ صرف اتنی سی بات پر غور نہ کرنے کی وجہ سے مفسروں اور مترجموں نے اس مقام کا پورا مطلب خبط کر دیا اور اسلوب کلام کی بھی ساری

کل گئی۔ اب ہم نے جس طرح ترجمہ کیا ہے، اس پر غور کرو۔ مصری گردن اور سر پر سونے کے بھاری زیور پہنتے تھے یہودیوں نے بھی وہ اختیار کر لیے تھے۔ اور جب نکلے تو پہنے ہوئے نکلے۔ انھی کو گلا کر سامری نے بچھڑا بنایا تھا۔ اب جب حضرت موسیٰؑ نے پرستش کی تو لوگوں نے اپنا بچاؤ یہ کہہ کر کرنا چاہا کہ ہمارا اور کچھ قصور نہیں۔ مصری زیوروں کا بڑا بوجھ ہمارے سروں پر پڑا تھا۔ ہم نے چاہا اسے پھینک دیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ سامری اس سے ایک عجیب و غریب چیز بنا کر ہمیں گمراہ کر دے گا۔

قرآن کہتا ہے۔ ہوا تھا ایسا ہی۔ انھوں نے اپنا سب زیور اتار دیا اور سامری نے اسے گلا کر بچھڑا بنا لیا۔

جماعت سے خارج

جب حضرت موسیٰؑ نے سامری سے پوچھا تو دینِ حق سے کیوں پھر گیا؟ تو اس نے کہا: میں نے اللہ کے رسول کی (یعنی آپ کی) ایک حد تک پیروی کی۔ کیونکہ جو بات میری قوم کے دوسرے آدمی نہ پا سکے، میں نے پالی تھی، مگر پھر میں نے آپ کا طریقہ چھوڑ دیا۔ میری طبیعت کے بے اختیارانہ ولولے نے مجھے اس کے لیے مجبور کر دیا تھا کیونکہ میرا آبائی طریقِ عبادت یہی ہے۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے اسے جماعت سے باہر کر دیا اور حکم دیا: کوئی اس سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھے "ان تقول لا مساس" (طٰہٰ: ۹۷) کا مطلب ہے کہ لوگ تجھ سے اس درجہ نفرت کرنے لگیں گے کہ تیری چھوت سے بھاگیں گے۔ تو "لا مساس" یعنی اچھوت ہو جائے گا۔ کہتا پھرے گا مجھے کوئی نہ چھوئے۔

سامری کی سحر آفرینی

سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۳ سے سامری کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔

پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ طور پر معتکف ہونے کے لیے گئے تو قوم کو حضرت ہارونؑ کی نگرانی میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں سامری کا فتنہ ظہور میں آیا۔ یہاں آیت ۸۳ (طٰہٰ) میں اسی طرف اشارہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ جب قوم کو پیچھے چھوڑ کر طور پر پہنچ گئے تو وحی الٰہی نے انھیں مخاطب کیا "کس بات نے تجھے قوم کی طرف سے اس درجہ مطمئن کر دیا کہ فوراً انھیں چھوڑ کر چلا آیا؟" حضرت موسیٰؑ جو پیش آنے والے واقعہ سے بے خبر تھے بولے میں نے مقررہ وقت پر آنے میں جلدی کی کہ تو رضامند ہو اور قوم میرے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ فرمایا: "ہاں، مگر قوم کا یہ حال ہے کہ اتنے ہی دنوں میں گمراہ ہو گئی۔"

باب ۳۴

حضرت شعیبؑ

بائبل میں حضرت شعیبؑ کو حوباب اور یثرو لکھا گیا ہے۔ مولانا سید سلیمان مرحوم نے ایک جرمن فاضل کا بیان "ارض القرآن" میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

اصل نام حوباب تھا۔ یثرو ایک اعزازی لقب تھا جس کے لغوی معنی "کامل" کے ہیں۔ جس طرح یہودیوں کے ہاں "کاہن" اور مسلمانوں کے ہاں "امام" کا لفظ ہے۔ (ارض القرآن جلد دوم ص ۱۰)

حضرت شعیبؑ کا ذکر اعراف، ہود اور عنکبوت میں آیا ہے۔ مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل مدین کے لیے مبعوث ہوئے تھے جن کی آبادیاں خلیج عقبہ کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تجارتی شاہراہ تھی جس سے ایشیا کے مختلف حصوں کے قافلے گزرتے ہوئے مصر جاتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں جتنی خرابیاں کسی قوم میں پیدا ہوسکتی ہیں، وہ سب اہل مدین میں موجود تھیں یعنی ناپ تول میں کمی، سود بٹہ یا اس قسم کی تمام چیزوں میں پیسے بٹورنے پر نظر اور حق و انصاف سے بے پروائی بلکہ قافلوں پر قزاقانہ حملے بھی کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان خرابیوں کا ذکر موجود ہے اور ان سے کہا گیا ہے:

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ (اعراف ۸۵)

ماپ تول پورا کیا کرو۔ لوگوں کو (خرید و فروخت میں) ان کی چیزیں کم نہ دو ملک کی اصلاح کے بعد (جو دعوت حق کے قیام سے ظہور میں آرہی ہے) اس میں خرابی نہ ڈالو۔

اہل مدین بنو قطورا میں سے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے تھے لیکن ان بدنصیب لوگوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت قبول نہ کی اور سرکشی کی سزا پائی۔

مدین کے علاوہ حضرت شعیبؑ کو اصحاب الایکہ کی طرف بھی بھیجا گیا تھا۔ ان لوگوں کی آبادی کسی نے تبوک کے آس پاس بتائی ہے۔ اصحاب الایکہ کے معنی ہیں، جنگل والے۔ ان لوگوں کا دوسرا نام ددان ہے۔ ان کا وطن حضرت مسیحؑ سے ایک سو برس پیشتر اور ظہور اسلام سے سات سو برس پیشتر جنگل ہی میں تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے ارض القرآن جلد دوم ص ۲۷۔۲۸۔

حضرت شعیبؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے قریب تھا چنانچہ حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگے تھے تو مدین میں پہنچ کر حضرت شعیبؑ ہی کے پاس ٹھہرے تھے جنہوں نے ایک مدت کی خدمت گزاری کے بعد اپنی بیٹی کی

شادی حضرت موسیٰؑ سے کر دی۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت موسیٰؑ سے جو خدمت لی گئی تھی، اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ بیٹی سے نکاح کے معاوضے میں یہ کام لیا گیا۔ حقیقت میں اتنی مدت حضرت موسیٰؑ کو پیشِ نظر کام یعنی دعوتِ حق کی غرض سے تیار کرنے کے لیے ناگزیر تھی۔ ان میں ضروری خصوصیات دعوت پیدا ہو گئیں تو مصر جانے کی اجازت دے دی۔

انبیاؑ کی تعلیم

"مدین" کسی بستی کا نام نہیں۔ ایک قبیلہ کا نام تھا جو جزیرہ نمائے سینا میں عرب سے متصل آباد تھا۔ اسی میں حضرت شعیبؑ کا ظہور ہوا۔

قرآن نے حضرت شعیبؑ کی کوئی ایسی نشانی بیان نہیں کی جیسی دُوسرے پیغمبروں کی بیان کی ہے اور جو متکلمین کی اصطلاح میں "معجزہ" کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے تاہم قرآن حضرت شعیبؑ کی زبانی نقل کرتا ہے کہ "واضح دلیل آچکی" یہ "دلیلِ واضح" کیا تھی؛ حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو راست بازی و عدالت کی راہ دکھاتی تھی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ قرآن کے نزدیک انبیاء کی تعلیم بجائے خود دلیل بیّنہ اور حجت ہے اور ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری نشانی اور مصطلحہ معجزہ بھی ہو۔

حضرت شعیبؑ کی تعلیم

قبیلہ مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کا ظہور ہوا۔

تورات میں ہے کہ قطورہ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کے چھ لڑکے ہوئے جن میں ایک کا نام مدیان تھا (پیدائش ۲۵: ۱) یہی "مدیان" عربی میں "مدین" ہو گیا۔ اس کی اولاد بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی جن میں حضرت شعیبؑ کا ظہور ہُوا۔ بنی اسرائیل اُنھیں بنی قطورہ کہتے تھے۔

(۱) حضرت شعیبؑ نے کہا:

> اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ ناپ تول میں خیانت نہ کرو۔ نہ تو حق سے زیادہ لو نہ حق سے کم دو۔ ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو یعنی لوٹ مار نہ کرو۔ میں دیکھتا ہوں تم خوش حال ہو لیکن ڈرتا ہوں کہ عذاب میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔

قوم کا جواب

(ب) لوگوں نے کہا: تم اپنے خدا کی جتنی عبادت کرنی چاہو، شوق سے کرو۔ لیکن کیا تمھاری نمازیں یہ بھی کہتی ہیں کہ دوسروں کو ان کی راہ سے ہٹاؤ جس پر ان کے باپ دادا چلتے آئے ہیں؛ ہم اپنے مال کے مالک و مختار ہیں جس طرح چاہیں خریدیں، تم اپنے ناپ تول کی باتیں رہنے دو۔

معلوم ہوتا ہے، ساری دنیا میں صرف تم ہی ایک نیک اور خوش معاملہ آدمی رہ گئے ہو۔

علم و بصیرۃ کی راہ

(ج) حضرت شعیبؑ نے کہا: اگر اللہ نے مجھ پر علم و بصیرۃ کی راہ کھول دی ہو اور میں

دیکھ رہا ہوں کہ تم ہلاکت کی طرف جا رہے ہو، تو بتلاؤ کیا میرا فرض نہیں تمہیں سلامتی کی راہ دکھاؤں؟ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے رزق و دولت کی فراوانی عطا فرمائی ہے پھر کیا یہ کفرانِ نعمت نہ ہوگا کہ ادائے فرض میں کوتاہی کروں؟

پھر تم میری ضد میں آکر کیوں حق سے منہ موڑو؟ میں ایسا تو نہیں کرتا کہ تمہیں ایک بات سے روکوں اور خود وہی کرنے لگوں۔ میں وہی بات کہتا ہوں جس پر خود عامل ہوں۔

اور تم میری تبلیغ سے بگڑتے کیوں ہو؟ میں کچھ تم پر نگہبان بن کر تو نہیں کھڑا ہو گیا ہوں کہ مجبور کروں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرے بس میں ہے اور میرے کاموں کا بننا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بننا ہے۔ میرا بھروسا صرف اسی پر ہے!

مدین کا مقام (د) بحرِ قلزم کی جو شاخ عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان گزری ہے[۱]، اسی کے کنارے مدین کا قبیلہ آباد تھا۔ چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطۂ اتصال تھی، اس لیے اشیاءِ تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی تھی اور لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ اسی لیے حضرت شعیبؑ نے کہا: انی ارٰکم بخیر (ہود: ۸۴) میں تمہیں خوشحال پاتا ہوں۔

لیکن جب لوگوں کے اخلاق فاسد ہو گئے تو کاروبار میں خیانت کرنے لگے اور ناپ تول کے انصاف سے ناآشنا ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیبؑ نے خصوصیت کے ساتھ اس معصیت سے روکا۔

اتباعِ حق کا تقاضا (ھ) جو مکالمہ گزر چکا ہے اس پر اچھی طرح غور کرو۔ لوگوں نے کہا: تم نماز پڑھتے ہو لیکن تمہارے نماز پڑھنے کا نتیجہ یہ کیوں نکلے کہ ہم لوگوں کو بھی اپنی راہ چلنے کی دعوت دو؟ یعنی بنائے نزاع خود تمہارا عمل نہیں۔ یہ ہے کہ دوسروں کو کیوں دعوت دیتے ہو؟ حضرت شعیبؑ نے کہا، یہی تو میرا اصلی کام ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دوں؟ سچائی کی روشنی میرے سامنے آگئی ہے اور جب آگئی ہے تو اس کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔ البتہ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ مجھے حق نہیں کہ کسی پر جبر کروں۔

اس سے معلوم ہوا اتباعِ حق کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ آدمی خود متبع ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے۔

ذاتی خصومت (و) اتباعِ حق کی راہ میں ذاتی خصومت اور شخصی حسد سے بڑھ کر کوئی روک نہیں۔ مکالمہ سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ قبیلہ کے سرداروں کو حضرت شعیبؑ سے ذاتی خصومت ہو گئی تھی۔

---

[۱] یعنی خلیج عقبہ۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کہا: ایسا نہ کرو کہ میری ضد میں آکر پیام حق کے مخالف ہو جاؤ اور خدا کے مواخذہ میں گرفتار ہو۔

سچائی کا نہیں، انسانوں کا پاس

(ز) انسان انسانوں کا پاس کرتا ہے، لیکن سچائی کا پاس نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے خیال سے ایک بات چھوڑ دے گا لیکن خدا کے خیال سے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ منکروں نے کہا: ہم تجھے سنگسار کر دیتے لیکن تیرے کنبہ کے خیال سے ایسا نہیں کرتے۔ حضرت شعیبؑ نے کہا: افسوس تم پر، تمھیں میرے کنبہ کا تو پاس ہوا لیکن خدا کا نہ ہوا۔ خدا کی بات تو تمھارے خیال میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔

(ح) حضرت شعیبؑ نے کہا: اچھا، تم اپنی راہ چلو۔ میں اپنی راہ چل رہا ہوں اور نتیجہ کا انتظار کرو۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ اہل ایمان محفوظ رہے۔ سرکش ہلاک ہو گئے۔

مذہبی اعتقاد کا معاملہ

سورۂ اعراف کی آیت (۸۷) میں فرمایا: "وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے[1]"۔ دوسری جگہ خدا کے فیصلے کو "قضا بالحق" اور سب سے بڑی شہادت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہے؟ قانون الٰہی کا وہ اعلان جو "حق" کو کامیاب کر کے اور باطل کو ناکام رکھ کر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ آیت (۸۸) نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک مذہبی اعتقاد کا معاملہ دل کے یقین و طمانیت کا معاملہ ہے اور جبراً کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا[2]۔ نیز یہ کہ ہمیشہ داعیان حق اور منکرین حق میں بنائے نزاع یہی بات رہی کہ وہ (داعیان حق) کہتے تھے، ہمارا دل جس راہ کو حق سمجھتا ہے اسی پر چلیں گے۔ یہ (منکرین) کہتے تھے۔ نہیں ہم تمھیں جبراً اپنی راہ پر چلا کر چھوڑیں گے۔

---

[1] فَاصْبِرُوا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا (صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے)۔ [2] اشارہ ہے منکرین شعیبؑ کے اس قول کی طرف: لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا۔ (اے شعیب یا تو تجھے اور ان سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال باہر کریں گے یا مجبور کریں گے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔)

مختلف انبیاۓ کرامؑ

۳۴
ب
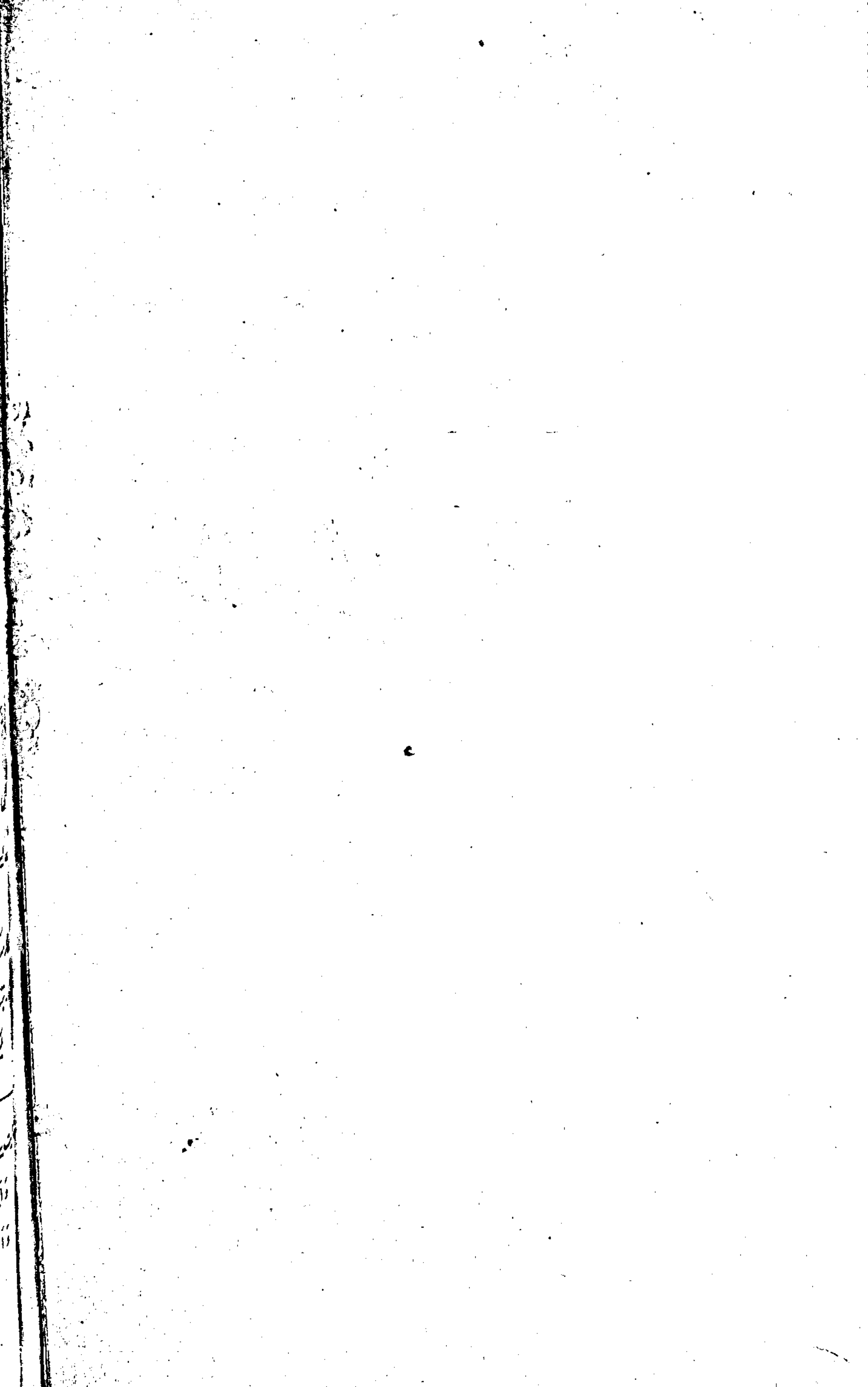
حضرت ایوبؑ

عہدِ عتیق میں "ایوب" کے نام سے ایک صحیفہ ہے اور اس میں اس نام کے ایک راست باز اور صابر انسان کی سرگزشت لکھی ہے۔ الانبیاء کی آیت ۸۳ میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے[1]۔

سرگزشت کا خلاصہ یہ ہے کہ "عوض کے ملک میں ایوب ایک کامل اور راست باز انسان تھا۔ خدا نے اُسے بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ اس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ...ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے تھے۔ اس کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے اور اہلِ مشرق میں اس درجہ ...دار کوئی نہ تھا۔ وہ اس دولت و شوکت کے لیے خداوند کا شکر گزار تھا اور ہمیشہ بدی سے دُور رہتا تھا۔

انقلاب حالت

پھر زندگی کی ساری مصیبتیں اُن پر آپڑیں۔ اُن کے مویشی لُوٹ لیے گئے۔ نوکر چاکر قتل ہو گئے۔ اولاد مر گئی۔ جاہ و حشم نابود ہو گیا اور زندگی کی خوش حالیوں میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔ ...بربادیوں کے یہ تمام زخم ایک ایک کر کے نہیں لگے اور اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔

لیکن عین اس حالت میں بھی حضرت ایوبؑ کی زبان سے کلمۂ صبر و شکر کے سوا اور کچھ نہیں نکلا۔ وُہ سجدہ میں گر پڑا ...کہا: "میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤں گا۔ خداوند نے مجھے دیا تھا اور خداوند نے ...لے لیا۔ اس کے نام کے لیے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں۔" (ایوب ۱: ۲۲)

سب کچھ جا چکا تھا صرف جسم کی تندرستی باقی رہ گئی تھی۔ اب اس نے بھی جواب دے دیا اور "ایوب کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک، سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ وُہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتا اور راکھ پر ...بیٹھا رہتا۔" (صحیفہ ابواب ۲: ۸)

لیکن اس پر بھی اس کی زبان ایک لمحہ کے لیے شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہُوئی!

---

[1] آیت یہ ہے:

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔

اور ایوب کا معاملہ بھی یاد کرو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا۔ میں دکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔

صبر و شکر

اب درد و مصیبت کی یہ حالت برابر بڑھتی ہی جاتی ہے لیکن جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، روح کا یقین دل کا صبر اور زبان کا زمزمۂ شکر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام صحیفۂ ایوب انھی دلنشیں مواعظ کا مجموعہ ہے جو ان کے درد و غم کی آہوں اور کرب و اذیت کی صداؤں کے اندر نمایاں ہوئے۔ ان کی ہر آہ حمد و ثنا کا نغمہ تھی اور ہر پکار صبر و شکر کی تلقین۔ اسلوب بیان یہ ہے کہ تین دوست مصیبت کا حال سن کر آتے ہیں اور اللہ کے کاموں اور حکمتوں پر ان سے رد و کد کرتے ہیں۔ پھر اللہ کی وحی انھیں مخاطب کرتی ہے اور ان کی آزمائش کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ "اور خداوند نے ایوب کی حالت بدل دی۔"

دو چند نعمتیں

اسے پہلے کی نسبت دوچند دولت عنایت کی۔ تمام عزیزوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ اسے آخری عمر میں پہلے کی طرح اولاد ملی۔ وہ ایک سو چالیس برس تک جیا اور اپنی نسل کی چار پشتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ (صحیفہ ایواب ۴۲:۱۰)

اس بات کے اظہار کے لیے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے لیے ایک آزمائش تھی، پیرایۂ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے "شیطان نے کہا، ایوب کی خدا پرستی و راست بازی اس لیے ہوئی کہ خدا نے اسے ہر طرح کی خوش حالیاں دے رکھی ہیں اگر وہ ان سے محروم ہو جائے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ ہو" لیکن وہ خوشحالیوں سے محروم ہو گئے پھر بھی ان کا ایمان و یقین گھٹنے کی جگہ اور زیادہ بڑھ گیا!

قرآن کا معجز نما بیان

قرآن نے صبر و شکر کی یہ پوری داستان یہاں صرف چند جملوں میں بیان کر دی ہے اور اس کا ایجاز بلاغت اتنا ہی موثر ہے، جتنا صحیفۂ ایوب کے پچاس صفحوں کا شاعرانہ اطناب ہے۔

سورۃ الانبیاء کی آیت (۸۳، ۸۴) پر ایک نظر ڈالو:

اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ.

(سورۂ انبیاء: ۸۳-۸۴)

اور ایوب کا معاملہ یاد کرو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا: میں دکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدایا تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔ پس ہم نے اس کی پکار سن لی اور جس دکھ میں پڑ گیا تھا وہ دور کر دیا۔ ہم نے اس کا گھرانا پھر سے بسا دیا اور ویسے ہی عزیز و اقارب اور بھی ویسے۔ یہ ہماری طرف سے اس کے لیے رحمت تھی اور یہ نصیحت ہے ان کے لیے جو اللہ کی بندگی کرنے والے ہیں۔

درد و مصیبت

۱۔ انی مسنی الضر میں ان کے درد و مصیبت کی ساری داستان آ گئی۔ کوئی گوشہ بھی نہ چھوٹا۔

اتھ ہی اسلوب خطاب یہ کہ "میں دکھ میں پڑگیا ہوں" نہ یہ کہ تُو نے مجھے دُکھ میں ڈال دیا ہے کیونکہ وہ تو کسی کو بھی دکھ میں
یں ڈالتا۔ اس نے جو کچھ بخشا ہے سرتا سر سکھ اور راحت ہے۔ جو حالت بھی ہمارے لیے دکھ ہو جاتی ہے ہماری ہی
درت حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کے مخاطبات میں ہر جگہ یہ حقیقت نمایاں ہوتی۔

انبیاءؑ کے مخاطبات حضرت آدمؑ نے کہا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (اعراف: ۲۲) خدایا ظلم ہم نے کیا اور مغفرت کی طلبگاری تجھ سے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی موعظت سورۂ الشعراء میں آئے گی۔

واذا مرضت فهو يشفين۔ (جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہی ہے جو مجھے شفا دیتا ہے)

نی بیماری میں پڑنا میری حالت ہوئی۔ شفا دینا اس کا کام ہوا کیونکہ اس کے ہاں جو کچھ ہے شفا ہی شفا ہے۔ اس کی
ت نے دارالشفا بنایا ہے بیماریاں بانٹنے کا گھر نہیں بنایا۔ وما احسن قول الشاعر العارف۔

کفر ہم نسبت بہ خالق حکمت است
چوں بہ ما نسبت کنی کفر آفت است

خدا سراپا خیر ہے یہی وجہ ہے کہ فرمایا: تعز من تشاء و تذل من تشاء بيدك الخير تو جسے چاہے
عزت دے دے، جسے چاہے ذلیل کر دے۔ ہر طرح کا خیر تیرے ہاتھ سے ہے۔
نی جسے عزت ملی وہ بھی خیر کی بات ہوئی، جسے ذلت ملی وہ بھی خیر کی بات ہوئی حالانکہ جسے ذلت ملی اس کے لیے تو
شر ہی کی بات ہوئی "خیر" کی بات نہ ہوئی لیکن قرآن کہتا ہے اس کے لیے اور اس کی اضافت سے "شر" کی بات۔ در
ونکہ خدا تو جو کچھ کرتا ہے خیر ہی خیر ہے۔ شر کا یہاں گزر نہیں۔ یہ ہم ہیں اور ہماری حالت ہے جو "شر" کا جامہ پہن
ا کرتی ہے:

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست!!

مسلم کی حدیث مسلم کی حدیث ابو ذرؓ میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے: یعبادی انما هی اعمالكم احصيها لكم
ثم اوفيكم اياها فمن وجد خيراً فليحمد الله و من وجد غير ذلك فلا يلومن
الا نفسه (اے میرے بندو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں، جنہیں میں تمہارے لیے ضبط کرتا ہوں۔ پھر ان کے
نتائج پورے پورے لوٹا دیتا ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی خیر پائے تو اللہ کی ستایش کرے اور جس کسی کو دوسری

حالت پیش آجائے تو اور کسی کا شکوہ نہ کرے خود اپنے نفس کو ملامت کرے۔

عرض حال ۲۰۔ اس کے بعد کہا: وانت ارحم الراحمین۔ غور کرو اس ایک جملے میں سفر ایوب کے کتنے صفحے آ گئے؟ اس میں حمد و ثنا بھی آ گئی۔ صبر و شکر کا دامن بھی نہیں چھوٹا۔ طلب و الحاح کا ہاتھ بھی دراز ہو گیا اور عجز و نیاز کی پیشانی بھی بندگی و تذلل کی زمین پر پڑ گئی "خدایا میں دکھی ہوں، تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو"

طوبی لعبد تکون مولاہ

اگر ایک فقیر بادشاہ سے کہے: میں محتاج ہوں اور تجھ سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں تو اس کے بعد اور کیا رہ گیا جو اس نے نہیں کہا؟ اور کیوں اس سے زیادہ اس کی زبان سے نکلے؟ بلاشبہ یہ عرض حال ہے اور طلب و سوال نہیں لیکن:

درحضرت کریم تقاضا چہ حاجت است

ظہور رحمت اس کے بعد صرف ایک آیت کے اندر پوری سرگزشت اور اس کا ماحصل بیان کر دیا۔ غور کرو آیت کس طرح ایک پورے صحیفے کا کام دے رہی ہے اور کس طرح اس کا ہر جملہ اپنی جگہ ایک پورا باب ہے؟

(ا) فاستجبنا لہ۔ ہم نے اس کی پکار سن لی۔ یعنی وحی الٰہی کی وہ اجابت جو سفر ایوب کے چار بابوں میں بیان کی گئی ہے۔ (۳۸ سے ۴۲ تک)

(ب) فکشفنا ما بہ من ضر پس درد و مصیبت میں سے جو کچھ اسے پیش آیا تھا سب دور کر دیا۔ اس میں وہ ساری مصیبتیں آ گئیں جن کی تفصیلات دو بابوں میں آئی ہیں۔

(ج) وآتیناہ اھلہ اس کا گھرانا اسے دے دیا۔ "دے دیا" یعنی اس سے کھویا گیا تھا پھر اسے واپس مل گیا۔ اس اشارے نے خاندانی مصیبت اور تفرقے کی ساری داستان بتلا دی۔

(د) ومثلھم معھم اتنا ہی اور بھی یعنی گھر بار کا جھگڑا دوچند کر دیا۔

(ہ) لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ سرگزشت کا ماحصل کیا ہے؟ رحمۃ من عندنا یہ ہماری طرف سے رحمت کا ظہور تھا۔ کیونکہ رحمت کو پکارا گیا تھا۔ وانت ارحم الراحمین۔ پس ضروری تھا کہ رحمت جواب دے۔

(و) وذکری للعابدین اور اس لیے کہ بندگی کرنے والوں کے لیے اس میں نصیحت ہو یعنی یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ جو عبادت گزار حق ہیں وہ کبھی رحمت الٰہی کی بخششوں سے محروم نہیں

رہ سکتے۔

قرآن کے قصص و اشارات قصص کا یہی حال ہے۔ ترجمان القرآن میں اس کی گنجایش نہیں نکل سکتی تھی
[مق]ام کی تفسیر اس تفصیل سے کی جائے۔ پس صرف اس مقام کی تفسیر کر دی گئی تاکہ اہل نظر کے لیے ایک نمونے کا
[کام د]ے اور تمام مقامات کا مطالعہ اسی روشنی میں کرسکیں۔

باب ۳۵

حضرت ایوبؑ اور عربی کی قدامت

حضرت ایوبؑ عرب تھے

اس سلسلہ میں چار باتیں اور یاد رکھنی چاہئیں:
اوّلاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوبؑ عرب تھے، عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفرِ ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔

ایوبؑ کہاں کے تھے؟

سفرِ ایوب میں ہے کہ وہ "عُوض" کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ اُن کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے اور کسدیوں (بابل) نے حملہ کیا تھا (۱: ۱۵) ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اوّل میں "عُوص" کو "ارام بن سام بن نوح" کا بیٹا کہا ہے اور "ارامی" بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس میں کوئی شک نہیں رہا۔ پھر اس مقام کا ایسی جگہ ہونا جہاں سباؔ اور بابل کے باشندے آکر حملہ آور ہوتے تھے، ایک مزید جغرافیائی روشنی ہے کیونکہ ایسا مقام بجز عرب کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہ عرب کا وہی مقام ہوگا جو قوم عاد کا مسکن تسلیم کیا گیا ہے یعنی عمان سے لے کر حضرموت تک کا علاقہ۔

سفرِ ایوبؑ کی قدامت

کتاب پیدائش اور تواریخ اوّل میں ایک اور سامی نام بھی ہمیں ملتا ہے یعنی "یوباب" یہ بنی یقطان میں سے تھا۔ یقطان، عبر سے پیدا ہوا اور عبر سلسلۂ ارفکسد بن سام سے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "یوباب" اور "ایوب" ایک ہی نام نہیں؟

بالاتفاق یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ تورات میں سب سے زیادہ قدیم صحیفہ یہی ہے اور حضرت ایوبؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے تھا لیکن اگر "یوباب" سے مقصود "ایوب" ہیں تو انھیں حضرت ابراہیمؑ کا معاصر ہونا چاہیے یا کم از کم حضرت اسحٰق اور یعقوب کا۔

ثانیاً سفرِ ایوب کا ایک ایک جملہ کہہ رہا ہے کہ میں شعر ہوں، نثر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے محققین تورات نے اسے بھی امثال اور زبور کی طرح اصلاً کتاب منظوم ہی قرار دیا ہے۔ بلاغتِ کلام، شعریتِ بیان اور بلندیٔ اسلوب کے لحاظ سے یہ اس درجہ کی کتاب ہے کہ عہد عتیق کا کوئی صحیفہ امثال و زبور کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد

ں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

بی علم ادب کی قدامت

نا ثانیاً معلوم ہوگیا کہ عربی علم ادب کی تاریخ اس عہد سے بہت پہلے شروع ہوجاتی ہے جو عہد عام طور پر سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ اگر حضرت موسیٰؑ سے پہلے ایوب جیسی نظم عربی میں لکھی جاسکتی تھی تو یقیناً عبرانی علم ادب کے نشو و نما سے صدہا سال پہلے عربی علم ادب ی طرح ترقی یافتہ ہوچکا تھا۔ بلاشبہ سفر ایوب کی عربی وُہ عربی نہ ہوگی جو نزول قرآن کے وقت بولی جاتی تھی۔ ناءً عربی کی کوئی ابتدائی شکل ہوگی، جس کی اخوات ہیں آرامی، کلدان اور آشوری کتبات کے الفاظ و اسماء میں آرہی ہیں اور قدیم مصری بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں تاہم وُہ عربی زبان ہی ہوگی اور اسی عربی نے موجودہ ں کے تمام عناصر و مواد بہم پہنچائے ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی عربی تھی لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی ل کی پروردہ نہیں ہوسکتی۔ اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج، اس درجہ متمول زبان، ضروری ہے کہ ریوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہو جو زبان قرآن کے معانی و دقایق کی متحمل ہوگئی، نکر ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کرلیا جائے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ وثوق کے ساتھ جاسکتا ہے، جس عربی میں امراءالقیس نے اشعار کہے ہیں، اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ م اور بہت زیادہ متمدن ہونی چاہیے، جتنی اس وقت تک سمجھی گئی ہے۔

بدید اثری انکشافات اور عربی کی قدامت

گزشتہ صدی تک عربی کی لغوی تاریخ کا یہ مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض محققین نے مجبور ہوکر یہ رائے قایم کرلی تھی کہ زبانوں کی تخلیق اور نشو و نما کا اسے ایک فوری تحوّل تسلیم کرلینا چاہیے لیکن اب اثری تحقیقات کے آخری مواد نے بحث و تعلیل کا ایک نیا میدان پیدا کردیا ہے اور عربی نسل ر عربی زبان کی تاریخ بالکل ایک نئی شکل میں نمودار ہورہی ہے۔ یہ زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مُہر رآن نے لگائی، دراصل مدنی نشو و نما کے اتنے مرحلوں سے گزرچکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف یں اس کی شریک نہیں۔ سُمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوٰی اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری عات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج و احاطہ، کلدانی اور سریانی کا ادبی تمول، دراصل ایک ہی زبان کی غوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مرحلے تھے اور اسی نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔ و زبان حضارت و تمدن کی اتنی بھٹیوں میں سے پک کر نکلی ہو، ظاہر ہے کہ اس کے اسماء و مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہوسکتے۔

تابوت اخیرام کا انکشاف اور عربی کتبہ

آج ہم تعجب کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ ظہور مسیح سے آٹھ نو سو برس پہلے اور بابلی زبان میں طبق، ملک، شمس، سماء، فلک، نجم، ارض وغیرہ ٹھیک ٹھیک انھی معنوں میں مستعمل تھے جن معنوں میں آج مستعمل ہیں نہیں بلکہ ۱۹۲۳ء کے ایک جدید انکشاف نے تو ہمیں تیرہ سو برس قبل مسیح تک پیچھے ہٹا دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ زبان کے ابتدائی مواد نے ایک کتابی اور ادبی زبان کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور اس میں نہ صرف موجودہ اسماء ہی پائے جاتے ہیں بلکہ بعض حروف نحویہ[1] تک موجود ہیں مثلاً حرف عطف وہی "د" ہے اور اپنی ابتدائی فنیقی شکل میں لکھا جا رہا ہے۔ الف لام بدستور حروف تعریف ہے اور ہر اسم کے پہلے اپنی نمود رکھتا ہے مثلاً الملک، الحی "ذی" (بمعنی ذو۔ ذوالجلال و ذوالقرنین) ہر جگہ نمودار ہے۔ اسم اشارہ وہی "ھُوَ" ہے۔ "علیٰ" اسی معنی میں جس میں اب مستعمل ہوتا ہے۔ نیز مُلک[2]، فعل، طمع، محن، فتح، محو۔ ٹھیک اُنھی معنوں میں بولے گئے ہیں جن میں لغتِ قریش میں بولے گئے۔

عربی کا یہ کتبہ ایک تابوت پر منقش ہے۔ اس میں "اخیرام" ملک ببلس[3] کی نعش رکھی گئی تھی اور اس کے "تو لعل" کے حکم سے طیار ہوا تھا۔ "اخیرام" کا نام توراۃ میں بھی آیا ہے اور تاریخی حیثیت سے اس کا زمانہ ۱۲۵۰ء قبل مسیح ہے۔ کتبہ کا خط وہی ابتدائی عربی خط ہے جسے عام طور پر فنیقی خط کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

---

[1] حروف نحویہ یعنی مصطلح نحو، ورنہ حروف ابجد تو سب کے موجود ہیں۔ [2] مُلک بمعنی بادشاہ نے تو ایسی لفظی صولت و تاثیر پیدا کرلی تھی کہ ایران کی آرین زبان بھی اسے برتنے پر مجبور ہوگئی۔ چنانچہ دارا ے اعظم اپنے کتبوں میں اپنے آپ کو "شہنشاہ" کی جگہ "ملک ملکان" کہتا ہے (دیکھو کتبہ استخر و بے ستون) بعد کو اردشیر بابکان نے "شاہ شاہان" کا لقب اختیار کیا جسے عرب نے "ساسان" بنا دیا۔ تاہم "ملک ملکان" کا لقب بھی شاپور ساسانی کے کتبوں میں بار بار آتا ہے جیسا کہ حاجی آباد کے کتبوں سے ظاہر ہے۔

علاوہ بریں ساسانی عہد میں عربی اسماء و الفاظ کے غلبہ و رسوخ کا یہ حال ہوگیا تھا کہ خود اَوِستا کی زبان عربی آمیز ہوگئی۔ ساسانی اَوِستا کے جو اجزاء ہندوستان کے پارسیوں سے ملے ہیں، ان میں جابجا عربی الفاظ و اصوات پائے جاتے ہیں۔ ایک مدت تک یہ آمیزش محل تعجب رہی، حتیٰ کہ سر ولیم جونس نے ان اجزاء کی اصلیت ہی سے انکار کر دیا مگر اب عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جس طرح بعد از اسلام کی فارسی جدید عربی سے مخلوط ہوئی ہے، اسی طرح قبل از اسلام قدیم فارسی قدیم عربی الفاظ سے مخلوط ہوگئی تھی۔ پوری شرح اس مسئلے کی مقدمہ میں ملے گی۔

[3] BYBLOS۔ اس کا موجودہ نام جُبَیل ہے۔

بل کر آرامی، سریانی اور نبطی خطوط کی شکلیں اختیار کی ہیں[۱]

چراغ

اس انکشاف نے تاریخ کے متعدد گوشوں کے لیے بحث و نظر کے نئے نئے چراغ روشن کر دیے۔ ازانجملہ یہ کہ معلوم ہوگیا، تورات کے نزول اور کتب خانۂ بابل کی الواح سے بھی پہلے عربی زبان کے مصادر نے ایک مکتوب و مرسوم زبان کی نوعیت اختیار کر لی تھی یعنی اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ اس میں اعلانات و لکھے جاتے تھے۔ محض بول چال ہی کی زبان نہ تھی۔ نیز یہ کہ اگر ۱۷۵۰ قبل مسیح میں عربی زبان کی ایک ابتدائی شکل کا تھا، تو یہ بات کیوں عجیب سمجھی جائے کہ حضرت موسیٰ سے پہلے حضرت ایوب نے عربی میں کوئی منظوم صحیفہ لکھا تھا یت محررا بی بھی اصلاً عربی کی کتاب ہے۔

ن کا عربی میں نزول

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا اور جا بجا اس بات پر زور دینا کہ انا انزلنٰہ قرآناً عربیاً (۱۲ : ۲) ہم نے قرآن کسی اور زبان زل نہیں کیا" صرف اتنے ہی معنی نہیں رکھتا، جس قدر اس وقت تک سمجھے گئے ہیں بلکہ ایک بہت زیادہ وسیع ی حقیقت اس میں مضمر ہے (تفصیل اس مقام کی مقدمہ میں ملے گی)

ی قدیم ترین نظم سفرِ ایوب ہے

رابعاً، اگر سفرِ ایوب کی یہ نوعیت تسلیم کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ شعر و ادب کا سب سے قدیم نمونہ یہی ہے جو اس وقت تک معلومات میں آیا ہے اور اگر قدامت کے اعتبار سے دنیا کی کوئی کتاب منظوم اس سے معارضہ کر سکتی ہے، تو ف ہندوستان کا رگ وید ہے بشرطیکہ اسفارِ ہند کی قدامت کا وہ مذہب تسلیم کر لیا جائے جو رگ وید کو ۱۵۰۰ قبل مسیح ل سے بھی پیچھے لے جانا چاہتا ہے[۲]

جنگ کے بعد کے نہایت اہم انکشافات میں سے ہے۔ اس وقت تک حروفِ ابجدی (یعنی غیر تصویری و غیر مسماری) کی منضبط کا سب سے قدیمی نمونہ "حجرِ سینا" سمجھا جاتا تھا۔ یعنی وہ پتھر جو ۱۸۲۴ء میں جزیرہ نمائے سینا میں ملا اور جس پر "میشا" شاہِ موآب نے ۹ قبل مسیح میں اپنی ایک فتح کا حال کندہ کرایا ہے۔ یہ فتح اسے بنی اسرائیل کے مقابلے میں حاصل ہوئی تھی لیکن اب اس تابوت کے ف نے اس سے ساڑھے تین سو برس پیشتر کی کتابت مہیا کر دی اور اس طرح معاملہ ۹۰۰ ق م کی جگہ ۱۲۵۰ ق م تک پہنچ گیا بلی زبان میں دستِ انسانی کی علمی کتابت کا سب سے قدیمی نمونہ جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہے ۱۲۵۰ کا ہے اور عربی زبان اور کے فنیقی رسم الخط میں ہے۔ [۲] ویدوں کے عہدِ تصنیف و تدوین کی نسبت میکس مولر کا مسلک اس وقت تک ماہرین موضوع میں مقبول تا ہے اور علمی حیثیت سے اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ میکس مولر نے ویدوں کی تصنیف کا زمانہ چار عہدوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ر کا زمانہ ۱۲۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م تک، برہمن ۸۰۰ سے ۶۰۰ ق م تک۔ منترا ور رگوید کا آخری باب (باقی اگلے صفحہ پر)

اس وقت تک غیر غنائی شاعری کا سب سے زیادہ قدیم نمونہ ہومر کی ایلڈ تسلیم کی گئی ہے لیکن اگر ہومر کا عہد وہ قرار دیا جائے جو ہیروڈوٹس کے بیان سے متبادر ہوتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سنہ ۹۰۰ ق۔م ہے لیکن سفر ایوب اس سے بھی پہلے کا زمانہ ہونا چاہیے۔ پس قدیم تر نظم ہومر کی نہ ہوئی، سفر ایوب کی ہوئی۔

ہندوستان کی دو رزمیہ نظمیں مہا بھارت اور رامائن بھی قدیم نظمیں ہیں لیکن ان کا زمانہ تصنیف بھی محققین عصر چوتھی صدی قبل مسیح سے زیادہ پیچھے نہیں جا سکتا اور زمانۂ تدوین بہ شکل کتاب تو اکثروں کے نزدیک زیادہ سے سنہ مسیحی کے ابتدائی قرون ہیں[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۷) سنہ ۱۰۰۰ سے سنہ ۸۰۰ ق۔م تک۔ چھند سنہ ۱۲۰۰ سے سنہ ۱۰۰۰ ق۔م تک۔ گویا رگوید کی سب سے قدیم نظمیں سنہ ... قبل سے زیادہ پیچھے نہیں جاتیں۔ حال میں مسٹر اے۔ بی کیتھ (KEITH) پروفیسر سنسکرت ایڈنبرا یونیورسٹی نے اس موضوع پر جو مقالہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے لیے لکھا ہے، اس میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ تمام بحث کا خاتمہ اس نتیجہ پر کرتے ہیں کہ " رگوید کے قدیم ترین حصے اُشا ممکن ہے سنہ ۱۲۰۰ ق۔م تک پیچھے لے جائے جا سکیں لیکن اس سے زیادہ پیچھے لے جانا موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد اول ص ۱۱۳) [1] دیکھو پروفیسر ای واشبرن ہاپکینس (WASHBURN HOPKINS) کا مقالہ " رزمیہ نظم " مندرجہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول ص ۲۵۸۔

حضرت داؤدؑ

حضرت داؤد یسی کے آٹھویں اور سب سے چھوٹے فرزند اور بیت لحم کے باشندے تھے۔ آپ کا عام مشغلہ یہ تھا کہ خاندان کی بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے اور والد نے یہی کام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ آپ بنسری کے علاوہ بربط بھی خوب بجاتے تھے شیموئیل نبی نے ابتدائی دور ہی میں اندازہ فرما لیا تھا کہ یہ خدا کی برگزیدہ ہستی ہیں۔

یہودیوں کا سب سے پہلا بادشاہ طالوت تھا جسے شیموئیل نبی نے منتخب کیا تھا۔ کبھی کبھی حضرت داؤدؑ بھی طالوت کے پاس جاتے اور بربط بجا کر اس کا دل خوش کرتے۔

جب فلستیوں کے مشہور سردار جالوت نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا تو بڑی پریشانی ہوئی کیونکہ جالوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاق سے والد نے داؤدؑ کو بڑے بیٹوں کا کھانا دے کر بھیج دیا جو فلستیوں کے خلاف میدان جنگ میں پہنچے ہوئے تھے۔ عین اس وقت جالوت مبارز طلب کرتا ہوا میدان جنگ میں آگیا اور بنی اسرائیل میں سے کسی کا حوصلہ نہ تھا کہ اس کے مقابلے پر نکلے۔ حضرت داؤدؑ نے کہا کہ میں اس سے لڑوں گا۔ وُہ اپنا گوپیا اور بھیڑ بکریاں چرانے کی لاٹھی نیز ایک تھیلا لے کر جالوت کے مقابلے کے لیے نکل پڑے۔ وُہ دیکھ کر ہنسا کہ تم مجھے کتا سمجھ کر ڈنڈے سے بھگانے آئے ہو؟ حضرت داؤدؑ کی دلیرانہ باتوں سے وہ مشتعل ہو گیا اور وار کر دیا۔ حضرت داؤدؑ نے تھیلے میں سے ایک پتھر نکالا اور گوپیے میں رکھ کر اس زور سے مارا کہ وُہ جالوت کا خود توڑ کر اس کے سر میں جا لگا اور وُہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت داؤدؑ نے اسی کی تلوار لے کر سر قلم کر ڈالا۔ اس فتح سے فلستیوں پر سراسیمگی طاری ہو گئی اور وُہ بھاگ نکلے۔ حضرت داؤدؑ بنی اسرائیل کے ہیرو بن گئے۔

حضرت داؤدؑ کی ہردلعزیزی سے طالوت کے دل میں حسد پیدا ہوا اور اس نے انھیں مارنے کی کوشش کی۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ کچھ مدت تک ادھر ادھر چھپے پھرتے رہے یہاں تک کہ طالوت اور اس کا بیٹا ایک لڑائی میں مارے گئے اور بنی اسرائیل نے بالاتفاق حضرت داؤدؑ کو بادشاہ بنا لیا۔

حضرت داؤدؑ کے عہد میں بنی اسرائیل کو بہت فتوحات حاصل ہوئیں۔ ابتدا میں حبرون اسرائیلیوں کا دارالحکومت تھا جسے اب الخلیل کہتے ہیں۔ پھر حضرت داؤدؑ نے یبوسیوں کا شہر فتح کر لیا جو موقع اور محل کے لحاظ سے زیادہ موزوں دارالحکومت تھا لہٰذا ساڑھے سات سال بعد یبوسیوں کا شہر حضرت داؤدؑ کا مرکز بن گیا جس کا نام یروشلم رکھا گیا یعنی شہر امن وصلح۔

۹۶۱ ق م میں حضرت داؤدؑ نے وفات پائی۔ ساڑھے چالیس سال حکومت کی۔ بوقت وفات ستر سال کی عمر تھی گویا آپ کا سال ولادت ۱۰۳۱ ق م تھا۔

مولاناؒ فرماتے ہیں:
سورہ انبیا کی آیت ۷۹ میں "یسبحن" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو "ان من شیٔ الا یسبح" میں ہے۔ دوسرا یہ کہ جب حضرت داؤدؑ حمد الٰہی کے نغمے گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا اور چٹانیں تک وجد آجاتی تھیں[1]

حضرت داؤدؑ بڑے ہی خوش آواز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری و بابلی مزامیر کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کیے۔

تورات اور روایات یہود سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر حمد الٰہی کے ترانے گاتے اپنا بربط بجاتے تو شجر و حجر جھومنے لگتے تھے۔

روایات تفسیر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ پرندوں کی تسخیر کو بھی دونوں باتوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہ ہر طرح کے پرندان کے محل میں جمع ہو گئے تھے اور وہ بھی کہ ان کی نغمہ سرائیوں سے متاثر ہوتے تھے۔

کتاب زبور دراصل ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت داؤدؑ نے الہام الٰہی سے نظم کیے تھے۔

جس وقت تک آتشیں اسلحہ ایجاد نہیں ہوئے تھے، جنگ میں حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ آہنی لباس استعمال تھا یعنی زرہ کا۔ معلوم ہوتا ہے حضرت داؤدؑ نے اس صنعت کو بہت فروغ دیا تھا اور اس میں طرح طرح کی نئی ایجادات کی تھیں۔ تاریخی آثار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح تک زرہ کا استعمال قوموں میں دکھائی نہیں دیتا، اس کے بعد خود کا استعمال شروع ہوتا ہے۔ پھر دوسری چیزیں مستعمل ہونے لگتی ہیں یہاں تک کہ سکندر کے عہد میں یونانی اور ایرانی دونوں سرتاپا آہن پوش ہو گئے تھے[2]

---

[1] التسبیح اما حقیقۃ او مجاز۔ وقد قال بالاول جماعۃ وھو الظاھر۔ وقال بالمجاز آخرون۔ وحملوا التسبیح علی تسبیح من رآھا، تعجبا من عظم خلقھا وقدرۃ خالقھا (فتح القدیر للشوکانی) قلت ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات۔ [2] قرآن مجید میں ہے: وعلمنہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من باسکم (اور دیکھو ہم نے داؤدؑ کو تمھارے لیے زرہ بکتر بنانا سکھا دیا کہ تمھیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے۔ الانبیاء۔ آیت ۸۰) [3] بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ کا عظیم الشان احسان تھا۔ ان کے عہد سے پیشتر فلستیوں نے صنعت فولاد پر اجارہ داری قائم کر لی تھی اور آس پاس کے گروہوں خصوصاً بنی اسرائیل کو لوہے کی معمولی چیزیں بھی بنانے نہیں دیتے تھے اور بزور مجبور کرتے تھے کہ آہن و فولاد کی جس جس چیز کی ضرورت پیش آئے، وہ ان سے یعنی فلستیوں سے خریدی جائے۔ حضرت داؤدؑ نے فلستیوں کا زور توڑ کر اس صنعت کو عام کیا اور بنی اسرائیل بھی آہنگری و فولاد سازی میں باکمال بن گئے نیز زرہ بکتر وغیرہ بنانے میں بنی اسرائیل نے بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا۔

حضرت سلیمانؑ

حضرت داؤدؑ کے فرزند ارجمند اور جانشین حضرت سلیمانؑ کی ولادت ۱۰۳۵ء قم میں بیان کی جاتی ہے۔ گویا والد ماجد کے انتقال کے وقت حضرت سلیمانؑ کی عمر پچیس سال تھی۔ یہودیوں کی حکمرانی میں حضرت سلیمانؑ کا عہد درخشاں ترین مانا جاتا ہے۔
یقیناً اس عہد میں یہودی یا اسرائیلی سلطنت کی وسعت، استحکام اور جاہ وجلال اوج کمال پر پہنچ گیا۔ اسی عہد میں ہیکل تعمیر ہوا جو حسنِ عمارت کے اعتبار سے بھی اس دور میں یگانہ مانا جاتا تھا۔ ان کے عہد میں محض فولاد ہی کی صنعت نے ترقی نہ کی بلکہ دوسری دھاتیں بھی صنعت کے لیے استعمال ہونے لگیں چنانچہ عصیون جابر میں جو ایلہ کے قریب تھا تانبا پگھلانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قایم کیا گیا تھا۔ چالیس سال کی حکومت کے بعد ۹۷۵ء قم میں حضرت سلیمانؑ کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد اسرائیلی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی اور یکے بعد دیگرے دونوں حصے غیروں کے قبضے میں آ گئے۔ حضرت سلیمانؑ کی عمر کا اندازہ پینسٹھ سال کیا گیا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں:

[حضرت] داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ

اگر ایک آدمی ایک طرف کھیت بوئے دوسری طرف رات کو اپنی بکریاں بھی کھول دیا کرے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی کہ ساری فصل تباہ ہو جائے گی۔ وہ جتنا [کھیت] کھا چر لیں گی۔ جتنا روند سکیں گی، روند جائیں گی؛
یہی حال یہودیوں کا تھا۔ وہ ایک طرف بناتے تھے، دوسری طرف خود اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑ دیتے تھے۔ [حضرت] داؤدؑ نے انھیں فلسطین پر فتح مند کرایا اور تمام ملک ساحل بحر تک ان کے قبضہ میں آ گیا لیکن پھر بھی ان میں نظم و [اتحاد] کی رُوح پیدا نہ ہوئی۔
البتہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک نیا انقلاب رُونما ہوا اور انھوں نے اپنی دانش وحکمت نبوت سے یہودیوں کی [حالت] ایسی پلٹ دی کہ ایک عظیم الشان عبرانی مملکت قایم ہو گئی۔
سورۂ الانبیاء کی آیت (۷۸) میں غالباً اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "الحرث" سے مقصود کوئی خاص کھیتی ہو اور "غنم القوم" سے کسی خاص [قوم] کی بکریاں یعنی کسی کا کھیت تھا اور کسی کی بکریاں اس میں جا پڑی تھیں۔ اس جھگڑے کا فیصلہ دونوں نے کیا۔ حضرت داؤدؑ نے بھی اور حضرت سلیمانؑ نے بھی اور فیصلہ حضرت سلیمانؑ کا زیادہ قوی اور اوفق تھا۔ مزید تشریح عام تفاسیر میں ملے گی۔
سورۂ الانبیاء کی آیت ۸۱ میں فرمایا: ہم نے سمندروں کی باد تند سلیمانؑ کے لیے مسخر کر دی تھی یعنی بادبانی کے

بڑے بڑے جہاز چلنے لگے تھے اور خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہوائیں بھی ان کے لیے بار برداری اور نقل و
ذریعہ ہو گئی تھیں۔

سمندروں کی ہواؤں کا معاملہ بھی قدرت کے عجائب مظاہر میں سے ہے، جس وقت تک دخانی قوت کا انکشا
نہیں ہُوا تھا، بحری سیر و سیاحت کا ذریعہ یہی ہوائیں تھیں۔ یہ مختلف جہتوں میں چلتی ہیں اور مختلف وقتوں میں چلتی
اور ان کی جہتیں اور اوقات اس درجہ معین اور منضبط ہیں کہ کبھی ان میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ پھر ان کی تندی و طاقت کا
حال ہے کہ بڑے بڑے جہازوں کو تنکوں کی طرح سطح سمندر پر دوڑاتے ہوئے لے جاتی ہیں!

حضرت سلیمانؑ کے تجارتی جہاز

قدیم عہدوں میں حضرت سلیمانؑ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جہازوں سے
طرح کام لینا شروع کیا کہ ہندوستان اور مغربی جزائر تک بحری آمد و
منظم سلسلہ قایم ہو گیا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تجارتی بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقت ور بیڑا
بحر احمر میں اس کا مرکز "ترسیس"[1] تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر یافا کی بندرگاہیں۔

بابرکت سرزمین

فلسطین کا علاقہ ایسے گوشے میں واقع ہوا ہے کہ اس کے مغرب و شمال میں بحر متوسط
اور جنوب میں بحر احمر۔ پس اسے متضاد سمتوں کی ہوائیں چاہئیں تاکہ دنیا کے جہاز اس
ساحلوں تک پہنچ سکیں۔ یعنی بحر احمر میں شمالی ہوا اور متوسط میں جنوبی اور مشرقی۔ اگرچہ دونوں سمندروں کا باہمی ف
کچھ زیادہ نہیں لیکن قدرتِ الٰہی نے ان کی ہواؤں کی سمتیں ایسی ہی رکھ دی ہیں، بہ یک وقت بحر احمر میں باد شمال
جھونکے چلتے ہیں اور متوسط میں باد جنوب کے اور دونوں یکساں طور پر سواحل شام و فلسطین کے لیے مفید ہیں۔
اس تفصیل کے بعد فرمایا الی الارض بارکنا فیھا (اس سرزمین کے رخ پر جس میں ہم نے بڑی برکت رکھ دی
الانبیاء) اس سے مقصود شام و فلسطین کی سرزمین ہے۔

ہیکل کی تعمیر

سورۂ الانبیاء کی آیت ۸۲ میں بھی معلوم ہوتا ہے، شیاطین کا اطلاق، شیاطین الانس ہی پر ہے
یعنی فلسطین اور شام کی اُن شریر اور سرکش قوموں پر جو حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بالکل مطیع
منقاد ہو گئی تھیں اور انھوں نے ہیکل کی تعمیر میں تیرہ برس تک ہر طرح کی سخت سے سخت خدمتیں انجام دی تھیں۔
ہیکل کی بنیاد حضرت داؤدؑ نے ڈالی تھی لیکن تعمیر حضرت سلیمانؑ نے کی۔ تورات کی کتاب سلاطین اول سے معلو
ہوتا ہے کہ تیس ہزار آدمی تیرہ برس تک کام میں لگے رہے، تب کہیں جا کر عمارت طیار ہوئی تھی۔

---

[1] اس بارے میں محققین کے درمیان اختلافات ہیں۔ ممکن ہے کوئی ترسیس بحیرہ روم کے مغربی حصے میں بھی ہو لیکن خلیج
والے ترسیس میں کوئی شبہ نہیں۔ ایسٹن EASTON کی بائبل ڈکشنری میں ہے کہ ترسیس اصلاً سنسکرت یا آریائی زبان کا لفظ
معنی ہیں "ساحل بحر" اور اس کا تعلق چونکہ ہندوستان کے ساتھ تجارت سے تھا اس لیے اغلب ہے ہندوستانی تاجر بھی یہا
آتے ہوں۔ یوں یہ سنسکرت یا آریائی لفظ فلسطین پہنچا۔

باب ۳۸

حضرت یونس علیہ السلام

• عہد عتیق "یوناہ نبی کے نام کا ایک صحیفہ ہے، جسے عہد عتیق کا تبیسواں صحیفہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے صرف چار باب اور کل اڑتالیس آیات ہیں۔ صحیفہ مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت یونس علیہ السلام ہی کی داستان ہے۔ انھیں یوناہ بن متی بھی کہتے تھے۔" ذوالنون بھی (سورۂ انبیاء : ۸۷) کیونکہ نون مچھلی کو کہتے ہیں اور ان پر مچھلی کا واقعہ گزرا تھا اور "صاحب الحوت" بھی جیسے!

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادٰى وَهُوَ	اور صاحب حوت کی طرح نہ ہو جا اس نے پکارا اور وہ
مَكْظُوْمٌ۔ (القلم : ۴۸)	رنج سے بھرا ہوا تھا۔

ان کے متعلق کسی خاص تصریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ حضرت یونسؑ کے دور دعوت کا اندازہ کرلینا چاہیے۔ یہ معلوم ہے کہ نینوی پر ۶۲۵ق م میں حملے شروع ہو گئے تھے اور ۶۱۲ق م میں یہ فتح ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت یونسؑ کی دعوت پر اہل شہر نے خدا پرستی اختیار کرلی تھی تو انھیں مزید مہلت مل گئی لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام کا زمانہ آٹھویں صدی ق م ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلعم تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے تھے تو بدبختوں نے حضور صلعم پر پتھر برسائے تھے اور آپؐ نے ایک باغ میں پناہ لی تھی۔ باغ کے مالکوں نے جس غلام کو انگور دے کر رسول اللہ صلعم کے پاس بھیجا تھا، وہ حضرت یونسؑ ہی کے دین کا پیرو تھا۔

اہل نینوی کی توبہ

سورۂ یونس کی آیت ۹۸ میں حضرت یونسؑ کے واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا جو عربی میں "یونس" ہوگیا۔ یہ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ہیں اور عہد عتیق کے نوشتوں میں ایک نوشتہ ان کے نام سے بھی ہے۔ اس نوشتہ سے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے باشندگان نینوی کو خبر دی تھی کہ چالیس دن کے بعد شہر تباہ ہو جائے گا کیونکہ تمھارا ظلم و فساد حد سے گزر گیا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے سرکشی نہیں کی بلکہ بادشاہ سے لے کر گڈریے تک سب توبہ و استغفار میں لگ گئے نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس دن کی مدت گزر گئی مگر موعودہ تباہی ظہور میں نہ آئی۔

نینوی کی تباہی

فرمایا: موعودہ عذاب ان پر سے اس لیے ٹل گیا کہ بات مان لی اور سرکشی نہیں کی۔ اس کے بعد فرمایا: ایک خاص مدت تک کے لیے انھیں مہلت دے دی گئی۔ چنانچہ حضرت یوناہ کے بعد تقریباً ۶۰۰ق م میں ان کا ظلم و فساد پھر حد سے گزر گیا اور ایک اور اسرائیلی نبی ناحوم نامی نے انھیں پیش آنے والی

تباہی کی خبر دی۔ اس انذار کے ستر برس بعد اہل بابل نے نینوٰی پر حملہ کیا۔ ساتھ ہی دجلہ میں اس زور کا سیلاب آیا کہ نینوٰی کی مشہور عالم چار دیواری جا بجا سے گر گئی اور حملہ آوروں کے لیے کوئی روک باقی نہ رہی۔ چنانچہ آشوری تمدن کا یہ مرکز اس طرح نابود ہوا کہ ۶۰۶ قبل مسیح میں اس کی جائے وقوع بھی لوگوں کو معلوم نہ تھی جیسا کہ اُس عہد کے ایک یونانی مورخ نے تصریح کی ہے!

صحیفۂ یوناہ

" الانبیاء " کی آیت ۸۷ میں ذوالنون سے مقصود بالاتفاق حضرت یونسؑ ہیں۔ عہد عتیق میں ان کا عبرانی نام یوناہ آیا ہے اور ان کے نام سے ایک صحیفہ بھی آیا ہے۔ یہاں انھیں " ذوالنون " کے نام سے پکارا گیا کیونکہ عربی میں " نون " مچھلی کو کہتے تھے۔ چنانچہ آرامی، کلدانی اور مصری میں بھی مچھلی کا یہی نام بولا گیا ہے۔

اس صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یروشلم میں تھے کہ وحی الٰہی نے انھیں مخاطب کیا اور حکم دیا: باشندگان نینوٰی کو نزول عذاب کی خبر پہنچا دیں۔ نینوٰی اس زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان آبادی تھی۔ مہم کی گرانباری اور بے سروسامانی دیکھ کر بہ مقتضائے بشریت طبیعت ہراساں ہوئی۔ بہرحال یافا سے ایک جہاز پر سوار ہو گئے جو ترسیس جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں طوفان نے گھیر لیا۔ قدیم زمانے میں جہاز رانوں کا اعتقاد تھا، اگر طوفان عرصہ تک نہ تھمے تو یہ اس کا ثبوت ہوتا ہے کہ کوئی گنہگار آدمی جہاز میں سوار ہے جب تک وہ موجود رہے گا، اس کی نحوست سے طوفان بھی جاری رہے گا۔ چنانچہ یہی خیال اس جہاز کے مسافروں کو بھی ہوا۔ وہ قرعہ ڈالنے لگے کہ کون مجرم ہے اور کسے سمندر کے حوالے کریں۔ جب حضرت یونسؑ نے سُنا تو کہا: ایسا ہی کرنا ہے تو مجھے سمندر میں پھینک دو، مجھ سے زیادہ اس کا کون مستحق ہو سکتا ہے؟ صحیفہ میں ہے کہ قرعہ کا فیصلہ بھی یہی ہوا تھا۔

مچھلی کے ذریعے سے بچاؤ

جب طوفان نہیں تھما تو لوگوں نے انھیں سمندر میں ڈال دیا۔ سمندر میں ایک بہت بڑی مچھلی تھی۔ یہ تین دن تک اس کے اندر رہے۔ پھر وہ ساحل کی طرف گئی اور خشکی پر انھیں اُگل دیا۔ اس طرح قدرتِ الٰہی نے موت کے منہ میں ڈال کر پھر اس سے زندہ و سلامت نکال لیا۔

یوناہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ " اس نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے خدا سے دُعا مانگی تھی اور اس نے اس کی پکار سن لی۔ وہ پاتال کے بطن میں سے چلایا اور اس کی آواز سُنی گئی۔ (۲ : ۱)

قرآن نے یہاں غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: " اذ ذهب مغاضبًا ای مغاضبا من اجل ربه - کما یقولون ، غضبت لك " ای من اجلك یعنی اللہ کی خاطر خشمناک ہو کر روانہ ہوا۔ فظن ان لن نقدر علیه ای لن نضیق علیه ۔ اس نے گمان کیا کہ ہم اسے تنگی میں نہیں ڈالیں گے، حالانکہ اسے ایک آزمائش پیش آنے والی تھی۔

یاد رہے، اس جملہ کا مطلب وُہ نہیں جو تفسیر کی روایات میں سعید بن جبیر اور حسن کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ان اللہ لا یقدر علیٰ معاقبتہ یعنی یونسؑ نے خیال کیا۔ خدا اس پر قابُو نہیں پا سکتا کیونکہ ایسا اعتقاد تو صریح کفر ہے اور ممکن نہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی کسی نبی کے قلب میں گزر سکے۔ یقیناً یہ ان ائمہ تفسیر کا قول نہیں ہو سکتا، بعد کے راویوں کی کج فہمی ہے۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے، اسی طرح ایک دوسری تفسیر بھی ہو سکتی ہے اور شاید پہلی سے زیادہ موزوں۔

عذاب کا اعلان اور نتیجہ

تورات کے اس صحیفہ میں ہے کہ حادثہ کے بعد پھر انھیں نینوٰی کے لیے حکم ہُوا۔ وہ نینوٰی گئے اور اعلان کیا "چالیس دن کے بعد یہ شہر برباد ہو جائے گا"۔ لیکن یہ بات سن کر باشندگان نینوٰی نے سرکشی نہیں کی بلکہ پادشاہ سے لے کر ادنیٰ باشندے تک سب کانپ اٹھے! سب نے خدا کی ہستی پر اعتقاد کیا۔ پادشاہ نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیراہن پہن لیا اور تمام باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بُری راہ سے اور ظلم و شرارت کی بات سے باز آجائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے توبہ و انابت کا سر جھکائے (۳:۵)۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عذاب ٹل گیا۔ چالیس دن گزر گئے مگر کوئی ہلاکت ظہور میں نہیں آئی۔ یہ بات حضرت یونسؑ پر گراں گزری۔ وہ مضطرب ہوئے کہ اعلان حق میں تخلف کیوں ہوا؟

اہل شہر کی توبہ

وہ شہر کے باہر ایک چھپر بنا کے مقیم ہو گئے تھے۔ رینڈی کے ایک درخت کی شاخیں چھپر پر پھیل گئی تھیں۔ قضارا اس درخت کی جڑ میں کیڑا لگ گیا۔ ایک دن صُبح اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں، اس کی شاخیں بالکل سُوکھ گئی ہیں اور سایہ کی جگہ دھوپ ہے۔ یہ حال دیکھ کر نہایت رنجیدہ ہُوئے" تب خداوند نے کہا: تو اس رینڈی کے درخت کے سوکھ جانے پر اتنا رنجیدہ ہو رہا ہے حالانکہ اس کے بونے اور اگانے میں تو نے کچھ بھی محنت نہیں کی تھی۔ پھر غور کرو، میرے لیے ضروری نہیں کہ اس عظیم الشان نینوٰی پر رحم و شفقت کروں؟ اس نینوٰی پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی اور بے شمار مویشی بستے ہیں؟ جنھیں میں نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا؟"

(۴:۵)

یعنی عذاب والی بات اپنی جگہ صحیح تھی، وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی، لیکن عذاب کا ظہور لوگوں کے انکار و بدعملی ہی کا نتیجہ تھا۔ جب وُہ اس سے باز آ گئے تو عذاب بھی ٹل گیا اور یہاں اصل کارفرمائی ہر حال میں عفو و بخشش کی ہے۔ سرزنش و عقوبت کی نہیں۔ جب یہ حقیقت ان پر کھل گئی تو ان کا سارا رنج و غم دُور ہو گیا۔

حضرت عیسیٰؑ

باب ۳۹
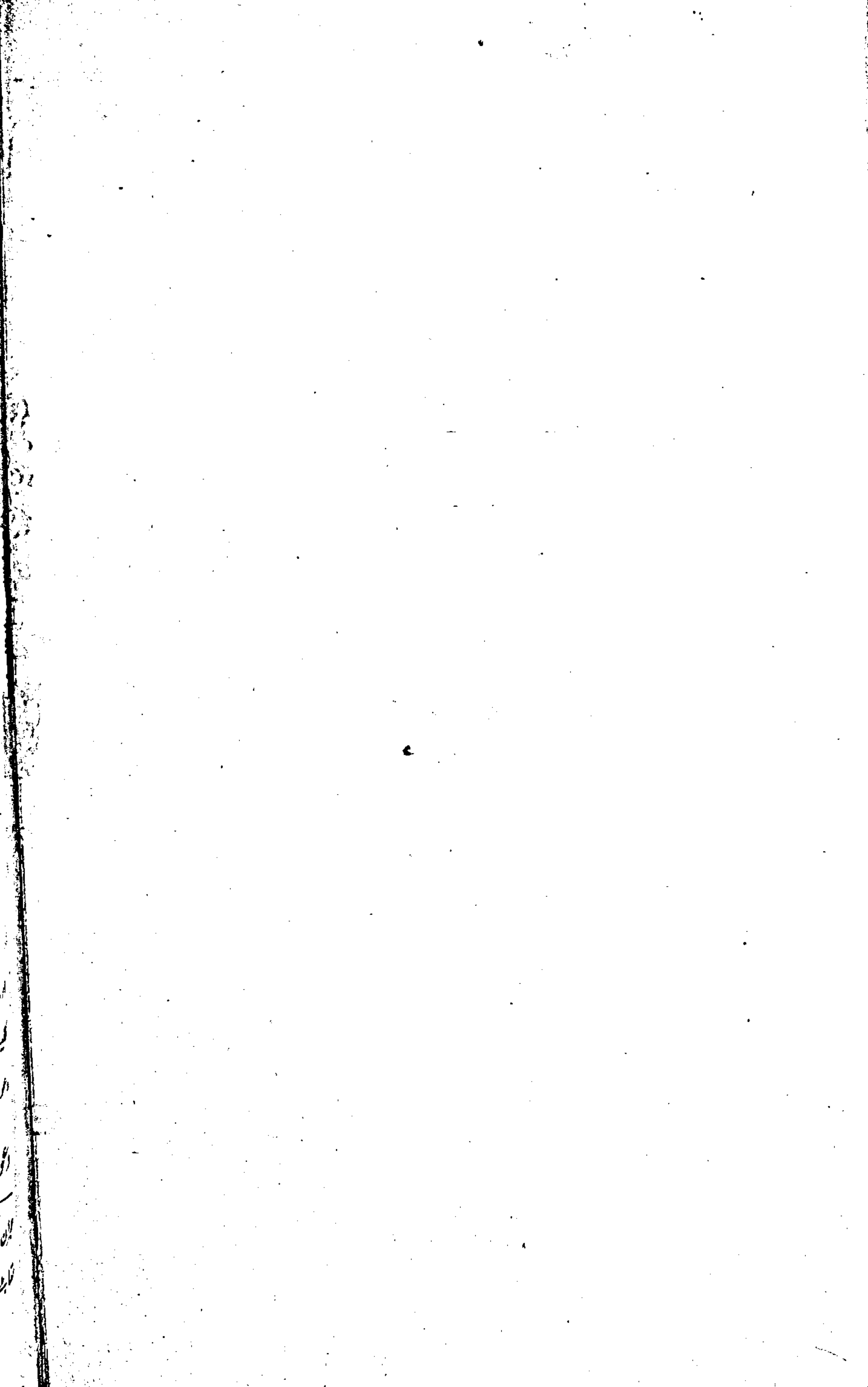
حضرت مریمؑ اور پیدائش مسیحؑ

حضرت مریمؑ بچپنے میں ہیکل کے سپرد ہوئیں اور حضرت زکریا کی نگرانی میں پرورش پائی۔ کم سنی میں بھی وہ زاہدانہ اور خدا پرستانہ توکل کا پیکر تھیں۔ بالغ ہوئیں تو اللہ کی طرف سے برگزیدگی و قبولیت کی بشارت ملی۔ اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری سنائی گئی۔

تمام رسولوں کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی اسی لیے نہیں آئے تھے کہ پچھلی تعلیمات کو جھٹلائیں۔ اس لیے آئے تھے کہ ان کی تصدیق کریں کیونکہ اصل دین ہر زمانے اور ہر گروہ کے لیے ایک ہی رہا ہے۔ یہودیوں کے سردار اور پیشوا حضرت مسیحؑ کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے اور صرف حواری ایمان لائے جو چند گنے ہوئے، بے مقدور اور شکستہ حال اشخاص تھے۔

یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف مخفی اور پُر پیچ سازش کی، مگر اللہ نے اسے ناکام بنا دیا اور حضرت مسیحؑ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

حضرت مسیحؑ اور اللہ کا وعدہ

حضرت مسیحؑ کی نسبت اللہ کا وعدہ یہ تھا:

۱۔ میں تیرا وقت پورا کروں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

۲۔ تیرے منکروں نے تیرے خلاف جو افترا پردازیاں کی ہیں ان سے تیری پاکی آشکارا کروں گا۔

۳۔ جو لوگ تیرے ماننے والے ہیں، انھیں تیرے منکروں پر قیامت تک برتر رکھوں گا۔

عیسائیوں کی گمراہی کہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا اعتقاد باطل پیدا کر لیا حالانکہ قوم بنی آدم کی طرح مسیحؑ بھی انسان تھے اور خدا نے انھیں اپنی رسالت کے لیے چن لیا تھا۔ ضمناً (قرآن مجید کا اشارہ) اس حقیقت کی طرف کہ اگرچہ مسیحی کلیسا نے صدیوں سے الوہیت مسیحؑ کا اعتقاد قائم رکھا ہے اور تمام دنیا میں پھیل گیا ہے لیکن اس کے خلاف قرآن کی دعوت کامیاب ہو کر رہے گی کیونکہ یہ اعتقاد حقیقت کے خلاف ہے۔

دعوت مباہلہ

عیسائیوں کو مباہلے کی دعوت کہ اگر انھیں الوہیت مسیحؑ کے اعتقاد پر یقین ہے تو پیغمبر اسلام کے مقابلے پر آئیں اور دونوں فریق خدا سے دعا مانگیں، جو ناحق پر ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ چنانچہ نجران کے عیسائی پیشواؤں کی جو جماعت مدینہ آئی تھی، پیغمبر اسلام نے انھیں مباہلے کی دعوت دی، مگر انھیں مقابلے کی جرأت نہ ہوئی اور اطاعت کا اقرار کر کے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

رفع نزاع کی دوسری دعوت

دعوت مباہلہ کے بعد رفع نزاع اور اتمام حجت کی دوسری دعوت، اگر تمھاری مخالفت محض تعصب و نفسانیت کی وجہ سے نہیں اور دین و حق پرستی کی کچھ بھی طلب باقی ہے تو آؤ اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دیں اور توحید و خدا پرستی کی ان بنیادی صداقتوں پر متفق ہو جائیں جو خود تمھارے یہاں بھی مسلّم ہیں۔ اگرچہ عملاً فراموش کر دی گئی ہیں یعنی؛

۱۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

۲۔ جو کچھ اس کے لیے ہے اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے۔

۳۔ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنے لیے ایسا مقدس اور معصوم نہ بنائے گویا وُہ خدا ہے۔

توحید و خدا پرستی کا یہی طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا۔

ذمہ دار کون ہے؟

قیامت کے دن رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو احکام تم نے دیے تھے تمھیں ان کا کیا جواب ملا؛ یعنی جن قوموں کو دیے گئے تھے انھوں نے کہاں تک ان پر عمل کیا؛ اس سلسلے میں دعوت مسیحؑ کا ذکر اور ان سے مخاطبہ۔ پہلے اللہ نے وہ نعمتیں یاد دلائیں جو مسیحؑ کو دی گئی تھیں۔ پھر فرمایا تعلیم حق کی ان روشنیوں کے باوجود تیرے نام لیوا گمراہی میں پڑ گئے۔ تجھے اور تیری ماں کو خدا بنا لیا (لوتھر کی اصلاح سے پہلے حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جاتی تھی اور کیتھولک کلیسا اب بھی کر رہا ہے) اس پر حضرت مسیحؑ عرض کریں گے میں اس سے بری ہوں۔

مقصود یہ ہے کہ تمام داعیانِ حق نے خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دی لیکن پیروؤں نے انھی کی پرستش شروع کر دی اس گمراہی کے لیے پیرو ذمہ دار ہیں، جن کی پرستش کی جا رہی ہے ان کا دامن اس سے پاک ہے۔

حضرت مریمؑ کی ابتدائی سرگزشت اور انجیل

حضرت مسیح علیہ السلام اور مسیحیت کی نسبت بعض مہمات مباحث ہیں جن کے اشارات آیندہ سورتوں کی تشریح میں آئیں گے لیکن یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

قرآن نے حضرت مسیحؑ کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہوں پر کیا ہے۔ یہاں (سورۂ مریم) اور سورۂ آل عمران کی آیات (۳۵ - ۶۳) میں۔ یہاں یہ ذکر حضرت زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰؑ کی پیدایش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعے سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریمؑ کی پیدایش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعے سے اور اس بارے میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں۔

لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان[1] کے کتب خانہ سے برآمد ہوا، اس نے حضرت مریمؑ کی

[1] پاپاؤں کا قصر روما میں جو دنیا کا سب سے بڑا محل ہے۔ اس کا کتب خانہ بھی بڑا عالی شان ہے۔

الیش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا، جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔

"متروک اناجیل" سے مقصود وہ اکیس سے زیادہ انجیلیں ہیں جو پہلی صدی سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک عیسائیوں میں رائج اور معمول بہ تھیں، لیکن ۳۲۵ء میں نائیسیا[1] کی کونسل نے چار منتخب کر لیں اور باقی متروک سمجھ لی گئیں۔ یہ انتخاب کسی تاریخی علمی اصل کی بنا پر نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک طرح کی فال دیکھی گئی تھی اور اس کا اشارہ فیصلہ کن تھا۔ (یعنی فیصلہ کن مان لیا گیا)

قرآن اور حضرت مسیحؑ کی پیدائش

قرآن نے واقعہ صلیب کا رد کیا اور کہا کہ وہ (مسیح علیہ السلام) مصلوب نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت حال لوگوں پر مشتبہ ہو گئی۔ الوہیت اور ابنیت کا بھی رد کیا اور کہا، ایسا کہنا صریح کفر ہے۔ "کفارہ" کا بھی رد کیا اور جا بجا اس پر زور دیا کہ نجات کی بنیاد ایمان باللہ اور عمل ہے نہ کہ مسیحؑ کے کفارے کا اعتقاد۔ اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بغیر باپ کے پیدائش کا اعتقاد بھی انھی عقاید کی طرح باطل تھا تو کیا ضروری نہ تھا کہ قرآن اسی صراحت کے ساتھ اس کا بھی رد کر دیتا جس صراحت کے ساتھ دوسرے عقاید کا کیا ہے؟ یقیناً ضروری تھا۔

لیکن قرآن نے اس کے رد میں ایک حرف نہیں کہا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس پر نظر ڈالی جائے اور یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھی جائے کہ تذکرہ ایک ایسی پیدائش کا ہو رہا ہے جو بغیر باپ کے تسلیم کر لی گئی ہے تو بغیر کسی تامل کے تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ بیان کی صاف روح یہی ہے، قرآن اس عام اعتقاد کا منکر نہیں۔ کم از کم اس کا رجحان اس کے خلاف نہیں جا رہا۔

بلاشبہ قرآن میں یہ الفاظ کہیں نہیں ملتے کہ حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ یعنی کوئی ایسی مثبت تصریح نہیں، جو اپنے منطوق میں ظاہر و قطعی ہو۔ اس کی جتنی آیتوں سے اس طرح کے اشارات نکل رہے ہیں، اگر انھیں ایک دوسرے سے الگ کر لیا جائے، تو ہر آیت کے مطلب کے لیے ایک دوسرا جامہ بھی تراش لیا جا سکتا ہے، جیسا کہ مرحوم سید احمد خاں اور ڈاکٹر توفیق صدقی وغیرہما نے کوشش کی ہے، لیکن جب تمام بیان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے اور محل کے قدرتی مقتضیات اور قرائن بھی پیش نظر ہوں تو بلا تامل تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ قرآن اس اعتقاد کے حق میں ہے، اس سے منکر نہیں۔

---

[1] اسے نیقیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایشیائے کوچک کا مشہور مقام ہے۔ انگریزی میں اسے NICAEA لکھتے ہیں۔ یہاں ۳۲۵ء میں مسیحی علما کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں مسیحی عقاید کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ نیز "مستند انجیلیں" چُنی گئیں اور باقی "متروک" قرار پائیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے دعاوی

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا معاملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بالکل متضاد سمتوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودی ان کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز بلکہ ایک ربانی معجزہ تصور کرتے تھے۔ قرآن کا فرض تھا کہ بہ حیثیت ایک ثالث کے دونوں میں فیصلہ کر دے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر دیا۔ اس نے حضرت مریمؑ کی پاکی کا اعلان کیا: ان اللہ اصطفٰكِ وطھرك واصطفٰك علی نساء العٰلمین۔ (آل عمران: ۴۲)[1]۔ یہودیوں کے الزام کو افترا عظیم قرار دیا: وبکفرھم وقولھم علیٰ مریم بہتاناً عظیماً (نسا: ۱۵۶)[2] اور پیدائش مسیحؑ کی سرگزشت ٹھیک اسی طرح بیان کر دی جس طرح انجیل میں بیان کی گئی ہے۔ قالت انیٰ یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر، ولم اك بغیا؟ قال کذٰلك، قال ربك: ھو علی ھین، ولنجعلہ اٰیۃً للناس ورحمۃً منا، وکان امرًا مقضیا۔ (مریم: ۲۰)[3] "مریمؑ نے فرشتہ سے کہا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں مرد سے واقف نہیں؟ اس نے کہا، ایسا ہی ہوگا۔ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگی اور خدا کی قدرت تجھے اپنے سایہ میں لے لے گی۔" (لوقا ۱: ۳۴) اب اگر یہودیوں کی طرح عیسائیوں کا اعتقاد بھی قرآن کے نزدیک غلط تھا، تو کیا ضروری نہ تھا کہ جس طرح اس نے یہودیوں کے الزام کا رد کیا، اسی طرح عیسائیوں کے غلو کا بھی صاف صاف رد کر دیتا؟ لیکن وہ اس کے رد میں ایک حرف نہیں کہتا، بلکہ پیدائش کی جس رویداد سے عیسائیوں نے یہ اعتقاد پیدا کیا تھا، اسے حرف بہ حرف انجیل ہی کی طرح بیان کر دیتا ہے۔

افراط و تفریط

اگر اس کے نزدیک حقیقت نہ تو وُہ تھی جو یہودیوں نے بنائی، اور نہ وہ، جو عیسائیوں نے سمجھی، بلکہ ایک تیسری ہی بات تھی یعنی مریمؑ کا اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہونا، تو کیونکر اس کے لیے جائز ہو سکتا تھا کہ وُہ سب کچھ کہہ دے، لیکن اس بارے میں کچھ نہ کہے؟ وہ اس فریق کا صاف صاف رد کر دے جو اس میں تفریط کر رہا ہے، مگر اس کا رد نہ کرے جو افراط کا مرتکب ہو رہا ہے؟ پھر اصل حقیقت پر اسی طرح پردہ پڑا رہنے دے، جس طرح پہلے سے پڑا ہُوا تھا اور اپنا یہ وصف یک قلم بھول جائے کہ وہ تمام پچھلے اختلافات کے لیے حَکَم اور تمام ظنون و شکوک کے لیے علم و حقیقت کا اعلان ہے۔

---

[1] اللہ نے تجھے اپنی قبولیت کے لیے چُن لیا ہے اور (برائیوں کی آلودگی سے) پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ [2] اور (انھوں نے کفر کیا اور مریمؑ کے خلاف ایسی بات کہی جو بڑے بہتان کی بات تھی۔ [3] مریمؑ نے کہا، ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میرے بیٹا ہو؟ حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میرا چال چلن بُرا ہے۔ فرشتے نے کہا: ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہوگا کہ میں اسے لوگوں کے لیے نشانی بنا دوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی نزاع صرف اسی باب میں نہیں ہوئی بلکہ حضرت مسیح کی ساری باتوں میں ہوئی۔ دونوں نے تفریط و افراط کی دو انتہائی جہتیں اختیار کر لی تھیں۔ یہودی انکار میں اتنے دُور نکل گئے کہ انھیں شعبدہ باز اور فریبی سمجھ لیا۔ عیسائی اعتقاد میں اتنے دُور نکل گئے کہ انھیں خدا بنا لیا۔ قرآن دونوں کا رد کرتا ہے اور کہتا ہے، دونوں افراط و تفریط میں کھوئے گئے۔ پھر اگر پیدائش مسیح کا معاملہ ایسا ہی تھا تو کیا ضروری نہ تھا کہ جس طرح اس بارے میں دونوں کا رد کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ دونوں حقیقت سے محروم ہیں، اسی طرح پیدائش کے بارے میں بھی یکساں طور پر دونوں کا رد کر دیتا اور صاف صاف تلا دیتا کہ حقیقت سے دونوں محروم ہیں؟

ابنیت کا اصل سہارا

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائیوں نے ابنیت کے اعتقاد کے لیے جو سہارے ڈھونڈھے تھے، ان میں سب سے بڑا سہارا اسی پیدائش کے اچنبھے کا تھا۔ اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سراپیز (SERAPIS) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (isis) کی جگہ حضرت مریمؑ کو اور حورس (HORUS) کی جگہ حضرت مسیح کو دی گئی۔ پس اگر قرآن کے نزدیک یہ اعتقاد بے اصل ہوتا تو وہ الوہیت و ابنیت کا رد کرتے ہوئے سب سے پہلی ضرب اسی سہارے پر لگاتا کیونکہ اس کے گرنے کے بعد اصنامی مسیحیت کی ساری عمارت خود بخود گر جاتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ وہ صرف ایک لفظ کہہ کر کہ یوسف مسیح کا باپ تھا سارا کارخانہ درہم برہم کر دے سکتا تھا، مگر وہ یہ نہیں کہنا چاہتا۔ وہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتا۔ اس کے بحث و احتجاج کا اسلوب ہر جگہ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے اسے غیر معمولی پیدائش کے معاملہ سے تو انکار نہیں۔ لیکن وہ کہتا ہے، اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ایک بندہ، خدا یا خدا کا بیٹا ہو جائے؟ ایک انسان۔ جو تمام انسانوں کی طرح انسان تھا، اور اپنی پیدائش کے لیے ماں کے پیٹ کا محتاج، بہرحال انسان ہی ہوگا۔ خدا یا خدا کا بیٹا کیوں مانا جائے؟

یہودیوں کا الزام

جو لوگ قرآن کو غیر معمولی پیدائش کا منکر ثابت کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے اپنی توجیہات کی ساری بنیاد اس مقدمہ پر رکھی ہے کہ رخصتی سے پہلے یوسف اور مریمؑ میں زوجیت کا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اور یہ اگرچہ شریعت موسوی کے خلاف نہ تھا، لیکن وقت کے رواج کے خلاف ضرور تھا، اسی لیے لوگوں پر بچّے کی پیدائش گراں گزری۔ وہ اسے ناجائز حمل کا نتیجہ قرار دینے لگے، لیکن اول تو یہ محض ایک ظنی بنیاد ہے، جس کے لیے تاریخی قرائن کا کوئی سہارا موجود نہیں، ثانیاً خود یہودیوں کی قدیم روایات بالکل اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ انھوں نے حضرت مریمؑ کو متہم کرتے ہوئے یوسف کا نام نہیں لیا تھا، بلکہ پنتھرا نامی کی طرف اشارہ کرتے تھے۔[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا (ENCYCLOPAEDIA BIBLICA)

بہرحال قرآن کو اس بارے میں منکر قرار دینا، شرح و تفسیر کا ایک ایسا اقدام ہے، جس پر کسی طرح ایک دیانت دار شارح کا ضمیر مطمئن نہیں ہوسکتا۔

علم و دیانت کا تقاضا

ہمیں قرآن کا مطالعہ نہ تو اس طرح کرنا چاہیے کہ اسے عجائب پرستیوں کی داستان بنانے کے خواہشمند ہوں۔ نہ عجائب پرستی کے الزام سے بچنے کے لیے اس درجہ مضطرب ہونا چاہیے کہ ہر بے محل سے بے محل توجیہ قبول کرلیں۔ قرآن عربی زبان کی ایک کتاب ہے اور دنیا کی تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ و تراکیب کے بھی ڈھلے ہوئے سانچے ہیں اور اسلوب بیان کے معین اور قطعی دلالات۔ پس چاہیے کہ علم و دیانت کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں اور جو مطلب صاف صاف نکل رہا ہو اسے بغیر کسی جھجک کے قبول کرلیں۔ اگر ہم نے بہ تکلف ایک بات اس کے منہ میں رکھ دی جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کر رہی، تو گو ہم نے اپنے خیال میں ایک بات بنالی ہو، مگر فی الحقیقت بننے والی نہیں۔ یہاں علم و حقیقت کی بے لاگ عدالت موجود ہے۔ وُہ ہر بناوٹ کو اصلیت سے جُدا کرے گی!

باقی رہا یہ سوال کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے معاملات کیونکر عقلاً تسلیم کیے جاسکتے ہیں؟ تو یہ ایک اصولی مبحث ہے، اور اس کا محل "ترجمان القرآن" نہیں، "مقدمۂ تفسیر" ہے۔

باب ۳

حضرت مسیحؑ کی تعلیم کا مقام

انجیل اور قرآن

ترجمان القرآن (سورۂ فاتحہ کی تفسیر) میں لکھتے ہیں:

ہم نے آیاتِ عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ " اس نے (قرآن نے) یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو، کیونکہ ایسا کرنا " حقیقت " نہ ہوتا " مجاز " ہوتا۔ ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ، رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا اور ان کی دعوت کی اصل روح یہی ہے۔ چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں: " تم نے سُنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، لیکن میں کہتا ہوں شریر کا مقابلہ نہ کرنا " یا " اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمن کو بھی پیار کرو " یا مثلاً " کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے، دوسرا گال بھی آگے کر دو " سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک موثر پیرایۂ بیان تھا یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوتِ مسیحؑ اور دنیا کی حقیقت فراموشی

افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔ دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی اور اس لیے دونوں کو تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ قابلِ عمل احکام نہیں۔ معتقدوں نے اگرچہ یہ خیال کیا کہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا، تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہے کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سر تا سر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو، لیکن عملی نقطۂ نگاہ سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔

فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے، جو تاریخِ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی، اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔

تفریق بین الرسل

لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف تھی اور اس لیے ناقابلِ عمل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی

تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسے تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی سچائی سے انکار کر دیں، کیونکہ جو تعلیم فطرت انسانی کے خلاف ہے، وہ کبھی انسان کے لیے سچی تعلیم نہیں ہو سکتی، لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوگا، بلکہ اس کی دعوت کی اصل بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ اس کی دعوت کی بنیادی اصل یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ پیروان مذہب کی سب سے بڑی گمراہی تفریق بین الرسل ہے یعنی ایمان و تصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا۔ کسی ایک کو ماننا، کسی ایک کا انکار کر دینا، اسی لیے اُس نے جابجا اسلام کی راہ یہ تبلائی ہے کہ

لَا نفرق بین احدٍ منهم و نحنُ له مُسلمون۔ ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں (اس کی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو ہمارا اس پر ایمان ہے)

علاوہ بریں خود قرآن نے حضرت مسیحؑ کا یہی پہلو جابجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت و محبت کے پیامبر تھے اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت و قساوت کے مقابلے میں مسیحی اخلاق کی رقت و رافت کی بار بار مدح کی ہے:

وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ (مریم ۲۰) اور تاکہ ہم اس کو (یعنی مسیحؑ کے ظہور کو) لوگوں کے لیے ایک الٰہی نشان اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں اور یہ بات مشیت الٰہی میں طے شدہ تھی۔

وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً (حدید ۲۷) اور ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے (مسیحؑ کی) پیروی کی ہم نے شفقت و رحمت ڈال دی۔

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کیے ہیں پوری فراخدلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات و انجیل کے لیے بھی بیان کیے ہیں مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا رہنما قرار دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جابجا پڑھتے ہیں: واتیناهُ الانجیل فیه هدًی و نورٌ[۱] اور مصدقًا لما بین یدیه من التوراة وهدًی وموعظةً للمتقین[۲]۔ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرت بشری کے

---

[۱] اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے (مائدہ ۴۶) [۲] اور تورات کی جو پہلے سے موجود تھی (سر تا سر) تصدیق ہے نیز متقی انسانوں پر سعادت کی راہ کھولنے والی اور یکسر پند و نصیحت (مائدہ ۴۶)

...ات اور ناقابلِ عمل ہو وہ کبھی نور و ہدایت اور موعظۃً للمتقین نہیں ہو سکتی۔

دعوتِ مسیحی کی حقیقت اصل یہ کہ حضرت مسیحؑ کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت ہی نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

حضرت مسیحؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ دل کی نیکی اور ذات کی پاکیزگی کی جگہ ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری اور خداپرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر تمدن قوتیں قرب و جوار میں موجود تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، آشوری وہ بھی انسانی رحم و محبت کی رُوح سے یکسر ناآشنا تھیں لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی کہ مجرموں کو سزائیں ملنی چاہئیں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جُرموں اور گناہوں کی پیدایش روک دینی چاہیے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے سوا تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری و آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو، جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ رُوح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

مجاز اور حقیقت معمولی سے معمولی کلام بھی، بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے، جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوبردئی ہیں، لیکن افسوس کہ دُنیا میں اقانیمِ ثلاثہ اور کفارہ جیسے دُور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی: ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔

انھوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو" تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے، اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے، بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا جوش بلند یہ ہونا چاہیے اور ایسا ہونا چاہیے کہ دوست تو دوست، دشمن تک کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لیے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایہ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو" ایک ایسے گرد و پیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا

جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا اعلیٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کر دیتا تھا:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

یا مثلاً اگر انھوں نے کہا "اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو"، تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ کو تم اپنا دوسرا گال آگے کر دیا کرو، بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغتِ کلام کے یہ وہ مجازات ہیں، جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور یہ ہمیشہ ہی بڑی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے، یک قلم مختل ہو جائے گا!

رحم و محبت نہ کہ تعزیر

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیحؑ نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا تو ان کے مواعظ کی اصل نوعیت سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لیے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہٖ کوئی مستحسن عمل ہے۔ صرف اس لیے کہ معیشت انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی برائی تھی، جو اس لیے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں، لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا اور وہ رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں، جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اور فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا غلط استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں، تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں اور جنھوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری دہشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا[1]۔ پس اگر حضرت مسیحؑ نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سرتاسر

---

[1] شاید انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی کسی جگہ اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ جس انجیل کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا تھا "وہ کسی حال میں بدلہ لینے اور سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی تھی"، اسی انجیل کے پیروؤں نے نوعِ انسانی کی تعذیب و ہلاکت کا عمل ایسی وحشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج ہم اس کا تصور بھی بغیر دہشت و ہراس کے نہیں کر سکتے۔ پھر یہ جو کچھ کیا گیا، انجیل اور اس کے مقدس معلم کے نام پر کیا گیا۔

م وہ گذر پر زور دیا، تو یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ نفس تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنی چاہتے تھے، بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں، جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتلانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے، تعزیر و انتقام نہیں اور اگر تعزیر و سیاست رکھی گئی ہے۔ و صرف اس لیے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جائے۔ اس لیے نہیں کہ تمھارے دل رحم و محبت کی جگہ سرتا سر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں۔

شریعت موسوی کے پیروؤں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لیے نہیں، بلکہ نجات کی راہ دکھانے آئی ہے اور نجات کی راہ سرتاسر رحم و محبت کی راہ ہے۔

عمل اور عامل میں امتیاز

دراصل اس بارے میں انسان کی یہ غلطی رہی ہے کہ وہ "عمل" اور "عامل" میں امتیاز قائم نہیں رکھتا، حالانکہ جہاں تک مذہب کی تعلیم کا تعلق ہے، اس بات میں، کہ "ایک عمل کیسا ہے" اور اس میں کہ "کرنے والا کیسا ہے" بہت بڑا فرق ہے اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ بلاشبہ تمام مذاہب کا یہ عالمگیر مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کر دیں، لیکن یہ انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے۔ یقیناً انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو، لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طبیب لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے اور بسا اوقات اُن کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں، اُن سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے، یا لوگوں سے کہے ڈرو اور نفرت کرو۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اُس کی ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیماری کا وجود ہوتا ہے، جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی شفقت کا مستحق ہو جائے گا۔

مریض اور مرض

پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن بیمار کے لیے شفقت و ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بھی گناہوں کے لیے نفرت لیکن گنہگاروں کے لیے سرتاپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں وحشت و نفرت پیدا کر دیں لیکن گنہگار انسانوں سے نہیں اور یہی وہ نازک مقام ہے جہاں ہمیشہ پیروانِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی ہے، مذاہب نے چاہا تھا، انھیں برائی سے نفرت کرنا سکھلائیں لیکن برائی سے نفرت کرنے کی جگہ انھوں نے اُن انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنھیں وہ اپنے خیال میں برائی کا مجرم تصور کرتے ہیں۔

گناہ اور گنہگار

حضرت مسیحؑ کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت کی دعوت تھی۔ گناہوں سے نفرت کرو، مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں

کہ اس کی روح و دل کی تندرستی باقی نہیں۔ لیکن اگر اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے تو تم اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر اور زیادہ تمھارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہے۔ تم اپنے بیمار بھائی کی تیمار داری کرو گے یا اسے جلاد کے تازیانے کے حوالے کر دو گے؟ وہ موقع یاد کرو جس کی تفصیل ہمیں سینٹ لوقا کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔ جب ایک گنہگار عورت حضرت مسیحؑ کی خدمت میں آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے ان کے پاؤں پونچھے تو اس پر ریاکار فریسیوں کو (اور فریسیت یعنی (PHARISAISM) سخت تعجب ہوا۔ لیکن انہوں نے (حضرت مسیحؑ نے) کہا، طبیب بیماریوں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ تندرستیوں کے لیے۔ پھر خدا اور اس کے گنہگار بندوں کا رشتۂ رحمت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت ہی موثر اور دلنشیں مثال بیان کی۔ فرض کرو ایک ساہوکار کے دو قرضدار تھے ایک پچاس روپے کا ایک ہزار روپے کا۔ ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کر دیا۔ بتلاؤ کس قرضدار پر اس کا احسان زیادہ ہوا اور کون اس سے زیادہ محبت کرے گا؟ وہ جسے پچاس معاف کر دیے یا وہ جسے ہزار؟

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض ائمہ تابعین نے اشارہ کیا ہے: انکسار العاصیین احب الی اللہ من صولۃ المطیعین۔ خدا تعالیٰ کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہ گار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے!

گدایان ما ازیں معنیٰ خبر نیست
کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

گناہ گار بندوں کے لیے صدائے رحمت

اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں جہاں کہیں خدا نے گناہ گار انسانوں کو مخاطب کیا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔ قل یعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم۔ (الزمر: ۵۴) ءَانتم اضللتم عبادی (الفرقان: ۱۸) اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتۂ پدری پر زور دیتا ہے "اے میرے بیٹے" "اے میرے فرزند!" حضرت امام جعفر صادقؒ نے سورۂ زمر کی اس آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا: "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضبناک نہیں۔ قرآن میں خدا نے بخشش سے زیادہ موقعوں پر یعبادیِ کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گناہ گار انسان کو بھی یعبادیِ کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے؟"

صحیح مسلم کی مشہور حدیث کا مطلب کس طرح واضح ہو جاتا ہے، جب ہم اس روشنی میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

و الذی نفسی بیدہ، لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم و لجاء بقوم یذنبون فیستغفرون۔ (مسلم عن ابی ہریرۃ رضی)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمھیں زمین سے ہٹا دے اور تمھاری جگہ دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہ میں مبتلا ہو، پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے:

خدائے شیوہ رحمت کہ در لباس بہار
بعذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

[...]میں کوئی اختلاف نہیں

پس فی الحقیقت حضرت مسیح کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے۔ فرق صرف محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت [...] نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا، کیونکہ شریعتِ موسوی موجود تھی اور وہ اس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے، [...]قرآن کو اخلاق و قانون، دونوں کے احکام بیک وقت بیان کرنے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس نے پیرایۂ بیان ایسا [...]کیا جو مجازات و تشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تُلا پیرایۂ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے عفو و [...]پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا کہ ناگزیر [...]ں میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کہہ دیا کہ بدلے اور سزا میں کسی طرح کی [...]ثانی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ یقیناً دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

[...]فو و درگزر کی تکرار

و جزاؤا سیئۃ سیئۃ مثلہا، فمن عفا و اصلح [...]رہ علی اللہ، انہ لا یحب الظلمین ۵ ولمن [...]نصر بعد ظلمہ فاولئک ما علیھم من سبیل۵ [...]ما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون

اور (دیکھو) برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوارے، تو (یقین کرو) اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہوں اور جس پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان

[...] وایضاً عن انس قال قال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ، لو اخطأتم حتی تملأ خطیئکم ما بین السماء [...]الارض ثم استغفرتم اللہ، یغفرلکم والذی نفسی بیدہ، لو لم تخطئون ثم یستغفرون فیغفرلھم اخرجہ احمد و [...]ل باسناد رجالہ ثقات و عن ابن عمر مرفوعاً لو لم تذنبوا، لخلق اللہ خلقاً یذنبون ثم یغفرلھم اخرجہ احمد [...]البزار و رجالھم ثقات و اخرج البزار من حدیث ابی سعید نحو حدیث ابی ہریرۃ فی الصحیح، و فی اسنادہ [...]یحیی بن بکیر و ھو ضعیف۔

فی الارض بغیر الحق ط اولٰئك لهم عذابٌ الیم ٥ ولمن صبر و غفر اِنّ ذٰلك لمن عزم الامور۔ (شوریٰ : ۴۱-۴۳)

لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے اور جو کوئی بدلہ لینے کی جگہ برائی برداشت کر جائے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑائی ہی اولوالعزمی کی بات ہے۔

اسلوب بیان پر غور کرو، اگرچہ ابتدا میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ "فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللّٰہ" اور یہ عفو و درگزر کرنے کے لیے اتنا کہہ دینا کافی تھا، لیکن آخر میں دوبارہ اس پر زور دیا "ولمن صبر و غفر، اِن ذٰلك لمن عزم الامور" یہ تکرار اس لیے ہے کہ عفو و درگزر کی اہمیت واضح ہو جائے۔ یعنی یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہو جائے کہ اگرچہ بدلے اور سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے لیکن نیکی و فضیلت کی راہ عفو و درگزر ہی کی راہ ہے۔

دو اور نکتے[۲]

پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے، بُرائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا۔ "جزاء سیئة، سیئة مثلها" یعنی سیئہ کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ بھی "سیئة" ہی ہوگا۔ عملِ حُسن نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا دروازہ اس لیے باز رکھا گیا ہے کہ اگر باز نہ رکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں آنے لگیں گی۔ پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے 'اَصلَحَ' کا لفظ کہا۔ یعنی سنوارنے لگا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہاں بگاڑ کے اصلی سنوارنے والے وہی ہُوئے جو بدلے کی جگہ عفو و درگزر اختیار کرتے ہیں۔

قصص القرآن

مولاناؒ نے اس عنوان کے ساتھ مختلف اوقات میں تین مقالے سپردِ قلم فرمائے تھے، انھیں خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی ایک شکل یہ تھی کہ انھیں بہ اعتبارِ مطالب تقسیم کر لیا جاتا لیکن مناسب یہی سمجھا گیا کہ ان کی اصل ترتیب میں کوئی تغیر نہ کیا جائے اور کتاب کے آخر میں تینوں مقالے بجنسہٖ لگا دیے جائیں۔

(مولف)

باب ۱۴

قصص القرآن

—(۱)—

(سلسلہ ابراہیمی میں دراصل صرف دو ہی صاحبِ شریعت رسول آئے۔ پہلا بنی اسحاق میں خاندان بنی اسرائیل کا اولوالعزم پیغمبر، جس نے فراعنۂ مصر کی شخصی حکمرانی اور محکومی و غلامی سے اپنی قوم کو نجات دلائی۔ دوسرا اس کے مورثِ اعلیٰ خلیل اللہ کی مقدس دعا کا مقصود و مطلوب اور بنی اسماعیل کا نبی اُمّی، جس نے نہ صرف اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے وطن کو، بلکہ تمام عالم انسانیت کو انسانی حکمرانی کی لعنت سے نجات دلائی؛ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (السبا: ۲۸))

مسیح ناصری

مسیح ناصری شریعت موسوی کے ایک مصلح تھے اور خود صاحبِ شریعت نہ تھے۔ ان کی مثال ان مجددین ملت اسلامیہ کی سی تھی جن کا حسب ارشاد صادق مصدوق، "تاریخ میں ہمیشہ ظہور ہوتا رہا۔ وہ کوئی شریعت نہیں لائے۔ ان کے پاس کوئی قانون نہ تھا۔ وہ خود بھی قانون عشرہ موسویہ کے تابع تھے۔ انھوں نے خود تصریح کر دی کہ "میں تورات کو مٹانے نہیں بلکہ پورا کرنے کے لیے آیا ہوں۔" انھوں نے کہا کہ "میرا مقصد صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش ہے۔" اسی لیے اپنی اصلاح کو صرف یہودیوں تک محدود رکھا اور غیر قوموں میں وعظ کرنے کی ممانعت کر دی۔

پس دو ہی شریعتیں ہیں جو سلسلہ ابراہیمی میں آئیں اور دو ہی تھے جن کو خدا نے اپنے قانون کا ایلچی بنایا

رسول اللہ صلعم اور حضرت موسیٰؑ کی مماثلت

یہی سبب ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے کلام کیا اور اس کی شریعت الٰہیہ کے ظہور آخری کی خبر دی تو کہا،

"تیرا خدا تیرے لیے، تیرے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی بھیجے گا تو اس کو مانیو! میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ ان سے کہہ دے گا۔"

(تورات، کتاب استثنا باب: ۱۸)[1]

اس ارشاد الٰہی میں ظہور رسالت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کی خبر دیتے ہوئے وجود منتظر اقدس کی

---

[1] استثنا: (باب: ۱۸-۱۹)

دو خصوصیتیں بیان کی گئیں،

۱۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے مانند ہوگا۔[۱]

۲۔ خدا کا کلام اس کے منہ میں سے ظاہر ہوگا اور جو کچھ خدا اس سے کہے گا، وہی انسانوں کو سنائے گا۔

قرآن کریم نے بھی ان دونوں خصائص نبوۃ محمدیہ کی طرف اشارہ کیا۔ دوسری خصوصیت کے لیے سورہ (والنجم) کے آغاز پر نظر ڈالیے، جہاں فرمایا:

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (نجم: ۳-۴)

وہ اپنی خودی اور رائے سے کچھ نہیں کہتا اس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے، وہی ہے جو اس پر وحی کیا جاتا ہے۔

پہلی خصوصیت کی سورۂ (مزمل) میں تصریح کی،

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ (مزمل: ۱۵)

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو ہدایت و ضلالت کا تم پر گواہ ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح، جیسا کہ فرعون کی طرف حضرت موسیٰ کو بھیجا تھا۔

غرض حضرت موسیٰ سے حضرت داعی اسلام علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مماثلت و مشابہت کو تورات اور قرآن دونوں نے بیان کیا ہے۔

ضروری مباحث

جن لوگوں نے تورات کی اس بشارت بینہ پر بحث کی ہے ان کے لیے ہمیشہ یہ ایک نہایت دلچسپ اور اہم سوال رہا ہے کہ اس مماثلت کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اور دونوں برگزیدہ رسولوں کے اعمال اور نتائج اعمال میں وہ کون کون سی مشابہتیں اور یکساں حالتیں ہیں، جن کی بنا پر لسان اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے کا مثیل و مانند قرار دیا؟

قرآن حکیم کے قصص و مواعظ اور حکم و معارف کے متعلق "الہلال" کا جو انداز بحث و نظر ہے، اس کے لحاظ سے اس موضوع بحث میں بھی بہت سے ملاحظات خاص ہیں، جن کو فرداً فرداً واضح کرنا ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب "اسوۂ موسوی" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا جائے گا اور اسی کے ضمن میں یہ بحث عظیم و مفید بھی پیشکش ارباب ذوق و نظر ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

قرآن حکیم نے اپنے قصص و مواعظ میں سب سے زیادہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا کیوں ذکر کیا؟ اپنے نعائم کے اعلان اور ابتلا و تعذیب کے اظہار، دونوں کے لیے زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے تذکرہ کو کیوں منتخب کیا

---

[۱] سورہ مزمل کی آیت ۱۵ جو آگے آتی ہے۔

انقلاب و حوادث کی تعبیر و تمثیل کے لیے دنیا کی اور بہت سی قومیں موجود تھیں۔ ان سب میں سے صرف ایک یہی قوم کیوں ہر موقع پر پیش کی گئی؟

یہ نہایت اہم سوالات ہیں اور تفسیر کلام اللہ کے ضروری اجزاء جن کا جواب ان شاء اللہ اسی مضمون سے ملے گا۔

بنی اسرائیل اور امتِ محمدیہؐ

لیکن اس سلسلے کے اطراف بحث میں سے ایک بحث خاص قوم بنی اسرائیل اور امت مرحومہ محمدیہ کی باہمی مماثلت و مشابہت بھی ہے اور یہ بھی دراصل اسی مماثلت اولیٰ پر متفرع ہے۔ وقت اور حالات کا اقتضا ہے کہ کم از کم آج ایک سرسری اور غیر مرتب نظر صرف اس ٹکڑے پر ڈال لیں کہ مستقبل کی فرصتوں پر (جن کی امید ہے مگر جن پر اختیار نہیں) کس کس ارادے کو ملتوی رکھیں گے؟

سب سے پہلے ان آیات کریمہ پر نظر ڈال لیجیے، جن کی طرف آگے چل کر ہم کو اشارہ کرنا ہے:

حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ ۙ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۥ

(طٰہٰ: ۸۷-۸۸)

اے موسیٰ! مصر سے ہم لوگوں کے سونے چاندی کے زیور لے آئے تھے، یہاں ہم نے ان کو رکھا اور اسی طرح سامری نے بھی رکھا۔ سامری نے ان زیوروں کو گلا کر ایک گاؤسالہ کی شکل کا بت بنایا، جس میں آواز بھی تھی لوگ پکارے کہ یہی تم لوگوں کا اور موسیٰ کا خدا ہے

پھر فرمایا:

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ۔ (طٰہٰ، ۹۰-۹۱)

ہارون نے کہا: لوگو! تم ایک فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تمہارا خدا تو بس وہی ہے نہایت رحم والا، کہاں جاتے ہو، آؤ، میرے پیچھے چلو، میری بات مانو، ان گمراہوں نے کہا ہم اپنے طلائی خدا کو چھوڑ نہیں سکتے اور ہم تو آخر تک اسی کے سامنے معتکف رہیں گے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم! خدا کی نعمتوں کو ایک ایک کر کے یاد کر، اس نے تجھ کو حکومتیں دیں اور پادشاہیاں بخشیں، اور تجھ کو جو دیا وہ دنیا میں کسی کو نہیں دیا، اے میری قوم! میری بات سن اور ارض مقدس میں

اَلْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝

(مائدہ: ۲۰-۲۱)

جس کو خدا تیرے حصہ میں لکھ چکا ہے چل اور داخل ہو
پشت نہ پھیر، کہ خسران و نقصان میں گرفتار ہو جائے گی

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّکُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَی اللّٰهِ فَتَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (المائدہ: ۲۲-۲۶)

لیکن گنہگار قوم نے سرتابی کی اور کہا کہ اے موسیٰ
پر تو ایک جبار اور قوی قوم قابض ہے۔ ہم تو وہاں ا
وقت تک نہیں جائیں گے جب تک کہ خود وہ نہ نکل
اگر وہ اس سرزمین کو چھوڑ کر نکل گئے تو پھر ہم کو وہاں
میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس پر خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند
انسانوں نے کہا کہ ڈرو نہیں اور نہ خدا کے وعدے
شہر کے دروازے میں چل کر داخل ہو جاؤ، فتح تمھیں
خدا پر بھروسا رکھو اگر تم میں کچھ بھی ایمان ہے۔ وہ بو
اے موسیٰ! ہم تو اس قوت والی قوم سے لڑنے نہیں
اور نہ اس سرزمین میں داخل ہوں گے۔ تم جو کہہ رہے
تمھارا خدا جو حکم دے رہا ہے تو تم ہی دونوں جاؤ او
ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ نے جناب الٰہی میں عرض کی،
میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر زور نہیں
ہم میں اور اس گنہگار قوم میں تفریق کر دے۔ خدا ا
کی سرکشی سے غضبناک ہوا اور اس نے کہا کہ وہ پاک
چالیس برس تک ان پر حرام رہے گی وہ زمین میں س
و پریشان بھٹکتے پھریں گے۔ اے موسیٰ! ان گنہگا
کچھ غم نہ کھانا۔

وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ ۚ وَ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

(بقرہ: ۵۸)

دیکھو، ارضِ مقدس کے دروازے میں جھک کر
اور کہو کہ خدا ہمارے گناہ کا غبار جھاڑ دے، تو
تمھارے گناہ بخش دیں گے اور نیکوں کے درجے
بڑھائیں گے۔

دورِ زوال کی مماثلت

نبوت محمدیہ کی حقیقت و ثبوت کے لیے سینکڑوں دلائل، معجزات اور براہین و آیات ہیں جو ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے، اہل بصیرت نے ان کو دیکھا اور قبول کیا۔ لیکن ایک معجزۂ محمدیہ ہے، جو کسی زمانہ کے ساتھ متعین نہیں، کسی آبادی میں محدود نہیں اور ناظرین و شاہدین خاص سے مخصوص نہیں، اس کو دنیا دیکھتی ہے اور قبول کرتی ہے۔

وہ معجزہ، امت مرحوم کے حالات و حوادث کا اظہار اور اس کے ہر زمانے کے دورِ تغیر و انقلاب کا بیان ہے۔ اس نے ہم کو جس ظہور فتح کی بشارت دی، ہم نے اس کو پایا۔ اس نے ہم کو جن حالات و حوادث کی اطلاع دی، ہم نے ان کو دیکھا۔ اس نے ہم کو جن فتن و مصائب کی خبر دی، ہم نے ان کا مشاہدہ کیا۔ آخر میں اس نے ہم سے کہا:

لتتبعن سنة من كان قبلكم (اى اليهود) باعًا بباع و ذراعًا بذراع و شبرًا بشبر حتى لو دخلوا فى جحر ضب لدخلتم فيه۔

تم سے پہلے جو قوم تھی (یعنی یہودی) تمہاری حالت بھی بالکل ان ہی جیسی ہوگی، ایک گز، ایک ہاتھ اور ایک بالشت کا بھی فرق نہ ہوگا، یہاں تک کہ اگر وہ سوسمار کے سوراخ میں گھسے ہوں گے، تو تم بھی گھسو گے۔

بنی اسرائیل کا مصری دور

جس طرح بنی اسرائیل کا باپ یعقوب اپنے گھرانے کو لے کر ارض کنعان سے مصر آیا، جہاں اس نے خیر و برکت اور حکومت و قوت پائی۔ اسی طرح ہم کو بھی ہمارے بزرگ ارض عرب سے لے کر تمام اطراف عالم میں پھیلے۔ ہم نے جدھر رُخ کیا، خیر و برکت اور حکومت و قوت کی نعمتیں اپنے ساتھ پائیں۔ حضرت یوسف نے عزیز مصر سے کہا تھا کہ "اجعلنى على خزائن الارض (۱۲: ۵۵)" "مجھ کو زمین کی خزینہ داری پر متعین کر دیجیے"۔ لیکن ہمارے سامنے خود زمین نے اپنے خزانے اگل دیے اور پکاری کہ مجھ کو قبول کرلو!

بنی اسرائیل ایک مدت تک مصر کی سرزمین میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے، "تا آنکہ فرعون مصر نے ان کے عہدے توڑ دیے، ان کے مناصب چھین لیے، ان کے عزیز فرزندوں کا خون بہایا اور ان کی عورتوں کو ذلت کی زندگی جینے کے لیے زندہ رکھا۔

وقت کے فرعون

ہم بھی جس سرزمین میں گئے ایک مدت تک عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے، تا آنکہ فراعنۂ عصر نے ہم کو ہماری شہنشاہیوں سے معزول کر دیا، ہمارے عزت و جلال کے تخت کو اُلٹ دیا، ہمارے بھائیوں اور فرزندوں کا خون بہایا، کبھی گرم ریگستانوں میں، کبھی سنگلاخ زمینوں میں، کبھی آباد شہروں میں اور کبھی کسی مقدس عمارت کی دیوار کے نیچے! ہماری عورتیں بھی

مردوں کے بعد زندہ رہیں کہ ذلت و نکبت قومی کے تماشے دیکھیں۔ بنی اسرائیل کا فرعون ایک تھا، جو از پو کے ایک گوشہ میں صرف " الیس لی ملك مصر؟ " پر مغرور تھا۔ لیکن ہمارے سامنے فراعنۂ زمانہ کی ایک جماعت ہے، جس کا فرعون اکبر صرف " الیس لی ملك مصر " (کیا میرے قبضہ میں ملک مصر نہیں ہے) ہی پر مغرور نہیں بلکہ " الیس لی العالم کله ؟ " (کیا تمام دنیا میرے پیٹ نہیں ہے) کا مدعی ہے !!

غلامی سے نجات دلانے والے

خدا نے اس وقت بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کو کھڑا کیا جنھوں نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی، اور فرعون کو اس کے نوکروں اور رتھوں کے ساتھ بحر احمر میں ڈبو دیا جو بہتے ہوئے پانی کی ایک خلیج ہے۔

ہم میں بھی ہر دور فرعونیت میں نئے نئے موسیٰ اٹھے۔ جنھوں نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور ان کو ان کے سامانوں کے ساتھ اس " بحر احمر " میں ڈبو دیا جو بہتے ہوئے خونوں کا حقیقۃً ایک سرخ دریا تھا !

سامری

عبور بحر احمر کے بعد بنی اسرائیل میں سامری پیدا ہوا، جس نے بنی اسرائیل کو دین موسوی سے بیزار کیا، ان کی جمعیت سیاسیہ کو منتشر کر دیا، سونے چاندی کے زیوروں کو بزور سحر گائے (کے بچھڑے) کی صورت میں ڈھال کر خدا بنایا۔ آستانۂ الٰہی سے مغرور ہو کر اپنا اور اس اسرائیل کے گھرانے کا سر بتوں کے آگے جھکایا جس کو کہا گیا تھا:

" سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا اکیلا خداوند ہے " (۱) " اور تو (بتوں) کے آگے خم مت ہوجیو، نہ ان کی بندگی کیجیو۔ اس لیے کہ میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں " (۲)

مسلمانوں کی گمراہی

مسلمانوں کے بھی ہر دور موسوی میں خود ان کی قوم سے " سامری " اٹھے جنھوں نے حق کے ابطال اور باطل کے احقاق کی کوشش کی۔ اسلامی ممالک کے دیگر اقطاع و جوانب سے قطع نظر کیجیے! خود اس ہندوستان میں بھی ایک " سامری " اٹھا جس نے اپنی جاہ و عزت کے جادو سے مسلمانوں کو عجیب و غریب کرتب دکھائے۔ اس نے ملت بیضاء کی تحقیر کی، قلوب کو مذہب سے بیزار کیا، مسلمانوں کی جمعیت سیاسی کو منتشر کیا اور خدا سے مغرور ہو کے اصنام حیوانیہ کے آگے نہیں بلکہ " انسانی بتوں کے سامنے اپنا اور تمام قوم کا " سر " جھکا دیا اور اس نے خلیل کے فرزندوں کو بت پرستی کی دعوت دی، جس نے کہا تھا:

بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ (الانبیاء: ۵۶) — تمہارا خدا وہ ہے جو آسمان و زمین کا خدا اور ان کا خالق ہے

---

(۱) استثنا ۶ - ۴ (۲) خروج ۲۰ - ۵

اور کہا:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۵۲)

یہ کیسے بُت ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو؟

نیا "صنم خاکی"

وُہ خدا کی عجائب قدرت کا منکر تھا، لیکن "انسانی خداؤں" کی قدرت و استیلاء سے مرعوب تھا۔ وُہ گو ملکوت صفت انسانوں کے خوارق عادات، اور دلائل معجزات کا قائل نہ تھا، لیکن وُہ خود شیاطین الانس کے "عمل زیرلبی" کا معمول اور "سحر خوش لبی" سے مسحور تھا۔ اس نے سونے چاندی کے سکوں سے تبدیل کیمیادی کر کے ایک "صنم خاکی" بنایا، جس سے صدائے باطل پرستی اٹھتی تھی اور پھر کہا:

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى۔ (طٰہٰ: ۸۸)

"دیکھو، تمہارا اور موسیٰ کا خدا یہ ہے۔

اس دور فرعونیت و سامریت ہند کے ہارون نے گو سمجھایا:

يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝ (طٰہٰ: ۹۰)

لوگو! تم فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہو، تمہارا خدا تو وہی رحمت والا خدا ہے، میرے پیچھے چلو اور میری بات مانو۔

لیکن "فرعون" سے ڈرنے والوں، "سامری" کے پیروکاروں اور "صنم خاکی" کے پرستاروں نے جواب دیا:

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ۔ (طٰہٰ: ۹۱)

ہم تو کبھی اس خدائے مجسم کو نہیں چھوڑیں گے!

جباروں کا خوف

جب بنی اسرائیل آگے بڑھے اور خدا نے ان کو "نور علم و ہدایت" سے سرفراز کیا، اور خود انھوں نے "گزشتہ" پہ ندامت ظاہر کی تو اس عہد کے موسیٰ صفت انسانوں نے کہا:

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

لوگو! خدا کی نعمتوں کو یاد کرو! اس نے تم کو حکومتیں دیں اور شہنشاہیاں بخشیں، اور پھر تم کو ایمان کی وہ قوت دی ہے جو دنیا میں کسی کو نہیں دی۔ لوگو! آؤ، اس ارض مقدس میں داخل ہوں جس کو خدا نے تمہارے حصہ میں لکھا۔ پشت نہ پھیرو ورنہ خسران و نقصان اٹھاؤ گے۔

جو لوگ فرعون کی جاہ و حشمت سے مرعوب اور "عمالقہ" کی قوت و استیلاء سے دہشت زدہ تھے، وُہ بولے:

يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (مائدہ: ۲۲)

اے موسیٰ! اس سرزمین پر آج ایک جابر و قاہر قوم قابض ہے جب تک وہ خود اس کو چھوڑ کر نہ نکل جائے ہم تو اس سرزمین میں قدم نہ رکھیں گے۔

اسرائیلیانِ عصر کی نادانی

ان اسرائیلیانِ زمانہ کی نادانی کتنی عجیب اور ان کی حقیقت ناشناسی کتنی دردانگیز ہے جو ایک "جبار و قہار قوم" کی سطوت و قہر سے خوفزدہ ہوئے؟ اور پھر عجیب تر اور دردانگیز تر یہ کہ اس نے کہا: "ہم ارضِ مقدس میں اس وقت داخل ہوں گے، جب دشمن خود اس کو ہمارے لیے خالی کر دیں گے۔"

نادانو! غور کرو! یہ "قاہر و جابر قوم" خود "ارضِ مقدس" میں کس طرح داخل ہوئی؟ کیا اس کے دشمنوں نے شہر اس کے لیے خود خالی کر دیا، جیسا کہ تم ان سے امید رکھتے ہو؟ یا خود اس نے ان سے خالی کرا لیا، جیسا کہ درحقیقت ہوا؟

اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (مائدہ: ۲۳)

چلو! شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور جب وہاں داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی فتح مند و غالب رہو گے۔ ان کی قوت و ساز و سامانی کی پروا نہ کرو، خدا پر بھروسا رکھو، اگر تم میں ذرا بھی ایمان ہے۔

"اسرائیلی" جو اپنے سینوں میں خوفزدہ قلوب رکھتے تھے اور قلوب میں قنوط و یاس کے سبب سے شرک و کفر کی سیاہی و ظلمت تھی، ڈرے کہ "قوم جبار" جو ان سے ظاہری ساز و سامان میں زیادہ ہے ان کو پامال نہ کر دے۔ انھوں نے صاف کہا:

اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (مائدہ: ۲۴)

ہم ہرگز ہرگز اس وقت تک اس پر قبضہ کرنے نہ جائیں گے، جب تک کہ یہ قوت والی قوم وہاں موجود ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو اور تمھارا خدا جو حکم دے رہا ہے تو بس یہی دونوں لڑنے کے لیے جائیں، ہم تو بس یہاں بیٹھے ہیں۔

کس پامالی کا خوف ہے؟

لیکن اے بیہود کی زندگی جینے والو! جب اس "ارضِ مقدس" کو جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے اور جسے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا نے تمھارے باپ دادوں کو دیا تھا۔ اس "قہار و جبار" قوم نے پامال کر دیا ہے اور تمھاری وراثت تم سے چھین لی ہے تو اب کس پامالی سے ڈرتے ہو؟ اور اب کون سی وراثت باقی رہ گئی ہے، جس کے

بننے کی امید کرتے ہو؟

اس عہد کے موسیٰ نے یہ کہا، پر ان کا دل نرم نہ ہوا اور نہ "ارضِ مقدس" پر اپنی جانوں کی قربانیاں
گوارا کیں کہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہوتا بلکہ انھوں نے اس کو جھٹلایا کہ "خدا جباروں سے لڑنے کا
دیتا ہے" یہ دیکھ کر صالحین و مومنین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (مائدہ: ۲۵)

خدایا! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی اور پر زور نہیں رکھتا، ان گنہگاروں میں اور ہم میں تفریق کر دے۔

مومنین و فاسقین میں امتیاز

خدا نے سنا اور مومنین و فاسقین میں امتیاز کیا، اور وہ نورِ امتیاز اپنے مخلصین کو بھی بخشا جس سے انھوں نے ان فاسقین کو
پہچانا، جنھوں نے اپنے پکارنے والوں کی آواز نہیں سنی تھی۔ خدا کا کلام ان تک پہنچا لیکن انھوں نے
صاف کہا: "سمعنا و عصینا (بقرہ: ۹۲)" ہم سنتے ہیں اور نہیں مانتے!" واشربوا فی قلوبھم العجل
بکفرھم (بقرہ: ۹۲)" اس صنمِ نقرئی وطلائی کی محبت ان کے کفر کے سبب ان کی رگ رگ میں سما گئی۔
تب خدا کا غضب اس قوم پر بھڑکا اور اس نے کہا:

فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (مائدہ: ۲۶)

اس ارضِ مقدس میں داخل ہونا اب چالیس برس تک تمھارے لیے حرام کر دیا گیا۔ سرگردان و پریشان ملک میں پھرتے رہو۔ اے موسیٰ! ان گنہگاروں کا تم کچھ غم نہ کھانا۔

التجا بر درگاہِ کبریا

لیکن اے خدا! جن پر چالیس برس تک تیرا عذاب بھڑکا وہ اپنی سزا کو پہنچ چکے اور
اب وہ اپنی "چہل سالہ گمراہی" کے بعد تیری طرف جھکے ہیں اور جیسا تو نے حکم دیا تھا کہ:

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا۔ (بقرہ: ۵۵)

ارضِ مقدس کے دروازے میں خدا کے سامنے جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔

اب وہ صداقت و حریت کے اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے ہیں تاکہ "ارضِ مقدس" کو
جباروں کی نجاست سے پاک کریں اور جیسا کہ تو نے کہنے کے لیے کہا تھا:

حِطَّةٌ (بقرہ: ۵۵)

خدایا! ہمارے گناہ جھاڑ دے۔

اب وہ کہتے ہیں کہ "ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا" پس اپنا وہ وعدہ پورا کر، جو تو نے کیا تھا کہ:

نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ وَ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (بقرہ: ۵۵)

ہم گناہ بخش دیں گے اور نیکوں کے مراتب و مدارج بڑھا دیں گے۔

باب ۴۲

قصص القرآن

(۲)

اس سے پہلے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے ہم کو پندرھویں صدی (ق۔م) میں مصر کے سیاسی حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

تقریباً دو ہزار قبل مسیح حدود عرب سے ایک سامی قوم جو مختلف قبائل کا مجموعہ تھی، مصر پر حملہ آور ہوئی، اور اس کو فتح کیا۔ عرب اس کو عاد، ثمود اور معین جیسے قبائل کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اسرائیلی اس کو "عمالیق" کہتے ہیں۔ اہل بابل و عراق کے ہاں اس کا نام "عربی" اور "عمورانی" ہے اور خود مصری اس کو بنظرِ تحقیر "شاشو" اور "ہیک شاش" یعنی "شاہان بادیہ" اور "شاہان چوپان" کہتے ہیں، کیونکہ عرب کے سامی بادیہ نشین درحقیقت اونٹوں کے چرواہے تھے۔

مصر کے دو حصے مصر عہد قدیم سے دو حصوں میں منقسم ہے: مصر بالا اور مصر زیریں۔ مصر زیریں بالکل بحر احمر کے کنارے سے حدود عرب کے مقابل واقع ہے۔ نہر سویز کے کھودنے سے پہلے بحر روم اور بحر احمر کے مابین، ایک چھوٹا سا خشک قطعہ حاجز تھا، جو مصر کو حدود عرب و جزیرہ نمائے سینا سے ملاتا تھا۔ نہر سویز اسی خشک قطعۂ ارض کو کاٹ کر اور ان دونوں دریاؤں کو باہم ملا کر بنائی گئی ہے۔ درحقیقت اس نہر نے اس دیوار کو جو مشرق و مغرب یا یورپ و ایشیا کے درمیان حائل تھی منہدم کر دیا، جس سے سیلاب فتنہ و بلا کو مغرب سے مشرق میں داخل ہونے کے لیے نہایت آسان راستہ مل گیا۔

شاشو یا عمالیق اسی خشک راستہ سے، جزیرہ نمائے سینا ہو کر مصر زیریں میں چلے آئے۔ مصر کے عام باشندے جو سام کے بھائی "حام" کی اولاد تھے، شکست کھا کر مصر بالا میں چلے گئے۔ ان سامی فاتحین نے یہاں ایک عظیم الشان حکومت قائم کی، جو تقریباً تین چار سو برس تک عمالیق کے لیے نشانِ فخر و امتیاز رہی۔ عام سامی قبائل مختلف اوقات و حالات میں اپنے ہم نسب و خاندان قوم کے پاس بغرض استمداد و استفادہ آتے جاتے رہتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا سفرِ مصر یہی سبب ہے کہ بیسویں صدی (ق۔م) میں سرخیل قبائل سامیہ

حضرت ابراہیمؑ خلیل کو بابل و عراق یعنی کلدان سے ہم حدود مصر و شام کی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور جب اس ملک میں قحط نمودار ہوتا ہے، تو حضرتؑ مع اپنی بیوی سارہ کے یہاں سے مصر کا رُخ کرتے ہیں۔ مصر زیریں کا سامی بادشاہ جب ایک سامی خاندان کی آمد کی خبر پاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک خاتون کا ہونا بھی سُنتا ہے، تو اس کو اپنے قدیم خاندان سے اتصال کے شوق میں نکاح کا پیغام دیتا ہے، لیکن یہ سُن کر کہ وُہ شوہر دار خاتون ہے، سوءِ قسمت پر افسوس کرتا ہے اور بالآخر سعادت اتصال خاندان اس طرح حاصل کرتا ہے کہ اپنی بیٹی "ہاجرہ" کو حضرت کی خدمت میں دیتا ہے، جس سے اسماعیلی عربوں کی نسل پیدا ہوتی ہے[1]۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ بیل، گدھا، خچر اور اونٹ وغیرہ بہت سامان جہیز میں لے کر کنعان واپس آتے ہیں۔

اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے اسماعیلؑ و اسحاقؑ ہوئے۔ اسماعیلؑ ملک عرب میں آباد ہوئے اور اسحاقؑ سے یعقوبؑ پیدا ہوئے۔ جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ ان کی اولاد "بنی اسرائیل" یعنی فرزندان اسرائیل کہلائی اور خدا نے خود اپنی زبان سے انھیں برکت دی۔

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سے جن کی نسل سے بنی اسرائیل کے بارہ گھرانے قائم ہوئے، ایک بیٹے حضرت یوسفؑ تھے۔ بھائیوں کے اسی تحاسد برادرانہ سے مغلوب ہو کر، جس نے اس سے پہلے اسی گھرانے کے دو اور بھائیوں یعنی "اسماعیلؑ و اسحاقؑ" میں افتراق پیدا کر دیا تھا، اپنے بھائی یوسفؑ کو ایک اسماعیلی قافلے کے ہاتھ جو عرب سے مصر کو جا رہا تھا، بیچ ڈالا۔ عجائب ایام دیکھو کہ آخر الامر بنی اسحاقؑ و بنی اسماعیلؑ کا اس عجیب طریقے سے اتصال ہُوا۔

مصر پہنچ کر اسماعیلی قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو ایک مصری سردار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، جہاں "عزیز" کی بیوی اور حضرت یوسفؑ کا واقعہ پیش آیا اور انھیں قید خانے جانا پڑا، بالآخر تعبیر خواب کی تقریب سے شاہ مصر کے دربار میں پہنچے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہُوا کہ ایک سامی النسل نوجوان ہے، تو وہ نہایت مسرور ہوا

---

[1] یہودیوں کے اس قصے کی کہ شاہ مصر نے زبردستی حضرت سارہ کو اپنے تصرف میں لانا چاہا تھا اور بالآخر حضرت سارہ کی کرامت دیکھ کر اور یہ سُن کر کہ اس کا شوہر موجود ہے، اپنے ارادہ سے باز رہا۔ صرف یہی حقیقت اصلی ہے جو ہم نے بیان کی۔

حضرت ہاجرہ ام اسماعیل کو لونڈی کہنا بھی یہودیوں کی حاسدانہ جہالت ہے۔ اور افسوس ہے کہ مسلمان بھی غلطی سے اس کا یقین کرتے ہیں، حالانکہ خود یہودیوں کی تاریخ سے اس کی پوری تردید ہوتی ہے۔

کہ وہ فرزند سے محروم تھا اور رفتہ رفتہ اس نے زمامِ حکومت حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں دے دی۔

خاندان یعقوبؑ مصر میں

حضرت یوسفؑ نے اب مناسب سمجھا کہ اپنے خاندانوں کو کنعان سے جہاں وہ مبتلائے قحط تھا، مصر بلا لیں کیونکہ یہاں اب اس کے لیے حکومت کا سامان تھا۔ حضرت یعقوبؑ مع اپنے خاندان کے مصر آ گئے۔ شاہ مصر نے بزرگ خاندان سام کا استقبال کیا اور جاگیر و مناصب ان کو عطا کیے۔ حضرت یعقوبؑ نے اتحاد نسل کے اظہار کے لیے کہا کہ "ہم بھی اے پادشاہ چرواہے ہیں۔"

مصر سے سامیوں کا اخراج

اس واقعہ سے تقریباً تین سو برس بعد تک اسرائیل کی اولاد ملک مصر میں بڑھتی اور پھیلتی گئی، لیکن خود اصل حکمران سامی خاندان روز بروز ضعیف ہوتا گیا یعنی عاقبۃ الامر جیسا کہ ہمیشہ اہل ملک بیرونی قوم پر غالب آتے ہیں، سامی خاندان جو مصر قدیم کا باشندہ تھا، غالب آ گیا اور سامیوں کو مصر سے نکال دیا۔ صرف بنی اسرائیل جو در اصل دوسرا سامی خاندان تھا اور عہد یوسفؑ سے مصر کے ایک سرسبز و شاداب قطعۂ ارض پر قابض تھا، ملک میں باقی رہ گیا۔

"اسرائیل کی اولاد برومند اور فراواں ہوئی۔ اس نے نہایت زور پیدا کیا گیا، اور زمین ان سے معمور ہو گئی، تب مصر میں ایک نیا بادشاہ (یعنی نئی بادشاہی) جو یوسف کو نہ جانتا تھا، پیدا ہوا اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا:

"دیکھو! بنی اسرائیل ہم سے زیادہ قوی تر ہیں، آؤ ہم ان کے ساتھ ایک دانشمندانہ چال چلیں، تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور جنگ پڑ جائے تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں، ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔

بنی اسرائیل کا دورِ مصائب

اس لیے مصریوں نے ان پر خراج کے لیے محصل بٹھائے تاکہ وہ سخت کاموں کے بوجھ سے ان کو ستائیں۔ ان محصلوں نے فرعون کے لیے شہر (فتوم[1]) اور (رعمیس) میں خزانے بنوائے۔" (خروج باب ۱: ۱۲)

خدائی سنت

لیکن سنن الٰہیہ کا یہ قاعدہ جاری ہے کہ قوت حاکمہ ملت محکومہ کو جس قدر دباتی ہے اسی قدر وہ اور ابھرتی ہے، اور جس قدر اس کے مظالم میں اشتداد ہوتا ہے، اتنا ہی خیال انتقام، ملت محکومہ کے بازوؤں میں زور اور ارادوں میں عزیمت پیدا کر دیتا ہے۔

مصریوں نے اسرائیل کی اولاد کو جتنا دکھ دیا وہ اور زیادہ بڑھی کہ ایسا ہونا سنت الٰہی کا اقتضا تھا۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ربڑ کے ایک گیند کو جب ایک بچے نے تمہارے سامنے زمین پر پٹکا تھا تو ردعمل کے

---

[1] یہ مقام اسماعیلہ (جسے اسماعیلیہ کہا جاتا ہے) سے مغربی جانب اور تل الکبیر سے مشرقی جانب تھا۔ ایک روایت کے مطابق موجودہ اسماعیلیہ سے بارہ میل مغربی جانب۔ تورات کی کتاب خروج میں اسے "سکات" کہا گیا ہے۔ (خروج ۱۲: ۲۷)

ت دفع سے وُہ پھٹا گیا تھا، اسی قوت دفاع کے ساتھ وہ زمین سے بلند ہوا۔ زخم کے مواد فاسد کو
کا راستہ نہ دو گے تو وہ آخرکار ناسور بن کر باہر نہ بہہ جائے گا، جس کا اندمال موت کے سوا کچھ نہیں۔
وہ آتش فشاں کی حقیقت کیا ہے؟ اسی حرارت و جوش کی ایک لہر ہے جس کو زمین سے نکلنے کی راہ
لی۔ آخرالامر طبقات زمین کی دیواروں کو توڑ کر قلۂ کوہ کو ہلاتی ہوئی باہر نکلی اور دُور دور تک آبادیوں کو
ان کر دیا۔

گ مکانوں میں پانی نکلنے کے لیے راستے بناتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ایک ہی برسات میں مکانوں
ین حل جائیں۔

صری اب بنی اسرائیل کی کثرت و قوت سے خوف زدہ ہوئے اُنھوں نے بنی اسرائیل سے کام لینے
ی۔ ذلیل، سافلانہ اور نیچے درجہ کی ہر قسم کی خدمت ان سے لے کر ان کی زندگی تلخ کر دی" کیونکہ
ساری خدمتیں جو وہ کرتے تھے مشقت اور ذلت کی تھیں۔" (خروج ۱: ۱۵)

ت اور تکمیل ضروریات

فطرت اپنی ضرورتوں کو آپ پُورا کرتی ہے۔ ایک صحرائی حیوان اگر کسی کوہستان
میں پہنچ جائے تو چند نسلوں کے بعد کوہستانی زندگی کے لائق اس کے
پنجے، جبڑے اور روئیں خود بخود ہو جائیں گے۔ اگر کسی گرم ملک کے حیوان کو برفستان میں
ل کرو تو چند انقلابات نسلیہ کے بعد شدائد برودت و برف کے تحمل کے لائق وہ خود اپنا جسم تیار
گا۔

ب زمین میں گرمی، ہوا میں تپش اور موسم میں امس ہوتی ہے تو دست نصرت الٰہیہ بارش کے لیے
ار خود ہوا میں پھیلا دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مدبر عالم کی شان تدبیر و تہیہ اسباب کی تحقیر ہو۔ وہ
ت کو پیدا کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کے لیے تہیہ سامان و اسباب کرتا ہے، و ماذالك عليه
ز۔

س جب کوئی قوم مضطر و مضطرب، شدائد و خطرات سے محاط، آلام و مصائب کا مرجع، قہر و جبر
انشانہ، انواع تشدید و تعذیب کا ہدف ہو، تو یقین کرو کہ خدا سے مدبر عالم کا دست تدبیر مصروف کار ہے،
رت کے لیے وہ خود ہی سامان پیدا کر رہا ہے کیونکہ خود اسی نے تو پہلے ضرورت بھی پیدا کی۔

ت موسیٰ کا ظہور

بنی اسرائیل مصر کی سرزمین میں انواع قہر و تعذیب میں گرفتار تھے۔ ضرورت پیدا تھی،
پس خدا نے نظر اٹھائی اور اس نے موسیٰؑ کو "وادی طویٰ" میں "جبل طور"
کے نیچے کھڑا دیکھا۔ وُہ پکارا:

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۔ (۲۰-۲۵) موسٰی! فرعون کے پاس جاؤ، اب اس کا طغیان حد پہنچ چکا۔

موسٰیؑ تنہا لیکن حق وصداقت کی جمعیت غیر مرئیہ کے ساتھ جلی طور سے اترا اور دربار شاہی کا رُخ کیا۔ اس نے فرعون کو خطاب ربانی سنایا:

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ (۲۰-۴۸)

بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے، تکلیفیں نہ دے، ہم خدا کی نشانی تیرے پاس لائے ہیں اس نشانی کی اطاعت کرے گا تو سلامت رہے گا۔ خدا نے ہم کو بتایا ہے جو اس نشانی کو تسلیم نہیں کرے وہ آخر الامر گرفتار عذاب ہوگا۔

وُہ جو دنیاوی ساز و سامان پر مغرور، حکومت فانیہ کے نشہ سے چور، اور اپنی قوت و استبداد قہر و جبر پر متکبر ہیں، وہ ہر صدائے اصلاح، اور ہر ندائے موعظت کو اپنے لیے صاعقۂ موت اور قیامت سمجھتے ہیں۔ " یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ" (۶۳ : ۲) وُہ صدائے اخلاص و موعظت کے استماع کی قوت نہیں رکھتے کہ ان کا دل ان سے کہتا ہے: "یہ صدائے اخلاص و موعظت نہیں، ہماری حکومت قاہرہ کے لیے درائے رحیل ہے۔"

وہ اعمال تنبیہ و اصلاح کے دیکھنے کی قوت نہیں رکھتے کہ ان کا نفس ان کو کہتا ہے: "یہ اعمال تنبیہ و اصلاح نہیں، ہماری عزت و قوت غیر فانی جسم کے لیے سازش قتل و سامان موت ہے۔"

کبھی وہ داعی و منادی حق کو خطاب کرتا ہے:

"میں تمہاری آواز سے ڈرتا ہوں کہ اس سے میرے کنگرۂ حکومت کو لرزش ہوتی ہے۔"

کبھی وُہ خود اپنی قوم کے افراد صالحہ کو آواز دیتا ہے:

"ہاں اس کی صدائے جاذب اور ندائے دلربا سے متاثر نہ ہونا! یہ تم کو اپنی آواز مقناطیسی سے معمول کر کے حکم دے گا کہ ان میٹھے چشموں، ان سرسبز میدانوں اور ان بلند خیموں سے نکل جاؤ، کیونکہ اب ان کا مالک آتا ہے اور تم ان پر بغیر حق کے قابض تھے۔"

فرعون نے موسٰیؑ کو کہا جو اس عہد کا داعی اور حق کا منادی تھا:

اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰی ؟ (۲۰-۵۹) اے موسٰی! کیا اس لیے تو ہمارے پاس آیا ہے اپنے زور سحر سے ہم کو ہماری حکومت سے بے دخل کر دے۔

پھر اپنی قوم کے ان رجال صالحین کی طرف مخاطب ہُوا جن کا قلب حق کا مستقر، جن کے کان استماع حقائق کے لیے مستعد اور جن کے ہاتھ اعانت ضعفا کے لیے بلند رہتے ہیں اور جن کی حسب تدبیر الٰہی کسی ملک میں کمی نہیں، اور کہا:

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ٥ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ٥ (۲۰-۶۳-۶۴)	یہ ساحر ہیں جو چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ملک و حکومت سے بے دخل کر دیں اور تمہارے بہترین طریقہ و تہذیب کو برباد کر دیں، کوئی تدبیر متفقاً سوچو، اور پھر صف بہ صف مقابلہ کے لیے آجاؤ۔ آج جو بلند رہا، وہی کل کو کامیاب ہو گا۔

جب کوئی ضعیف و کمزور قوم آمادۂ اعانت حق ہوتی ہے، تو اعدائے حق و صداقت اپنی قوت و طاقت کے عجیب و غریب کرشموں سے اس کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، ان کے فرمان سزا اور فرد تعزیر کی تحریریں خوفناک سانپوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتی نظر آتی ہیں، حالانکہ وُہ بے جان ہوتی ہیں:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۔ (۲۰-۶۶)	جادو گران فرعون کی رسیاں اور ڈنڈے ان کے زور سحر سے، ایسا خیال ہوتا تھا کہ (گویا) سانپ بن بن کر دوڑ رہے ہیں !!

ناصر حق اور داعی صداقت چند لمحوں کے لیے خوف سے کانپ جاتا ہے کہ آخر وُہ بھی انسان ہے۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ٥ (۲۰-۶۷)	حضرت موسٰی نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔

مگر پھر معاً خدائے مجیب الدعوات کی آواز غیر مسموع دل کو تسلی بخشتی اور رُوح کو اطمینان دیتی ہُوئی سنائی دیتی ہے:

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ٥ (۲۰-۶۸)	اے ناصر حق و صداقت!! خوف نہ کر کہ غلبہ تیرے ہی لیے ہے۔

ہاں تیرے ہاتھ میں شمشیر آہنی نہیں لیکن تیرے داہنے ہاتھ میں لکڑی کا ایک خشک آلہ ہے۔ اس آلہ معجز نما سے دشمنوں پر حملہ آور ہو کہ یہ ان کی شہرت کا چراغ گل، ان کے ساز و سامان کی نمائشی چمک کو دھندلا اور ان کے سفاکانہ امن اور جابرانہ عدل کے ایوان کو متزلزل کر دے گا۔

اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ	موسٰی! اپنے داہنے ہاتھ کی لکڑی ڈال دے۔ انھوں نے

اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ۝ (۲۰-۶۹)

اپنے تصنع و فریب سے جو کچھ بنایا ہے اس کی یہ صرف ساحرانہ فریب و تدبیر ہے، جو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔

معجزۂ صداقت

صداقت ایک معجزہ ہے جو اپنی تاثیر کے لیے شرمندہ اسباب نہیں۔ وُہ جو دل وہ جو عداوت رکھتے ہیں، وہ جو اپنی قوت و استیلا پر مغرور ہیں، صداقت کا ظہور ہوتا ہے تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں کہ ہم نے صداقت آسمانی کو بادلوں سے اُترتے دیکھا اور

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ۝ (۲۰-۷۰)

"ساحر جو اپنی قوت سحر کے زور پر موسیٰ کے نکلے تھے، حق کا نشان دیکھ کر اطاعت کے سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے: ہم نے خدائے موسیٰ کا نشان دیکھا اور قبول کیا!"

شریر فرعونیوں کی آنکھیں روشن، لیکن دل اندھے ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی قوت پر اور نشۂ حکومت سے مخمور رہتے ہیں۔ لوگ جب روشنی کو چشمۂ خورشید سے طلوع ہوتے ہُوئے دیکھیں تو کہتے ہیں کہ روشنی طلوع ہُوئی اور ہم نے دیکھا کہ وُہ دل کے سچے ہیں اور آنکھ کے بھی، لیکن فرعونی کہتے ہیں کہ جب ہم نے نہیں کہا کہ دیکھا، تو تم نے کس کو دیکھا اور قبول کیا؟

فرعون نے کہا: کیا تم میری ہیبت سے نہ ڈرے؟ کیا تم میرے زورِ حکومت سے مرعوب نہ ہُوئے؟ کیا تم میری قوت تعزیر سے خوف زدہ ہو کر نہ کانپے؟ تم کس کی صدا کو قبول کرتے، اور کس کی روشنی کو دیکھتے ہو؟ تم کہو کہ نہ ہم سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں، ورنہ تم دیکھتے ہو کہ جلاد کی تلوار تمہارے سامنے ہے، سُولی کا درخت تمہارے پیچھے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰی ۝ (۲۰-۷۱)

فرعون بولا! بغیر میرے کہے تم نے قبول کر لیا، سب کا سحر میں استاد ہے۔ اس قبول سے فوراً ورنہ تمہارے ہاتھ پاؤں ٹکڑے کر دیں گے، اور درخت کے تنا میں لٹکا کر سُولی دے دیں گے تو کس کا عذاب سخت اور دائمی ہے؟

لیکن جو سنتے ہیں وُہ کیونکر کہیں کہ نہیں سنتے؟ اور جو دیکھتے ہیں وُہ کیونکر کہیں کہ نہیں دیکھتے؟ پھر اس

تخت پر بیٹھنے والو! اے حکومتِ فانیہ کا تاج سر پر رکھنے والو! اے قوانینِ ظالمہ و قواعدِ جائرہ کی تلواریں چمکانے والو! اور اے جلاوطنی اور سُولی سے ڈرانے والو! ہم تمہاری قوت کو جانتے ہیں لیکن مانتے نہیں۔ ہم تمہاری طاقت سے بے خبر نہیں۔ لیکن ہم کو اس کا ڈر بھی نہیں۔ تمہاری قوت و طاقت سے بھی پرے ہم ایک اور قوت و طاقت کو دیکھتے ہیں۔ جسم تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن دل تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ پس جو کچھ کرنا ہو کر گزرو کہ دل نے جس کو دیکھا ہے اس کے قبول و دعوت سے آسمان کے نیچے اسے کوئی شے روک نہیں سکتی۔ کیا یہی جواب نہ تھا جو موسیٰ پر ایمان لانے والوں نے فرعون کو دیا تھا:

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ۝ وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝

(۲۰: ۷۲-۷۶)

"اے فرعون! ہم کو خدا کی جو نشانیاں پہنچ چکی ہیں جس نے ہم کو پیدا کیا، اس کو چھوڑ کر تیری اطاعت نہیں کر سکتے، تجھ کو جو کچھ کرنا ہے کر گزر! تیرا حکم صرف ہماری اس دنیاوی زندگی ہی تک ہے اور بس، ہم اپنے خدا کے احکام کو قبول کر چکے۔ تا وہ ہماری خطاؤں سے درگزر کرے اور جن برائیوں کے کرنے پر تو نے مجبور کیا اس کو بھلا دے۔ ہمارا خدا نیک اور دائم ہے۔ خدا کے احکام کا جو مجرم ہوگا، اس کے لیے جہنم ہے، جس میں نہ تو زندگی ہے کہ اس میں مسرت نہیں، اور نہ موت ہے کہ تکلیف سے نجات نہیں اور جو خدا کے احکام کو مانے گا اور اس کے بتائے ہُوئے نیک کاموں کو کرے گا، اس کے لیے درجات عالیہ ہیں، نیز باغ جاوید جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اور دراصل یہ پاک لوگوں کے ایمان و ایقان کا پاک اجر اور پاک جزا ہے!"

باب ۴۴

قصص القرآن

(۳)

حقوق و فرائض عباد میں سے سب سے اول و افضل فرض یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی کی حرمت اس کی جان کی عزت کرے، جب تک حرمت زندگی اور عزت جان نہیں، اس وقت تک دنیا میں راحت و امن بھی نہیں۔

قابیل و ہابیل کتب الٰہیہ نے بتایا ہے کہ اس بدترین فعل شیطانی کا مبتدع اول وہ گنہگار انسان قابیل تھا جس کے سوء نیت اور خباثت قلب کو دیکھ کر خدا نے قربان گاہ میں اس کی قربانی قبول نہ کی لیکن اس کے بھائی ہابیل کی قربانی قبول ہوئی کہ وہ نیت کا خالص اور دل کا نیک تھا۔ یہیں سے قربانی کی حقیقت بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ جانور کی گردن سے خون گرانے کا نام نہیں، بلکہ نیکی اور پاکی کے چند قطرات خون سے عبارت ہے، جو خدا کے نام پر دل سے کہ مستقر خیالات ہے، ٹپکیں:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ	خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ صرف تمہاری نیکی ہی خدا تک پہنچتی ہے۔

(الحج: ۳۷)

قابیل نے دیکھا کہ خدا نے اس کے بھائی ہابیل کی قربانی کو عزت بخشی لیکن اس کی قربانی کو عزت نہ دی وہ رنجیدہ ہوا اور اپنے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا۔ (توراۃ۔ پیدائش باب ۴ آیت ۴)

قرآن مجید نے اس قصہ کو ان الفاظ میں دہرایا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ	اے پیغمبر! ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا سچا قصہ سنا جب دونوں نے خدا کے حضور اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ جس کی نہ ہوئی اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کروں گا بھائی نے کہا: قربانی خدا نیکوں کی قبول کرتا ہے اور اگر تم میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہو تو بڑھاؤ، لیکن

اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۚ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (المائدہ: ۲۷ - ۳۰)

نہیں بڑھاتا۔ میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا، دونوں کا گناہ تم ہی اٹھاؤ اور دوزخ کے سزاوار بنو کہ ظالموں کی یہی جزا ہے۔ پہلا بھائی اپنے نفس کا مطیع بن کر اپنے بھائی کا قاتل ہوا اور مبتلائے خسران۔

یہ پہلی خونریزی تھی جو دنیا میں ہوئی اور خون بے گناہی کا پہلا قطرہ تھا جو زمین پر گرا۔ دنیا میں جب کبھی اس کی ظاہر ہوگی تو آدم کا قاتل فرزند ہی اس کا ذمہ دار ہوگا کہ اس شرارت کا تخم زمین میں سب سے پہلے اسی نے بویا:

حدیث صحیح ہے:

لا تقتل نفس الاکان لابن آدم اول کفل منها۔ (بخاری)

دنیا میں جب کوئی مظلوم قتل کیا جاتا ہے تو آدم کے فرزند اول کو بھی اس میں سے حصہ ملتا ہے۔

نیکی و بدی کا بیج

اسی طرح ہر نیکی کا مبتدع اور فاعل اول، جب تک وہ نیکی دنیا میں باقی ہے، اس کے ثواب عمل سے بہرہ ور ہوگا، کیونکہ سب سے پہلے اسی نے دنیا کو یہ نیکی سکھائی۔ یہی مطلب ہے حدیث مشہور کا:

من سن سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها۔ (ص۔ ح)

جو کوئی نیک طریقہ جاری کرے گا، اس کو بھی اس نیکی کرنے والے کی طرح ہمیشہ ثواب ملے گا۔

پس جو وجود دنیا میں کوئی بدی لایا، وہ تمام دنیا کا دشمن ہے کہ وہ بدی ہر ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے اور جو کوئی نیکی سکھاتا ہے وہ تمام دنیا کا محسن ہے، کیونکہ اس سے دنیا کی ہر زندگی متمتع ہوگی۔ اسی لیے خدائے پاک نے آدم کے ان دونوں بیٹوں کے قصے کے بعد فرمایا:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ (المائدہ: ۳۲)

اسی لیے ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ جو کسی کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں اس نے کوئی فتنہ برپا کیا ہو، قتل کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوع انسانی کو قتل کرتا ہے اور جو کسی کو اپنی مہربانی سے زندہ کرتا ہے، وہ گویا تمام نوع انسان کو زندہ کرتا ہے۔

قتل نفس

اس معجزانہ پُراثر اور مخفی طرزِ ادا کے علاوہ خدا نے کئی بار اعلاناً خونریزی سے منع فرمایا۔ سورہ انعام میں ہے:

وا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا ... ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (انعام : ۱۵۱)

جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا، حق کے سوا، کسی اور سبب سے اس کو ہلاک نہ کرو۔ خدا تمھارے سمجھنے کے لیے تم کو یہ نصیحت کرتا ہے۔

اور پھر سورہ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ط اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۳)

"جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا حق کے سوا اور سبب اس کو ہلاک نہ کرو، جو مظلوم ہو کر مارا جائے اس کے وا[رث] کو ہم نے قصاص اور بدلے کا اختیار دیا ہے مگر وہ ا[س] انتقام میں تعدی اور زیادتی کسی طرح نہ کرے۔ اس [طرح] یقیناً وہ مظفر و منصور ہوگا۔"

یہ حکم امن عالم اور حفظِ انسانیت سے متعلق ہے، اسی لیے جب کسی دور و عصر میں امن عالم کا محافظ [اور] اور حفظِ انسانیت کا واعظ روحانی دنیا میں آیا، تو اس نے اس کا اعادہ کیا۔

تم نے اس فرمان کو سنا ہے، جو امن عالم کے "محافظ اکبر" نے مقدس جماعت انسانی کے روبر[و] "بیت خلیل" کے سامنے دنیا کو سنایا تھا:

الا ان دماءکم و اموالکم محرمۃ علیکم کحرمۃ یومکم ھٰذا فی بلدکم ھٰذا، فی شھرکم ھٰذا۔

آگاہ ہو کر تمھارا خون، تمھارا مال، ایک دوسرے کے [لیے] محترم ہے، جس طرح آج روز حج اس شہر مکہ میں، ا[س] ماہ ذی الحجہ میں محترم ہے۔

اسی طرح وہ جو "کوہ طور" سے آیا، اور اس سے بھی جو "کوہ زیتون" پر نمودار ہوا، یہی کہا تھا کہ "خون مت کر۔"

حفظ نفس کے لیے قتل نفس

لیکن جس طرح قیام امن و احترام روح انسانیت کے لیے سفک د[م] و قتل نفس ممنوع ہے، اسی طرح کبھی کبھی انھیں عزیز ترین متاع عا[لم] حفاظت و عزت کے لیے سفک دم و قتل نفس ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ ایک جماعت انسانی کا مجرم، ایک نف[س] زکیہ کا قاتل، ایک حکومت صالحہ کا باغی، اور ایک برہم زن امن عالم کا قتل عین عدل و نفس انصاف ہے تاکہ دنیا کی صلح و سلام واپس آئے اور انسانیت و رُوح کی عزت و احترام باقی رہے۔

عفوٌ و انتقام

اسلام سے پہلے دنیا نے صرف دو اصولوں پر کام کیا ہے: عفو اور انتقام۔ ہم نے موس[یٰ] شریعت میں "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت

ما ہے، لیکن یہ نہیں پڑھا کہ "اے اسرائیل! بُرے بندوں کو معاف کر دے"
ہم نے مسیح کو سنا کہ اس نے گلیل کی سرزمین میں ایک پہاڑ کے نیچے کہا:
"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ پر میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے، جو تیرا کرتہ لے، اس کو چغہ بھی لے لینے دے۔ جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے، اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔"[1]
ہم نے یہ سُنا، لیکن یہ تو نہیں سُنا کہ اس نے کہا ہو "شریروں اور بدکاروں کو ان کے اعمال کی سزا دو کہ آسمان کی بادشاہت کی طرح زمین کی بادشاہت میں بھی امن و سلامتی ہو۔"
لیکن ہم نے مسیح کے بعد (بطحا) کی سرزمین میں، جبل حرا کے دامن میں ایک اور بولنے والے کا کلام سُنا جس نے گلیل کے منادی کی طرح پہلے کہا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ط (المومنون، ۹۶)	بُرائی کا معاوضہ ہمیشہ نیکی سے دو۔
وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (الرعد، ۲۲)	آخرت والے گھر کا انجام ان کے لیے ہے برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں۔

لیکن ساتھ ہی اس نے سلطان عدل کے جلال، امنیت عالم کے احترام، نظام مدنیہ کے قوام، اور قانونِ عدالت کی ہیبت کے ساتھ کہا، جیسا کہ موسیٰ (ع) نے بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور قرنا کی آواز میں سنا تھا:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (البقرہ، ۱۹۴)	"جو تم پر تعدی کرے تم بھی اسی طرح اور اسی قدر اس پر تعدی کرو، خدا سے ڈرو اور یقین کرو کہ خدا اپنے سے ڈرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

پھر اس نے موسیٰ (ع) کے قانون کا اعادہ کیا:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط (المائدہ، ۴۵)	"ہم نے تورات میں لکھ دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم ہے۔"

---

[1] تورات سفر خروج ۲۱: ۲۵ اور متی ۵ - ۳۸ (منہ)

وہ ادھوری باتوں کو جیسا کہ مسیحؑ نے کہا تھا، پورا کرنے کے لیے آیا تھا۔ وہ آیا اور ان کو پورا
نے کہا کہ "تم دشمنوں سے درگزر کرو اور برائی کو نیکی کے ذریعے دور کرو۔" اس نے صرف یہی نہیں
کے شدائد جبر کے ساتھ تحمل کرو بلکہ یہ بھی کہا کہ تحمل کرو اور احسان کرو، برائی کو انگیز کرو اور اس کی جزا نیکی
ساتھ دو کہ یہ حصول امن کا ذریعہ اور کسب صلح و سلام کی تدبیر ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ۳۴-۳۵)

"نیکی اور بدی برابر نہیں۔ نیکی سے بدی کو دور کرو۔ سلوک سے وہ جس کو تم سے عداوت ہے تمہارا دوست ہو جائے گا۔ یہ وہ طریقۂ اخلاق ہے جس پر صرف صابر اور خوش قسمت انسان ہی عمل کرتے ہیں۔"

قانون حفظ و قتل

لیکن یہ عفو و حلم، یہ صفح و درگزر، یہ تحمل و انگیز، کب تک؟ اس وقت تک، جب تک اس شر اور بدی کا اثر شخص واحد تک محدود اور صرف ایک ذات خاص کے منافع خصوصیہ میں محصور ہو کہ یہ جرم ایک شخص واحد اور ذات خاص کا ہے جس کے معاملات و حوادث شخصیہ سے ہیئت اجتماعیہ اور سوسائٹی سے تعلق نہیں۔

وہ پانی کا ایک بلبلہ ہے جو ایک ٹھوکر سے پیدا ہوا اور مٹ گیا۔ اس جرم کو معاف کرو کہ اشخاص کی ذاتی محبت و مودت اور شخصی لطف و رحم کو ترقی ہو اور دنیا امن و صلح سے بھر جائے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں ... کے حکم پر عمل کرنا عین اسلام کی تعلیم ہے۔

لیکن دنیا میں ایسی بھی بدیاں ہیں جو گو ایک شخص خاص کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، لیکن وہ سمندر کی لہریں ہیں، جو ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہوتی ہیں اور دور تک پانی کی سطح کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ وہ گو ایک ذات واحد کا گناہ ہے لیکن اپنی وسعت اثر و قوت نفوذ کے لحاظ سے تمام مجتمع انسانی کا گناہ ہے۔ پھر جب وہ تمام مجتمع انسانی کا گناہ ہے تو ایک شخص خاص کو کیا حق ہے کہ وہ اس گناہ کو معاف کرے۔ اگر کرتا ہے تو وہ خود تمام مجتمع انسانی کا گناہ کر رہا ہے۔

زید، خالد کے گھر میں سرقہ کا مرتکب ہوتا ہے، اب خالد کو کوئی حق نہیں کہ وہ زید کے گناہ کو معاف کرے۔ اگر کرتا ہے تو گویا اس کو اعادۂ جرائم و معاصی کی تعلیم دیتا ہے۔

عمرو، بکر کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن بکر کا باپ اب حق نہیں رکھتا کہ اس کے اس جرم کو معاف کرے۔ اگر وہ معاف کرتا ہے تو اس کا عفو جرأت آموز جرائم قتل ہے، اس لیے اب عمرو صرف بکر کے موالی و اعزہ

گنہگار نہیں بلکہ خود مجتمع انسانی کا، امن و عدل عالم کا اور حکومت کا گنہگار ہے۔ اسی نکتہ کی طرف کتاب حکیم نے قصاص پر بحث کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدہ: ۳۲)	جس نے کسی کو بغیر اس کے کہ مرتکب قتل ہوا ہو یا اس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو، قتل کر دیا تو اس نے گویا تمام دنیا کو قتل کر دیا، اور جس نے ایک کو زندہ بچایا تو اس نے گویا تمام دنیا کو زندگی بخشی۔

یہ وہ موقع ہے جہاں اسلام نے موسیٰؑ کی اس شریعت کا حکم دیا ہے کہ "جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔"

قرآن مجید نے ان دونوں مواقع کی تفریق و تمیز سے تورات و انجیل کی شریعت عفو و انتقام کی تکمیل کی اور اس طرح وہ پورا ہوا جو (مسیحؑ) نے کہا تھا کہ "میرے بعد آنے والا میری ادھوری باتوں کو پورا کرے گا۔"

اخلاق اور قانون

مسئلہ عفو و انتقام کی نسبت ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ دنیا میں دو چیزیں ہیں: اخلاق اور قانون۔ اخلاق کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اور قانون کا تعلق حکومت اور مجتمع انسانی سے ہے۔ عفو و درگزر اور صفح و مغفرت ایک انسان کا بہترین وصف ہے، لیکن اگر اس سے تجاوز کر کے وہ حکومت اور جمعیت انسانی تک پہنچ گیا تو وہ قانون کی سرحد میں آگیا، جہاں مغفرت گناہ عظیم اور صفح و عفو جریمۂ کبیرہ ہے۔ یہ جرأت آموز جرائم ہوتا ہے اور برہم زن امن انسانی۔

اسی لیے اس ارحم الراحمین نے اپنے معجزانہ کلام میں فرمایا کہ:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (البقرہ: ۱۷۹)	اے دانشمندو! نوع انسانی کی بقا و حفاظت، قصاص اور بدلے ہی میں ہے۔

گزشتہ آیت کو پھر پڑھو:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدہ: ۳۲)	جس نے کسی کو بغیر اس کے کہ وہ مرتکب قتل ہوا ہو، یا اس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو قتل کر دیا تو اس نے گویا تمام دنیا کو قتل کیا اور جس نے ایک کو زندہ بچایا، اس نے گویا تمام دنیا کو زندگی بخشی۔

اس موقع پر اگر قارئین کرام اس سلسلہ مقالات پر بھی ایک نظر ڈال لیں، جو الہلال جلد اول میں "امر بالمعروف" کے عنوان سے شائع ہوا ہے تو مطالب زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہوں گے۔

اسلام دونوں کی جامع ہے مسیحؑ کی تعلیم صرف اخلاق اور موسیٰؑ کی شریعت قانون، لیکن وہ جس نے کہا کہ "میں خانۂ نبوت کی آخری اینٹ ہوں[1]"، وہ جس معلم اخلاق تھا، اسی طرح ایک متقن آئین وقانون بھی تھا۔ اس نے کہا:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۵ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۵ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۵ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۵

(الشوریٰ: ۳۹-۴۳)

خدا کے پاس کہ وہ اجرت جو سراسر خیر اور دائمی ہے، لوگوں کے لیے ہے جو اس سرکشی و بغاوت کا، جو ا[...] ساتھ کی جائے، انتقام لیتے ہیں کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بد[...] البتہ جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر خدا پر[...] وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔ جو اپنی مظلومی کے بعد اپنے[...] انتقام لے اس پر بھی کوئی الزام نہیں۔ الزام تو انھیں پر[...] جو خود لوگوں پر ظلم کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں[...] لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے مگر جو صبر کر[...] اور دوسروں کی خطا بخش دے تو یہ بڑی ہی عالی حوصلگی[...] کام ہیں۔"

اسلام اور شرائع سابقہ کا یہ فرق نہایت اہم اور اصولی نکتۂ دقیق ہے، اور افسوس کہ اس کی تشریح ضمناً [...] نہیں، اور مصیبت یہ ہے کہ ایک موضوع پر لکھتے ہوئے کتنے ہی ضمنی مطالب کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے۔

حاصل مبحث ان تمام آیات میں بار بار اعادہ ہوا ہے کہ شریعت حقہ الٰہیہ نے خونریزی کو اکبر الجرائم قتل نفس کو معصیۃ الکبریٰ قرار دیا ہے۔ تاہم بقائے سلام عالم و امنیت انسانی و قیا[م] عدل و نظام کے لیے دو وصف کے لوگوں کا خون بہانا نہ صرف جائز بلکہ ضروری والزم بھی بتلایا ہے:

۱۔ ایک وہ جس نے کسی مظلوم انسان کا ناحق خون کیا۔ اس سے قصاص لیا جائے گا تاکہ اس کے عمل بد سے دنیا محفوظ رہے اور اس کا اقدام خونین متعدی نہ ہو۔

۲۔ دوسرا وہ، جو زمین کے امن وسلامتی کو برباد، اور قوموں کے سکون و راحت کو غارت کرتا[...] جو انسانوں کے خون کی عزت نہیں کرتا، جس کا وجود دنیا کے لیے باعث مصائب و حوادث اور[...]

---

[1] آنحضرت (ص) نے ایک تمثیل میں اپنے آپ کو (کہ تکمیل دین کے لیے تشریف لائے تھے) مکان کی آخری اینٹ سے [تشبیہ دی] ہے جس کے بعد مکان کی عمارت کامل ہو جاتی ہے۔

برہمی صلح وسلام ہے اور جو انسانوں کے حقوق اور خدا کی بخشی ہُوئی آزادی وخود مختاری کو غارت کرنا چاہتا ہے
وہ بھی قتل کیا جائے کہ فی الحقیقت اس کی موت دنیا کی زندگی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (البقرہ: ۱۷۹) — دانشمندو! قصاص وانتقام کے خون ہی میں تمہاری زندگی کا سرچشمہ ہے۔

اور اسلام کا یہ قانون کس کو معلوم نہیں؟

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: ۴۰) — اور بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے جیسی کہ کی گئی۔

یہی اصل الاصول دنیا کے مادی قوانین اور عدالت کو بھی قرار دینا پڑا ہے، اور سیاست اخلاقی بھی اپنی تعلیم رحم و درگزر کو یہاں پہنچ کر یکسر بھلا دیتی ہے۔ وہی عدالت جو خونریزی کو جرم بتلاتی ہے، جب خونریزی کی جائے تو اس کا انصاف خونریزی ہی سے کرتی ہے اور جس نے تلوار سے خُون بہایا ہے، اس کو عدالت کے جلاد کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے، یا سُولی کے تختے پر کھڑا کیا جاتا ہے!

اخلاق سے بھی اگر فتویٰ طلب کیا جائے تو وہ عدالت کا ساتھ دے گا کیونکہ اس بارے میں اصل الاصول یہ ہے کہ "انسانی زندگی اور اس کے فطری حقوق کی حفاظت کی جائے" رحم بھی اسی لیے ہے "تاکہ کسی پر سختی کر کے اس کی حیات وحقوق طبیعیہ کو گزند نہ پہنچایا جائے۔ درگزر اور عفو بھی اسی لیے ہے" تاکہ انسانی زندگی کا احترام اور انسانی حقوقِ حیات کا اعتراف کیا جائے۔ لیکن اگر اس عفو و درگزر، اس تعلیم حفظ نفس اور عدم قتل و خونریزی سے خود وہی اصل الاصول خطرے میں پڑ جائے، جس کی بناء پر یہ تمام اصول قایم کیے گئے تھے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ جس طرح انسانی زندگی وحقوق کی حفاظت کے لیے منع قتل کی تعلیم دی جاتی تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی اور حقوق کی حفاظت ہی کے لیے قتل وخونریزی کی بھی اجازت دی جائے۔

اخلاق کا واعظ کہتا ہے کہ "قتل مت کرو" اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ "قاتل کو پھانسی پر چڑھا دو" دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، اور ٹھیک ٹھیک ایک ہی درجے میں دونوں انسانی زندگی اور حقوق طبیعی کے محافظ ہیں۔ پہلا خون کے روکنے کے لیے ایسا کہتا ہے تو دوسرے کا بھی فیصلہ خون ہی کی حفاظت کے لیے ہے۔

البتہ اس عالم کی ہر راہ پل صراط ہے اور صراط مستقیم عدل و اعتدال کا نام ہے، پس اگر اخلاق کے وعظ نے تفریط کی اور قانون وسیاست نے افراط، تو دونوں کی تعلیم نظام امن و عدل کو درہم برہم کر دے گی۔

(کوہ سینا) کے اعتکاف نشین نے مقدس تختیوں پر جو کچھ لکھا اور (گلیل) کی گلیوں میں جس اخلاق کی منادی کی گئی، وہ دونوں نظام و قوام کے دو علیحدہ عنصر ضرور تھے، پر الگ الگ دنیا کے لیے بے کار تھے۔ ایک یکسر

"قانون تھا، جو بقول یہودی انشا پرداز (پولوس) کے "صرف سزا ہی دے سکتا تھا پر بچا نہیں سکتا تھا!" دوسرا اخلاق محض تھا، جو حسن و جمال میں تو دلفریب تھا پر عمل و نظام کے لیے بیکار تھا۔ یہ دونوں عنصر الگ الگ دنیا کے دکھ کے لیے نہ صرف بیکار ہی تھے، بلکہ اس کی بیماری کو اور زیادہ کرنے والے تھے۔

لیکن جب وُہ دنیا سے گیا "جس کا جانا ہی بہتر تھا تاکہ آنے والے کو جلد بھیجنے کے لیے اپنے آسمانی باپ سے سفارش کرے" اور خداوند نے طور اور زیتون کے پہاڑوں کی جگہ فاران کی چوٹیوں سے اپنی ندا بلند کی، تو وُہ آگیا، جو موسیٰؑ کے قانون اور مسیحؑ کے وعظ کو "پورا کرنے والا تھا"۔ اس نے ناقص کو کامل اور ادھورے کو پُورا کیا اور ان دونوں عنصروں کو، جو الگ الگ تھے، تسویہ و اعتدال کے ساتھ اس طرح ترکیب دیا کہ قانون کا عدل اور اخلاق کا رحم، دونوں باہم مل گئے اور امنیت و نظام انسانی کا ایک مرکب صحیح و سالم پیدا ہو گیا۔

اس مرکب میں "جزاء سیئة سیئة مثلها" اور "ولمن صبر و غفر ان ذلك لمن عزم الامور" دونوں عنصر موجود ہیں۔

یہی شریعت حقۂ الٰہیہ ہے، یہی ناموس طبیعی و سنّت ربانی ہے، یہی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ہے اور اگر ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لیے بھی اس کی حکومت دنیا سے اُٹھ جائے اور صرف تورات کی قساوت یا صرف انجیل کی محبت دنیا پر مسلط ہو جائے، تو دونوں حالتوں میں دنیا امن و مدنیت کی جگہ قتل و خونریزی، نہب و سلب، وحشت و سبعیت اور جرائم و معاصی کا ایک شیطان کدہ بن جائے!!

آخری نتیجہ آخری نتیجہ جو ان مواد و ترتیبات کے بعد سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ شریعت الٰہیہ نفس انسانی کی محافظ ہے اور اسی لیے وُہ دو صورتوں (حسب تصریح بالا) قتل نفس کو فرض و الزم قرار دیتی ہے۔ ان صورتوں میں انسانوں کا قاتل، مجرم و عاصی نہیں ہوتا، بلکہ ایک نہایت مقدس فرض انسانیت و عدالت حقہ انجام دینے والا ہوتا ہے۔ وہ ویسا ہی محب انسانیت اور نوع خواہ دامن پرست ہے، جیسا کہ خود قانون اور عدالت کی قوت۔ اس کا اخلاقی عمل نہایت اقدس و محترم ہے، کیونکہ وہ اس قتل نفس کے ذریعے تمام جمعیت انسانی اور عدل و نظام امنیت کی خدمت انجام دیتا ہے۔

دنیا کا قانون اور اخلاق، دونوں شریعت الٰہیہ کے اس اصول و حکم کے قولاً و عملاً، دونوں طرح پیرو ہیں، گو بعض اوقات اپنے قول و عمل کو بھول جائیں۔

عود الی المقصود پس اسی لیے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر کے بازار میں ایک قبطی پر ہاتھ اٹھایا اور وُہ مر گیا۔ اس کا قصّہ "قصص بنی اسرائیل" کے سلسلے میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور یہ آج کی تمہید طویل اس لیے تھی تاکہ کل اس واقعہ پر ایک غائر نظر ڈال سکیں اور پہلے ایک اصولی قانون و فیصلہ اخلاق و شریعت ذہن نشین ...

انبیائے کرام (علیہم السلام)

1288

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے
مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

مولانا غلام رسول مہر

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
لاہور ـــ پشاور ـــ حیدر آباد ـــ کراچی